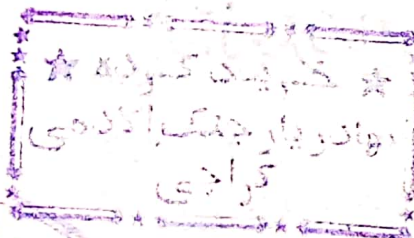
عہد نبوی کا تعلیمی نظام

محمد یاسین شیخ

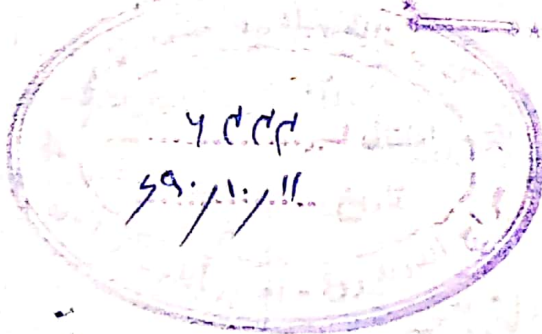
غضنفر اکیڈمی پاکستان کراچی

۳۰- اردو بازار کراچی

عہد نبوی کا تعلیمی نظام



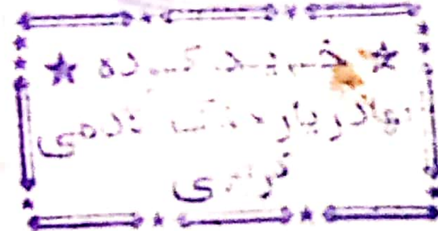
محمد یاسین شیخ



غضنفر اکیڈمی پاکستان کراچی

۳۰- اردو بازار کراچی

اشاعت اول ۱۹۸۹ء
قیمت ۵۰/- روپے
طابع آر۔ آئی پرنٹرز کراچی



ملنے کا پتہ

ثاقب علی خان

E/5 ماڈرن کالونی منگھوپیر روڈ کراچی ۱۶
فون۔ ۲۹۴۰۹۱

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حرفِ آغاز

اللہ تعالیٰ کا کرم ہے کہ اس نے مجھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کے تعلیمی اور تبلیغی پہلو کا مطالعہ کرنے کی توفیق عطا کی اور حاصل مطالعہ کو "عہد نبوی کا تعلیمی نظام" کے عنوان سے مرتب کرنے میں میری رہنمائی فرمائی۔ اس دوران حیات طیبہ کے کئی ایسے گوشے بھی سامنے آئے جن کے بارے میں دوسروں سے سننے کا اتفاق ہوتا تھا۔ براہ راست مطالعہ اور اس سے کچھ اخذ کرنا یقیناً بڑی سعادت ہے جو مجھ جیسے دنیاوی معاملات میں الجھے ہوئے شخص کے لیے ایک قیمتی سرمایہ ہے۔ اگر یہ کتاب منظر عام پر نہ آتی تب بھی انفرادی طور پر میرے لیے یہ اعزاز ہی بہت تھا کہ میں نے اپنی زندگی کا کچھ وقت سیرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے مطالعہ میں صرف کیا ہے۔ یہ سب اسی ذات مقدس کی نوازش تھی کہ میں انتہائی نامساعد حالات کے باوجود اس کام کو پایہ تکمیل تک پہنچا سکا۔

موضوع کی نوعیت اور موجودہ عہد میں بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ سے زندگی کے اصول اخذ کرنے کی اہمیت نے میرے کام کو آسان بنانے میں بڑی مدد کی۔ گو بعض بنیادی مآخذ کی عدم دستیابی ایک مسئلہ رہی لیکن کئی علم دوستوں نے میری اتنی مدد فرمائی کہ یہ کمی زیادہ شدت سے محسوس نہ ہوئی۔ تاریخ کے شعبے میں پروفیسر اخلاق اختر حمیدی اور سیرت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے شعبے میں حافظ عبدالباری صدیقی نے میری ہر ممکن رہنمائی کی۔ بعض اہم کتابوں اور نادر مقالات کی دستیابی میں مجھے اپنے دوستوں خصوصاً پروفیسر شمیم طاہر اور پروفیسر عبدالرحمٰن قادری کا تعاون بھی حاصل رہا۔ میں ان تمام اہل علم کا ممنون ہوں جنہوں نے اس عظیم کام میں میری مدد اور رہنمائی کی۔ اس کتاب کی طباعت اور اشاعت کے لیے غضنفر اکیڈمی پاکستان کے ثاقب علی خان نے بھی ذاتی توجہ اور دلچسپی سے کام کیا بصورت دیگر میرے ذاتی وسائل تو اتنے محدود تھے کہ برسوں یہ کاوشیں کتاب کی صورت اختیار نہ کر سکتی تھیں۔ ان تمام احباب کی نوازش کا سبب صرف میری ذات نہیں تھی بلکہ اس کتاب کی ترتیب و اشاعت میں تعاون کا اصل محرک ان کی محسن انسانیت حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت اور عقیدت ہے۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کی کوششوں کو قبول فرمائے۔ آمین

محمد یاسین شیخ

فہرست

گزارش

اس کتاب میں قرآنی آیات، احادیث اور ان کے ترجمے میں ممکنہ حد تک احتیاط سے کام لیا گیا ہے۔ خدانخواستہ اصل عبارت، ترجمے یا ان کے مفہوم میں کوئی سہو سرزد ہو گیا ہو تو آپ سے درخواست ہے کہ براہ راست اس کی نشاندہی فرمائیں۔ ہم اللہ تعالیٰ کے حضور دعاگو ہیں کہ وہ ہمیں اس نوعیت کی کوتاہی پر معاف فرمائے اور اس کی اصلاح کرنے کی توفیق بخشے۔ آمین

محمد یاسین شیخ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقدمہ

زیر نظر کتاب کا موضوع جتنا منفرد ہے ۔ افادیت کے اعتبار سے اتنا ہی زیادہ اہم ہے ۔ تمام مسلمانوں کے لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی مشعل راہ کی حیثیت رکھتی ہے اور زندگی کے ہر شعبے میں انہی کے اسوہ حسنہ سے رہنمائی حاصل کی جاسکتی ہے ۔ اس کتاب میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ت طیبہ اور ارشادات گرامی کی روشنی میں ایک مکمل اور جامع تعلیمی نظام کا خاکہ پیش یا ہے جو یقیناً بہت سے اذہان کے لیے طمانیت اور اور رہنمائی کا باعث ہوگا۔ یہ کتاب ان باطل تصورات سے نجات حاصل کرنے میں بھی معاون ثابت ہوگی جو تعلیمی نظام کو اسلامی تقاضوں کے مطابق تبدیل کرنے کی راہ میں حائل رہتے ہیں ۔ مؤلف نے پوری کوشش کی ہے کہ عہد نبوی میں تعلیم اور تبلیغ کی تاریخ کو یکجا کردیا جائے ۔ انہوں نے اسی تاریخ سے تعلیمی اصول اور طریقے بھی اخذ کیے ہیں جن سے اس عہد کا تعلیمی نظام واضح ہوتا ہے ۔

یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ قوموں کی تعمیر و ترقی ان کے اپنے افراد کی مرہون منت ہوتی ہے ۔ افراد اپنا یہ فریضہ اسی وقت بحسن و خوبی ادا کرسکتے ہیں جب قوم کا نظام تعلیم و تربیت ان کے انفرادی اور اجتماعی تقاضوں کے مطابق ہو۔ تاریخ عالم پر نظر ڈالی جائے تو یہ بات بالکل واضح نظر آتی ہے کہ کئی ترقی یافتہ اقوام اپنے ناقص تعلیمی نظام کے باعث اخلاقی روحانی اور مادی اعتبار سے گرتے گرتے دنیا سے معدوم ہوگئیں ۔ چند صدیاں پہلے ہی کی بات ہے کہ جنوبی ایشیا کے مسلمان بھی ایسے ہی زوال سے دوچار ہوئے یہ ان کی خوش بختی تھی کہ اسی دور انحطاط میں ان کے درمیان ایسے جلیل القدر افراد پیدا ہوئے جنہوں نے اسلامی فکر کو تازہ کرنے کی کوششیں شروع کیں مسلمانوں کی نشاط ثانیہ کا یہ دور دراصل قرآن فہمی سے شروع ہوا جس کا آغاز حضرت

شاہ ولی اللہ نے کیا۔ ان کی فکر کے مطابق قرآن اور قرآنی تعلیمات کو زندگی کا محور و مرکز بنا کر ہی دنیا اور آخرت میں کامیابی حاصل کی جا سکتی ہے۔ انہوں نے یہ بات رسماً ہی نہیں کہی بلکہ قرآن اور اس کی تعلیمات کو عام فہم بنانے کی عملی کوششیں بھی شروع کیں اس دور کے بعض رجائیت پسندوں نے ان کی مخالفت بھی کی ایسے لوگوں کی خام عقل کے مطابق قرآن کا مصرف صرف یہی تھا کہ اسے اہم مذہبی تقریبات میں پڑھا جائے۔ جنوبی ایشیا میں قرآن فہمی کی یہ فکر دراصل اس ذہنی انقلاب کا پیش خیمہ ثابت ہوئی جس نے اس خطے کے کروڑوں مسلمانوں کو اپنے وجود اور اس کی حیثیت کا حقیقی احساس عطا کیا۔ قیام پاکستان بھی اسی احساس کا نتیجہ تھا۔

اللہ تعالیٰ نے دنیا کے تمام انسانوں کی رہنمائی کے لیے جو ضابطہ حیات مقرر کیا تھا اس کی تبلیغ اور اشاعت کے لیے دنیا کے ہر خطے میں اپنے انبیاء کرام مبعوث فرمائے۔ حضرت محمد مصطفیٰ اس سلسلے کے آخری نبی تھے جن کی مکمل اور جامع تعلیمات کے بعد کسی اور نبی کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ انہوں نے آج سے چودہ سو سال پہلے کے عرب معاشرے میں ایک بگڑی ہوئی قوم کو سنوارنے کے لیے جو اقدامات کیے وہ دراصل اسلام کی حقیقی تعلیمات اور اللہ تعالیٰ کے بتائے ہوئے راستے کی عملی تفسیر تھے مسلمان انہی تعلیمات سے اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگیوں کے تمام معاملات میں رہنمائی حاصل کرتے رہے ہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم انسان کامل تھے اور ان کی حیات طیبہ کا کوئی گوشہ تشنہ یا نامکمل نہیں تھا۔ انہوں نے عام لوگوں کے درمیان زندگی بسر کی۔ بچپن سے بڑھاپے تک آپ صلی اللہ علیہ وسلم انہی لوگوں کے درمیان رہے اور انہیں اخلاق و معاشرت سے لے کر نظام مملکت کے آداب تک کی تعلیم دیتے رہے۔ دنیا کے غیر مسلم مورخین بھی اس امر کا اعتراف کرتے ہیں کہ آپ سرزمین حجاز کے غیر مہذب بدوؤں کو مختصر سے عرصہ میں اپنی انہی تعلیمات کے ذریعے راہ راست پر لے آئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تجارت سے لے کر سیاست تک اور دنیا سے لے کر آخرت تک ہر معاملے میں لوگوں کی رہنمائی کی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی قرآن پاک کی کھلی تفسیر تھی۔ یہی کتاب وسنت اسلامی تعلیمات کا حقیقی سرچشمہ ہیں جن سے استفادہ کیا جائے تو غلاموں کو شہنشاہی بھی حقیر نظر آتی ہے۔

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے جس انداز سے دین اسلام کی تبلیغ کی وہ نہ صرف یہ کہ انتہائی موثر اور کامیاب تھا بلکہ اس سے تعلیم و تربیت کے ایسے اوصاف بھی نمایاں ہوئے جو متعلمین اور معلمین دونوں ہی کے لیے روشن مثال کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس دور کے ریگزار عرب کا جائزہ لیا جائے تو مسجد نبوی کی پہلی درسگاہ اور اصحاب صفہ پر مشتمل متعلمین کی پہلی جماعت سب سے منفرد نظر آتے ہیں لیکن انتہائی قلیل عرصے میں یہ عمل بہت وسعت اختیار کر گیا۔ ایسے بیسیوں ادارے قائم ہو گئے جنہیں اس دور کی درسگاہوں کی حیثیت حاصل تھی۔ ان درسگاہوں میں کیا پڑھایا جاتا تھا؟ کب پڑھایا جاتا تھا اور کیسے پڑھایا جاتا تھا۔ ان سارے سوالات کا جواب معلم اعظم کے خطبات اور ارشادات میں ملتا ہے جن کی تشریح اور وضاحت اسی عہد کے حضرت معاذ بن جبل رض، عبداللہ بن مسعود رض، عبداللہ بن عباس اور حضرت ابی بن کعب رض جیسے جید معلمین کے ذریعے بھی ہوتی ہے۔ ارشادات الٰہیہ اور سیرت مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا فہم ہو جائے تو تعلیمی نظام کی تمام باریکیاں ایک ایک کر کے واضح ہو جاتی ہیں۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود لوگوں کو تعلیم دی اور پھر ان لوگوں میں سے دوسروں کو تعلیم دینے کے لیے افراد کا انتخاب بھی کیا۔ درس و تدریس کا یہ سلسلہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات کے بعد بھی جاری رہا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے منتخب کیے ہوئے معلمین نے درس و تدریس میں جس مہارت کا ثبوت دیا وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہمہ گیر تربیت کا نتیجہ تھا جس کے اثرات بہت بعد تک محسوس کیے جاتے رہے۔ ابتدائی دور میں تعلیم صرف مذہبی عقائد تک محدود رہی لیکن بہت جلد ہی اسے دوسرے موضوعات تک وسعت دے دی گئی۔ گویا مذہبی تعلیم کے ساتھ ساتھ مختلف شعبہ ہائے زندگی کی تعلیم بھی نصاب میں شامل رہی۔ تعلیم و تربیت کا وہ نصاب اتنا جامع اور متوازن تھا کہ اس میں زندگی کے تمام شعبوں کو باہم مربوط کر دیا گیا تھا۔ یہ اصول اسلامی تعلیمات کے عین مطابق تھا کیونکہ قرآن اور احادیث میں کہیں بھی زندگی کو مختلف خانوں میں تقسیم نہیں کیا گیا بلکہ اسے مجموعی طور پر ایک اکائی تصور کرتے ہوئے اس میں تبدیلی اور اصلاح کی تعلیم دی گئی ہے۔ قرآن اور احادیث جو اسلام کے سب سے بڑے ماخذ ہیں ان کی روشنی میں علم کا تصور بھی واضح ہو جاتا ہے۔ یہ تصور انتہائی عقلی اور سائنسی ہے جیسے روایت۔ تقلید اور توہم پرستی سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو عقل اور حواس دے کر اسے یہ اختیار بھی دیا ہے

کردہ مشاہدات اور تجربات کے ذریعے اپنی معلومات میں اضافہ اور استحکام پیدا کرے کائنات کی مختلف اشیاء کا جائزہ لے زیر زمین ذخائر دریافت کرے ۔ خلاؤں اور فضاؤں کی تحقیق کرے ، سمندروں اور پہاڑوں کی تسخیر کرے ۔ اس طرح کائنات کے تمام پوشیدہ اور عیاں اجسام اور اشیاء سے انسانوں کی فلاح وبہبود کی نئی راہیں تلاش کرے ۔ اسلام کا نظریہ تعلیم اللہ تعالیٰ کی حاکمیت اور اقتدار اعلیٰ کی خصوصیات کے ساتھ ساتھ ہر دور کے معاشرتی ، سیاسی ، معاشی اور تہذیبی تقاضوں کا امین بھی ہے ۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد سے دوران تعلیم جن مضامین کی تدریس ثابت ہوتی ہے وہ اس عہد کے لوگوں کی ضروریات کے مطابق تھے ۔ مطابقت اور تقاضوں کے اسی اصول پر عمل کیا جائے تو ہر دور کے انسانوں کی معاشی اور معاشرتی تہذیبی اور اخلاقی اصلاح کے لیے مروج مضامین کی تدریس کی تائید ہو جاتی ہے موجودہ دور کے بیشتر مضامین کے ارتقاء کا جائزہ لیا جائے تو یہ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ ان کے بانی قرون اولیٰ کے وہی مسلمان تھے جنہوں نے قرآن اور حدیث کو ان کے حقیقی مفہوم کے ساتھ سمجھا تھا ۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد کے مطالعے سے جہاں تعلیم کی اہمیت اور افادیت واضح ہوتی ہے وہیں ان کوششوں کا ثبوت بھی ملتا ہے جو تعلیمی عمل کو وسعت دینے کے لیے کی گئی تھیں ۔ مؤلف کی یہ رائے بالکل درست ہے کہ تعلیم کو مفت عام اور لازمی بنانے کا عمل حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد ہی سے شروع ہوا ۔ اس عہد کا مطالعہ یہ بات بھی واضح کرتا ہے کہ تعلیم وتربیت کے آغاز کے لیے سب سے مؤثر ذریعہ مادری زبان ہے ۔ زبان قوت اظہار کا سب سے اہم ذریعہ ہے اور دنیا کی کوئی زبان اپنی آفاقیت اور جدیدیت کے باوجود مادری زبان کے نعم البدل کی حیثیت حاصل نہیں کر سکتی ۔ اس عہد سے یہ ایسا زریں اصول سامنے آتا ہے جس نے رہتی دنیا تک اقوام کے لیے ذریعہ تعلیم کے مسئلے کو حل کر دیا ہے ۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد سے خواتین کی تعلیم کے لیے بھی رہنمائی ملتی ہے اور تعلیمی نظم ونسق کا معاملہ بھی طے ہو جاتا ہے اس دور سے شواہد ملتے ہیں کہ لوگوں کی تعلیم وتربیت کا اہتمام کرنا ریاست کی ذمہ داری تھی لیکن اس کے باوجود متعلمین اور معلمین تعلیمی امور میں مکمل طور پر آزاد تھے ۔ ان پر حکومت یا مالی امداد فراہم کرنے والے کسی ادارے یا فرد کی طرف سے کسی دباؤ کا کوئی ثبوت نہیں ملتا ۔ تعلیمی شعبے کے انتظام کا یہ اصول جدید ریاستوں میں آزادانہ غیر محوری نظم ونسق کے طور پر رائج کیا جا سکتا ہے اس سے فکری اور ذہنی کاوشوں

کو پھلنے پھولنے کے لیے سازگار ماحول ملتا ہے اور عوام الناس کی صحیح تعلیم و تربیت ہوتی ہے
مؤلف نے اس کتاب میں تعلیمی اداروں کی ابتدائی سرگرمیوں سے لے کر ان کے نظم و نسق تک
کے امور کا جائزہ لیا ہے۔ اس میں ٹھوس شہادتوں کی بنیاد پر مختلف تدریسی طریقے بھی بیان کیے گئے
ہیں جن کا آغاز آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور سے ہوا۔ انہی تدریسی طریقوں کو اب علانیہ
مغرب سے درآمد شدہ تدریسی طریقوں کے نام سے رواج دیا گیا ہے۔ نصاب کے باب میں یہ
بھی واضح کیا گیا ہے کہ کون کون سے مضامین شامل کیے جائیں اور دوران تدریس کس مضمون کو
کتنی اہمیت دی جائے۔ حضور کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں معلمین کے تقرر کے عنوان سے
ان ہدایات کا پتہ بھی ملتا ہے جو دربار رسالت صلی اللہ علیہ وسلم سے معلمین کی رہنمائی کے لیے
جاری کی جاتی تھیں ان ہدایات کو مؤلف نے اساتذہ کے لیے پیشہ ورانہ ضابطہ اخلاق کی حیثیت
دی ہے۔ اساتذہ کی ذمہ داریوں اور فرائض کے حوالے سے ایسا ضابطہ اخلاق ہر دور کی
ضرورت رہا ہے۔ مؤلف نے جن کتب سے استفادہ کیا ہے ان میں سے بیشتر سیرت اور تاریخ کی
مستند کتب ہیں۔ ان کے علاوہ انگریزی زبان کی اہم کتابوں سے بھی حوالے دیئے گئے ہیں۔
گویا اپنے موقف کی تائید میں مسلم اور غیر مسلم ہر دو اقوام کے اکابرین کے حوالے موجود ہیں۔ یہ
عمل موضوع کی جامعیت کے اعتبار سے درست ہے اور اس سے مؤلف کی محنت اور مطالعہ
کا اندازہ ہوتا ہے۔ کتاب میں بعض حوالے ثانوی ماخذوں سے لیے گئے ہیں لیکن وہ چونکہ
متفقہ نوعیت کے ہیں اس لیے ان کی حیثیت مشکوک نہیں رہتی۔ کتاب کے سرسری جائزہ
سے اندازہ ہوتا ہے کہ تعلیمی نظام کے ہر گوشے پر گہری نظر ڈالی گئی ہے اور عہد نبویؐ سے ان
تمام واقعات اور شہادتوں کو یکجا کر لیا گیا ہے۔ جن پر ایک تعلیمی نظام کی بنیاد رکھی جا سکتی ہے
مؤلف کا انداز بیان بہت واضح اور شگفتہ ہے۔ انہوں نے جس موضوع پر اظہار خیال
کیا ہے اسے تشنہ نہیں چھوڑا۔ ان کے لہجے میں ناصحانہ جوش خطابت شامل نہیں بلکہ
استدلال کا سہارا لیا گیا ہے۔ عقیدت اور احترام کے جذبات کے باوجود کتاب میں
روایت پسندی کے برعکس معقولیت کا رنگ نمایاں ہے۔ کامیابی سے یہ کوشش کی گئی
ہے کہ اسے جدید عصری رجحانات کے حوالے سے پیش کیا جائے۔ کتاب میں علم سے متعلق
قرآنی آیات اور احادیث کے حوالے یکجا کر دیئے گئے ہیں گو اس موضوع پر تحقیق کی اب بھی
بہت گنجائش ہے پھر بھی یہ کتاب آئندہ کام کرنے والوں کے لیے آسانیاں فراہم کرے گی

میری رائے میں مجموعی طور پر یہ ایک اچھی کوشش ہے جس سے متعلمین اور معلمین دونوں کو رہنمائی حاصل ہوگی۔ یہ تالیف حضور کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کے ایسے پہلو سے متعلق ہے جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بحیثیت ماہر تعلیم پیش کیا گیا ہے۔ اس موضوع پر اردو میں بہت کم لکھا گیا ہے۔ میری دعا ہے کہ مؤلف کی اس کوشش کو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں شرف قبولیت حاصل ہو اور ارباب حل وعقد بھی اس سے استفادہ کرکے اپنے تعلیمی مساعی کو کامیاب کر سکیں۔

۱۵ مارچ ۱۹۸۸ء

غلام مصطفیٰ قاسمی
ڈائریکٹر شاہ ولی اللہ اکیڈمی
حیدر آباد سندھ

اسلام کا تصورِ تعلیم

کائنات کی ابتدا ہی سے اللہ تعالیٰ نے دنیا میں رہنے والے انسانوں کی تعلیم و تربیت کے لئے مختلف مذاہب بھیجے۔ اسلام اس سلسلہ کا سب سے آخری دین ہے جو کئی اعتبار سے اپنے پیشرو مذاہب سے منفرد خصوصیات رکھتا ہے۔ اسلام کی ایک بڑی خصوصیت تو یہی ہے کہ یہ آخری دین ہے اور اس کے بعد کسی اور مذہب اور رسول کو دنیا میں نہیں بھیجا جائے گا۔ اسی خصوصیت کی بنا پر اسلام کو دین مکمل کی حیثیت عطا کی گئی اور زندگی اور کائنات کا کوئی شعبہ ایسا باقی نہیں رہا جس میں اس کے اصولوں سے رہنمائی نہ ملتی ہو۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد

إِنَّ الدِّينَ عِندَ اللَّهِ الْإِسْلَامُ (۳ - ۱۹) (آل عمران پ - ۳)

بے شک دین اللہ تعالیٰ کے نزدیک صرف اسلام ہی ہے۔

اور حضورؐ کے ذریعہ حجۃ الوداع کے اس واضح اعلان سے کہ

اَلْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَأَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَرَضِيتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِينًا (۵-۳) (المائدہ - پ - ۶)

آج میں نے مکمل کر دیا ہے تمہارے لیے تمہارا دین اور پوری کر دی ہے تم پر اپنی نعمت۔ اور میں نے پسند کر لیا ہے تمہارے لیے اسلام کو بطور دین

ان دونوں خصوصیات کی نشاندہی ہوتی ہے۔ اسلام کو دنیا کے دیگر مذاہب سے منفرد بنانے والی تیسری خصوصیت علم کے بارے میں اسلام کا وہ نقطہ نظر ہے جو آفاقیت کے تمام تقاضوں کے ساتھ ساتھ انتہائی عقلی اور سائنسی اصولوں پر مبنی ہے۔ کئی صدیاں گزر جانے کے باوجود اس کی جامعیت اور ہمہ گیری میں ذرہ برابر بھی فرق نہیں آیا اگر کہیں نتائج کے اعتبار سے اس کے برعکس صورت حال نظر آتی ہے تو یہ ان لوگوں کی کوتاہی ہو سکتی ہے جو اس کی تفسیر اور تشریح سے لے کر اس پر عمل درآمد کرنے کے ذمہ دار ہیں۔

علم کی اہمیت اور فضیلت

اسلام دنیا کا واحد مذہب ہے جس نے علم کے بارے میں یہ تصور رائج کیا کہ دنیا کی تمام مخلوق میں انسان کو صرف اس لیے برتری حاصل ہے کہ اسے علم سے نوازا گیا ہے۔ گو اسلام نے تمام انسانوں کو مساوی حیثیت عطا کی ہے ان میں کسی کو کسی پر فوقیت نہیں سوائے ان لوگوں کے جو علم میں دوسروں سے برتر ہیں گویا علم اسلام کے تصور کے مطابق باعث فضیلت ہے۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک علم وہ واحد وسیلہ ہے جس سے انسان اپنے خالق حقیقی کو پہچان سکتا ہے۔ اسی کے ذریعے وہ اپنی ذات اور اپنے ماحول کا ادراک حاصل کرتا ہے اور اسی کے ذریعے اپنی اس زندگی اور اس کے بعد آنے والی زندگی کے لیے مکمل تیاری کر سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جب دنیا تخلیق فرمائی تو سب سے پہلے قلم ہی کو تخلیق کیا لوح اور قلم کی یہ اصطلاح آج بھی دنیا کے بیشتر ممالک میں رائج ہے اور ہر جگہ انہیں علم کے حوالے سے لکھنے پڑھنے کی بنیادی اشیاء میں شمار کیا جاتا ہے۔ قلم اور اس سے جو کچھ لکھا جائے وہ علم کی نشاندہی کرتا ہے اور اللہ کے نزدیک یہ عمل اس حد تک اہم ہے کہ اس نے ان اشیا کا حوالہ دیا

نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُونَ۝ (۶۸-۱) (القلم - پ - ۲۹)

(ن) قسم ہے قلم کی اور جو کچھ وہ لکھتے ہیں۔

دنیا کی تمام مخلوق میں آدمؑ کو اسی لیے فضیلت عطا کی گئی کہ انہیں تمام ناموں کا علم دیا گیا تھا۔ باقی مخلوق اس علم سے بے بہرہ تھی اس لیے آدمؑ کی فوقیت کو تسلیم کیا گیا اور دنیا میں علم کی بنیاد پر فضیلت اور مرتبے کا سلسلہ ہوا۔ پوری مخلوق میں سے وہ ذات جس نے علم کا اعتراف کرنے سے انکار کیا وہ روز محشر تک دنیا میں ملعون اور مردود قرار دی گئی یہاں تک کہ ابلیس اور شیطان جیسے الفاظ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نافرمانی اور گمراہی کی علامت بن گئے اسلام دنیا کے مختلف مذاہب میں علم کے حوالے سے اس لیے بھی ممتاز اور منفرد مقام رکھتا ہے کہ اس کی تعلیمات کا آغاز جس وحی سے ہوا اس کا پہلا لفظ ہی (اقرا) پڑھنے سے متعلق تھا۔ اسی مناسبت سے اسلامی تعلیمات کا وہ مجموعہ جو ارشادات الٰہی پر مبنی ہے اسے (قرآن) پڑھا جانے والا قرار دیا گیا۔ ماضی کی تمام کتابیں اور صحیفے جو قرآن سے پہلے نازل کیے گئے ان کے ناموں میں مفہوم کے اعتبار سے یہ خصوصیت موجود نہیں تھی۔ مثلاً توریت کے لغوی معنی شریعت یا قانون ہے اور انجیل کو بشارت یا خوشخبری

کے مفہوم میں استعمال کیا جاتا رہا ہے۔ ناموں اور اصطلاحات کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں اور آنحضورؐ نے اپنی عملی زندگی میں ایسی بے شمار ہدایات دی ہیں جن سے اسلام میں علم کی اہمیت اور فضیلت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

(۱) علم اللہ تعالیٰ کی صفت ہے

اسلام میں اللہ تعالیٰ کو علم کا ماخذ تصور کیا جاتا ہے علم کی اہمیت کا سب سے بڑا ذریعہ بھی اللہ تعالیٰ ہی کی ذات ہے۔ اللہ تعالیٰ مجسم الصفات ہے اور اس کے مختلف اسماء گرامی اسکی مختلف صفات کی نشاندہی کرتے ہیں۔ ناموں اور صفات کی درجہ بندی کی جائے تو تمام صفات الٰہیہ میں علم کی صفت کو نمایاں محسوس کیا جا سکتا ہے۔ علم کی اصطلاح اور اس کے مفہوم کے حوالے سے دیکھا جائے تو تمام اشیا سے آگاہ ہونے جاننے اور باخبر ہونے کی صفات مند رجہ ذیل ناموں سے مترشح ہیں۔[1]

۱۔ الخبیر ——— خبر رکھنے والا۔ باخبر اور جاننے والا

۲۔ العلیم ——— علم رکھنے والا اور جاننے والا۔

۳۔ علام الغیوب ——— ان باتوں اور اشیا کو جاننے والا جو سب سے پوشیدہ ہیں۔

۴۔ علیمٌ بذات الصدور دلوں کے بھید جاننے والا

۵۔ السمیع ——— سننے والا } علم کے لیے سننے اور دیکھنے کو بنیادی حیثیت

۶۔ البصیر ——— دیکھنے والا } حاصل ہے۔

۷۔ المتکلم ——— بولنے والا اور اپنے ارادہ کو ظاہر کرنے والا۔

۸۔ الواجد ——— پانے والا۔ وہ جس کے علم سے کوئی چیز گم نہیں ہے۔

۹۔ الشہید ——— موجود۔ حاضر۔ جس سے کوئی شئے چھپی ہوئی نہیں ہے۔

۱۰۔ الحسیب ——— حساب کرنے والا۔ جن اشیاء کا علم حساب (وزن اور مقدار) کے ذریعے حاصل کیا جائے ان سب کو جاننے والا۔

۱۱۔ المحصی ——— گننے والا۔ شمار کرنے والا۔ حساب لگانے والا۔ اعداد اور ان تمام

---

[1] سید سلیمان ندوی، سیرۃ النبیؐ۔ جلد چہارم۔ قرآن لمیٹڈ۔ لاہور، ۱۳۹۵ھ صفحہ ۴۹۸

باتوں اور اشیاء کو جاننے والا جن کا علم گن کر حاصل کیا جاتا ہے۔

۱۲۔ المدبر ـــــــ تدبیر کرنے والا۔ انتظام کرنے والا۔

۱۳۔ الحکیم ـــــــ حکمت والا۔ عقل و دانش والا۔ سب کاموں کو ان کی مصلحت سے کرنے والا۔

۱۴۔ المرید ـــــــ ارادہ کرنے والا۔ مشیت والا۔

۱۵۔ القریب ـــــــ نزدیک، وہ جو اپنے علم کے لحاظ سے سب کے نزدیک ہے۔

اسماءِ الحسنہ سے النور۔ الھدیٰ۔ الجامع۔ الظاہر۔ الباطن۔ الحق اور الحکم بھی ایسی ہی صفات کی نشاندہی کرتے ہیں ان تمام صفات سے واضح ہو جاتا ہے کہ علم اللہ تعالیٰ کی ایک اہم صفت ہے۔ اس صفت کا حصول جو اللہ تعالیٰ کی ذات میں بھی موجود ہو انسان کے لیے کس درجہ فضیلت اور سعادت کا باعث ہے اس کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔

۲۔ علم انبیاء کو دیا گیا

علم اللہ تعالیٰ کی صفت ہے اور اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبروں کو بھی اسی صفت سے نوازا تھا۔ مختلف ادوار میں دنیا کے مختلف خطوں اور قوموں کے لیے بھیجے جانے والے انبیاء کرام کی سب سے نمایاں خصوصیت علم ہی تھا۔ اسی کے باعث انہیں رسول اور پیغمبر کا منصب عطا ہوا۔ انبیاء کرام کو علم کی منتقلی کا یہ سلسلہ حضرت آدمؑ سے شروع ہوا۔ (القرآن)

وَ عَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا (۲ - ۳۱) (سورہ بقرہ پ - ۱)

اور اللہ نے سکھا دیئے آدم کو تمام اشیاء کے نام

دنیا کے سب سے پہلے انسان (حضرت آدمؑ) کو جہاں سب سے پہلے نبی کا مرتبہ عطا ہوا وہیں اس امر کی شہادت بھی ملتی ہے کہ انہی سے دنیا میں علم کا آغاز کیا گیا۔ حضرت آدمؑ کے بعد مبعوث کیے جانے والے انبیاء کرام کو بھی علم سے نوازا گیا۔ حضرت داؤدؑ کے لیے قرآن میں واضح ارشاد موجود ہے کہ

وَاٰتَيْنٰهُ الْحِكْمَةَ وَفَصْلَ الْخِطَابِ (صٓ ۔ پ ۔ ۲۳) (۳۸ - ۲۰)

اور ہم نے بخشی انہیں دانائی اور فیصلہ کن بات کرنے کا ملکہ

یہ دونوں خصوصیات علم ہی سے وابستہ ہیں۔ اس لیے ان کی عطا کا مقصد بھی اللہ تعالیٰ کے ذریعے

عطائے علم ہی ہے۔ حضرت سلیمان ؑ نے اللہ تعالیٰ کی اس نعمت کا واضح اعتراف کیا اور علم کو ہر شے کے حصول کے برابر قرار دیا۔ القرآن

وَاُوْتِيْنَا مِنْ كُلِّ شَيْءٍ (۲۷ - ۱۶) (النمل - پ ۱۹)

اور ہمیں عطا کی گئی ہیں ہر قسم کی چیزیں۔

قرآن کریم کی آیات سے تصدیق ہوتی ہے کہ حضرت داؤد اور حضرت سلیمان ؑ دونوں ہی کو علم عطا کیا گیا تھا۔ (القرآن) وَكُلًّا اٰتَيْنَا حُكْمًا وَّعِلْمًا (۲۱ - ۷۹) (الانبیاء پ - ۱۷)

اور ان سب کو ہم نے بخشا تھا حکم اور علم

اللہ تعالیٰ نے حضرت خضر ؑ کو بھی علم سے نوازا تھا۔ قرآن کریم میں حضرت موسیٰ کے اس واقعے سے کہ وہ سیکھنے (معلوم کرنے) کی غرض سے حضرت خضر ؑ کے پاس گئے ان کی اس خصوصیت کا اندازہ ہوتا ہے سورۃ کہف میں اللہ تعالیٰ نے اس واقعے کا تذکرہ کرتے ہوئے اسی جانب اشارہ فرمایا ۔ (القرآن)

عَلٰٓى اَنْ تُعَلِّمَنِ مِمَّا عُلِّمْتَ رُشْدًا (۱۸ - ۶۶) (کہف - پ ۱۵)

بشرطیکہ آپ سکھائیں مجھے رشد و ہدایت کا خصوصی علم جو آپ کو سکھایا گیا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے علم کو رحمت قرار دیا اور حضرت خضر ؑ کے اس رحمت سے فیضیاب ہونے کی تصدیق بھی کی (القرآن)

فَوَجَدَا عَبْدًا مِّنْ عِبَادِنَآ اٰتَيْنٰهُ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا وَعَلَّمْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا

(۱۸ - ۶۵) کہف - پ ۱۵

تو پایا انہوں نے ایک بندے کو ہمارے بندوں میں سے جسے ہم نے عطا فرمائی تھی رحمت اپنی جناب سے اور ہم نے سکھایا تھا اسے اپنے پاس سے (خاص) علم

علم حضرت موسیٰ ؑ کو بھی عطا ہوا تھا بلکہ اندازہ ہوتا ہے کہ انہیں یہ علم ان کی نیکیوں کے سلسلے میں دیا گیا (القرآن)

وَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗ وَاسْتَوٰٓى اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّعِلْمًا ۭ وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ

(القصص - پ ۲۰) (۲۸ - ۱۴)

اور جب پہنچ گئے موسیٰ اپنے شباب کو اور ان کی نشو و نما مکمل ہو گئی تو ہم نے انہیں حکم اور علم عطا فرمایا اور ہم ایسا ہی صلہ دیتے ہیں نیکوکاروں کو

حضرت موسیٰ ؑ کو علم کی قدر و منزلت کا پورا پورا احساس تھا۔ اسی لئے انہوں نے علم سے بے بہرہ ہونے (جاہل ہونے) سے اللہ کی پناہ کی دعا کی۔ (القرآن)

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ (۲ - ۶۷) (بقرہ - پ ۱)

پناہ مانگتا ہوں خدا سے کہ میں شامل ہو جاؤں جاہلوں کے گروہ میں

انہوں نے جہالت سے اللہ کی پناہ مانگنے کے ساتھ ساتھ مزید جاننے کی استدعا بھی کی (القرآن)

رَبِّ اشْرَحْ لِي صَدْرِي ﴿۲۵﴾ (۲۰ - ۲۵) (طٰہٰ - پ ۱۶)

اے میرے پروردگار کشادہ فرما دے میرے لیے میرا سینہ

آپ سے پہلے مبعوث کئے گئے انبیاء کرام کی طرح حضرت عیسیٰؑ کو بھی علم کی نعمت عطا ہوئی تھی۔ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے علم کی منتقلی اور علم کے وسیلے دونوں کا پتہ چلتا ہے (القرآن)

يٰعِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ اذْكُرْ نِعْمَتِي عَلَيْكَ وَعَلٰى وَالِدَتِكَ ۘ اِذْ اَيَّدْتُّكَ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ۣ تُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَكَهْلًا ۚ وَاِذْ عَلَّمْتُكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ ۚ (۵ - ۱۱۰) (المائدہ - پ ۷)

اے عیسیٰؑ ابن مریم یاد کرو میرا انعام اپنے پر اور اپنی والدہ پر جب میں نے مدد فرمائی تمہاری روح القدس سے باتیں کرتا تھا تو لوگوں سے (جب کہ تو ابھی) پنگھوڑے میں تھا اور جب پکی عمر کو پہنچا اور جب سکھائی میں نے تمہیں کتاب اور حکمت اور تورات اور انجیل

اللہ تعالیٰ نے حضرت یعقوبؑ کو بھی علم عطا کیا تھا سورۃ یوسف میں واضح ارشاد کیا گیا (القرآن)

وَاِنَّهٗ لَذُوْ عِلْمٍ لِّمَا عَلَّمْنٰهُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ (۱۲ - ۶۸) (یوسف - پ ۱۳)

اور بیشک وہ صاحب علم تھے بوجہ اس کے جو ہم نے سکھایا تھا انہیں لیکن اکثر لوگ (اسکی حقیقت کو) نہیں جانتے

علم کی یہ خصوصیت حضرت یوسفؑ کو بھی حاصل تھی ان کے بارے میں بھی یہی ارشاد ہوا کہ انہیں علم نیکیوں کی جزا کی طور پر عطا ہوا (القرآن)

وَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗۤ اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّعِلْمًا ۭ وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۲۲﴾ (۱۲ - ۲۲) (یوسف - پ ۱۲)

اور جب وہ پہنچے اپنے پورے جوبن کو تو ہم نے عطا فرمائی انھیں نبوت اور علم اور یونہی ہم نیک جزا دیتے ہیں اچھے کام کرنے والوں کو

علم کی عطا کا یہ سلسلہ تمام انبیاء کرام کی طرح حضرت ابراہیمؑ اور ان کی اولاد تک جاری رہا۔ ابراہیمؑ کی اولاد کے بارے میں قرآن کا واضح ارشاد ہے کہ (القرآن)

فَقَدْ اٰتَيْنَآ اٰلَ اِبْرٰهِيْمَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاٰتَيْنٰهُمْ مُّلْكًا عَظِيْمًا ﴿۵۴﴾ (۴ - ۵۴) (النساء - پ ۵)

ہم نے تو مرحمت فرمادی ہے ابراہیم کے گھرانے کو کتاب اور حکمت اور عنایت فرمادی ہے انہیں عظیم الشان سلطنت

نبیؐ آخر الزماں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی یہ خصوصیت عطا ہوئی۔ آپؐ سے متعلق آیات

میں اللہ نے علم کو بہت بڑی رحمت اور فضیلت قرار دیتے ہوئے ارشاد فرمایا۔ (القرآن)

وَاَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ ۭ وَكَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا ۝

اور اتاری ہے اللہ تعالیٰ نے آپ پر کتاب اور حکمت اور سکھا دیا آپ کو جو کچھ بھی آپ نہیں جانتے تھے اور اللہ تعالیٰ کا آپ پر فضلِ عظیم ہے۔

حصولِ علم اور اشاعتِ علم دونوں ہی انبیاءِ کرام کی اہم خصوصیات ہیں انہیں اللہ تعالیٰ نے جو علم عطا کیا تھا وہ انہوں نے اللہ کی رضا کے مطابق اپنی اپنی قوم تک منتقل کیا آنحضورؐ کے حوالے سے تو اس نوعیت کے فریضے کی بہت واضح شہادتیں ملتی ہیں (القرآن)

كَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْكُمْ رَسُوْلًا مِّنْكُمْ يَتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِنَا وَيُزَكِّيْكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ ۝ (۲ ـ ۱۵۱) (بقرہ ـ پ ۲)

جیسا کہ بھیجا ہم نے تمہارے پاس رسول تم میں سے پڑھ کر سناتا ہے تمہیں ہماری آیتیں اور پاک کرتا ہے تمہیں اور سکھاتا ہے تمہیں کتاب اور حکمت اور تعلیم دیتا ہے تمہیں ایسی باتوں کی جنہیں تم جانتے ہی نہیں تھے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق ایک اور مقام پر اتنا ہی واضح ارشاد ملتا ہے جس سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اور علم کے اعتبار سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مرتبے کا اندازہ ہوتا ہے (القرآن)

هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۤ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝ (۶۲ ـ ۲) (الجمعہ ـ پ ۲۸)

وہی (اللہ) جس نے مبعوث فرمایا امیوں میں سے ایک رسول انہی میں سے جو پڑھ کر سناتا ہے انہیں اس کی آیتیں اور پاک کرتا ہے ان کے دلوں) کو اور سکھاتا ہے انہیں کتاب اور حکمت اگرچہ وہ اس سے پہلے کھلی گمراہی میں تھے۔

ان تمام حوالوں سے اس بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ انبیاءِ کرام کی خصوصیت ان کا وہ علم تھا جو انہیں اللہ تعالیٰ نے عطا کیا۔ انہوں نے اسی ذریعہ سے جاننے کے بعد لوگوں کو تعلیم دی۔ علم اور کتاب دو ایسی خصوصیات ہیں جو انبیاءؑ کو عام لوگوں سے ممتاز کرتی ہیں اور اللہ تعالیٰ نے یہ خصوصیات جنہیں عطا کیں انہیں انتہائی برگزیدہ ہستیاں ہونے کا اعزاز اور منصب بھی عطا ہوا۔

(۳) اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کے گواہ علم والے ہیں

اسلام کی تعلیمات کا محور و مرکز اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا اقرار ہے۔ اس اقرار کے بعد رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور دینی اور دنیاوی تعلیمات کے دوسرے مراحل آتے ہیں۔ وحدانیت کا اقرار دراصل کائنات میں اللہ تعالیٰ کی حاکمیت اور اُس کے اختیارات کا تعین کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی صفات اور انبیاءؑ کرام کو منتقل کی جانے والی رحمتوں اور برکتوں کے حوالے سے علم کو جو فضیلت حاصل ہے اس سے اس کی افادیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے علم کو اس درجہ اہمیت بھی دی ہے کہ علم حاصل کرنے والوں کو خود (اللہ تعالیٰ کے) وجود کی تصدیق کے لیے بطور گواہ منتخب کیا۔

شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ وَ الْمَلٰٓىِٕكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ قَآىِٕمًۢا بِالْقِسْطِ (آل عمران پ ۳، ۳–۱۸)

شہادت دی اللہ تعالیٰ نے (اس بات کی کہ) بے شک نہیں کوئی خدا سوائے اس کے (اور یہی گواہی دی) فرشتوں نے اور اہل علم نے (ان سب نے یہ بھی گواہی دی کہ وہ) قائم فرمانے والا ہے، عدل و انصاف کو

اللہ تعالیٰ کے معبود حقیقی ہونے کی سب سے پہلی تصدیق تو خود اللہ تعالیٰ کا اعلان ہے اس کے بعد حق و انصاف کے تقاضوں کے مطابق فرشتوں اور اہل علم نے بھی اللہ کے معبود ہونے کی تصدیق کی۔ گویا اللہ تعالیٰ اور فرشتوں کی گواہی کے ساتھ ساتھ اہل علم کی گواہی کو شامل کر کے انہیں بھی انتہائی معتبر گردانا گیا ہے۔ انصاف اور حقیقت پر مبنی یہ شہادت اہل علم کی عقل و دانش اور ان کی سچائی اور راست بازی کی توثیق بھی ہے جسے خود اللہ تعالیٰ نے سند اعتبار عطا کی ہے۔ اس آیت مبارکہ کے حوالے سے علم حاصل کرنے والوں کی اہمیت میں اور اضافہ ہو جاتا ہے۔ ان لوگوں کی اللہ تعالیٰ اور انبیاء کرام سے قربت اور تعلق کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ علم انسان کو حق اور صداقت جیسے اوصاف عطا کرتا ہے جس کی وجہ سے وہ فیصلے کرنے میں دوسروں سے بہتر کارکردگی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔

(۴) اللہ علم حاصل کرنے والوں کے درجات بلند کرتا ہے

علم حاصل کرنے والوں کو دوسروں پر فضیلت حاصل ہے۔ یہ فضیلت اس اعتبار سے تو ہے کہ وہ دنیا میں عام لوگوں کے برعکس زیادہ آسانی سے اپنی ذمہ داریوں اور اختیارات کو سمجھ سکتے ہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے علم حاصل کرنے والوں کو اس دنیا کے علاوہ آخرت میں بھی اعلیٰ مرتبہ کی نوید دی ہے۔ (القرآن)

يَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ (۵۸-۱۱) (المجادلہ۔ پ ۔ ۲۸)

اللہ تعالیٰ ان کے جو تم میں سے ایمان لے آئے اور جن کو علم دیا گیا درجات بلند فرمائے گا۔

علم حاصل کرنے والوں کی مشکلات دور کرنے میں اللہ تعالیٰ بھی ان کی مدد کرتا ہے وہ لوگ جو خود اس منزل کی جانب سفر کرنا چاہیں ان کے لیے سہولتیں پیدا کرتا ہے۔ یہ ان سے اللہ تعالیٰ کی محبت کا واضح اظہار ہے۔ (القرآن)

اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ (۲-۲۵۷) (بقرہ پ ۳)

اللہ مددگار ہے ایمان والوں کا۔ نکال لے جاتا ہے انہیں اندھیروں سے نور کی طرف

اللہ تعالیٰ ایمان والوں کا مددگار ہے اور انہیں تاریکیوں سے نکال کر روشنیوں میں لاتا ہے

انسانوں کو تاریکیوں سے روشنیوں میں لانا

To lead them from darkness to light.

صدیوں سے لے کر اب تک علم کا منشا و مقصد رہا ہے۔ قرآن میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد اسی جانب اشارہ کرتا ہے جس کے مطابق جہل کی تاریکی سے علم کی روشنی میں آنا دراصل اپنے خالق حقیقی اور اپنے مقصد حیات کو سمجھنے کا عمل ہے جو اللہ تعالیٰ کی تائید ہی سے حاصل ہوتا ہے۔

۵۔ علم انسان کے لیے ہدایت اور روشنی ہے۔

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے کئی مقامات پر واضح ارشاد فرمایا کہ علم حاصل کرنا دراصل ہدایت اور روشنی حاصل کرنے کے مترادف ہے۔ علم حاصل کرنے والے اسی لیے اللہ تعالیٰ کے نزدیک پسندیدہ افراد قرار دیئے جاتے ہیں۔ علم کو ہدایت اور روشنی کے حوالے سے پیش کرتے ہوئے اس امر کا اعلان بھی کیا گیا کہ اسے حاصل کرنے والے لوگ عقل مند ہوتے ہیں۔ (القرآن)

فَبَشِّرْ عِبَادِ ۝ الَّذِيْنَ يَسْتَمِعُوْنَ الْقَوْلَ فَيَتَّبِعُوْنَ اَحْسَنَهٗ ۚ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ هَدٰىهُمُ اللّٰهُ وَاُولٰٓئِكَ هُمْ اُولُوا الْاَلْبَابِ ۝ (۳۹ - ۱۸ - ۱۷) (الزمر۔ پ ۔ ۲۳)

پس آپ مژدہ سنا دیں میرے ان بندوں کو جو غور سے سنتے ہیں بات کو پھر پیروی کرتے ہیں اچھی بات کی یہی وہ لوگ ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے ہدایت دی ہے اور یہی لوگ دانشور ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے علم وحکمت کی باتیں سننے اور عقل کے ذریعہ ان کا اکتساب کرنے والوں کو ہدایت اور روشنی کی بشارت دی ہے۔ یقیناً وہ لوگ جو اس کے مطابق عمل کرتے ہیں ان کے تمام دنیاوی اور اخروی مسائل اور معاملات حل ہوتے جاتے ہیں۔ فہم وفراست کا تقاضہ بھی یہی ہے کہ انسان سننے اور دیکھنے کے بعد اس کے نتائج کا جائزہ لے اور اس سے رہنمائی حاصل کرے۔ کوشش کرنے اور جاننے کی جدوجہد کرنے والوں کی اللہ تعالیٰ بھی رہنمائی فرماتے ہیں۔ (القرآن)

(۲۹ - ۶۹)

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ۚ وَاِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِيْنَ (عنکبوت۔ پ ۲۱)

اور جو (بلند ہمت) مصروف جہاد رہتے ہیں ہمیں راضی کرنے کے لیے ہم ضرور دکھا دیں گے انہیں اپنے راستے اور بلاشبہ اللہ تعالیٰ (ہر وقت) محسنین کے ساتھ ہے۔ ایسے ہی لوگوں کے لیے ارشاد ہوا ہے (القرآن)

لَهُمْ اَجْرُهُمْ وَنُوْرُهُمْ (۵۷ - ۱۹) (الحدید۔ پ ۲۷)

ان کے لیے (خصوصی) اجر اور ان کا (مخصوص) نور ہے۔

اللہ تعالیٰ نے علم کو ہدایت اور روشنی سے تعبیر فرمایا اور جنہیں ہدایت اور روشنی عطا ہوئی وہ انتہائی معتبر اور برگزیدہ افراد قرار دیئے گئے علم کی یہ ہدایت اور روشنی اللہ تعالیٰ ہی کی جانب سے عطا ہوتی ہے ایک اور مقام پر اسی سلسلے میں واضح ارشاد ہے۔ (القرآن)

يَهْدِى اللّٰهُ لِنُوْرِهٖ مَنْ يَّشَآءُ (۲۴ - ۳۵) (نور - پ ۱۸)

پہنچا دیتا ہے اللہ تعالیٰ اپنے نور کی طرف جس کو چاہتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے حصول علم کے لیے چند افراد کا کوئی گروہ مخصوص نہیں کر دیا کہ انہی کو ہدایت اور حکمت کے راستے بتائے جائیں بلکہ یہ روشنی سب کے لیے عام کی گئی ہے سب کو یکساں مواقع فراہم کیے گئے ہیں اور جن لوگوں نے بھی غور وفکر اور تدبر سے کام لیا انہیں ہدایت حاصل ہوئی۔ یہ نعمت خداوندی سب کے لیے عام ہے اور جو جتنی کوشش کرتے ہیں اتنا ہی انہیں ملتا ہے وہ اپنی جانب سے کوئی پابندی نہیں لگاتا۔

اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ (۹۴ - ۱) (الانشراح۔ پ ۳۰)

کیا ہم نے آپ کی خاطر آپ کا سینہ کشادہ نہیں کر دیا۔

(۶) اللہ تعالیٰ کو جہل سے نفرت ہے

اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے جو تعلیمات عام لوگوں تک پہنچائیں ان سے علم کی قدر وقیمت کا صحیح اندازہ ہوتا ہے وہ لوگ جنہوں نے عقل سے کام نہ لیا اور بلا سوچے سمجھے

ان باتوں کو جھٹلاتے ہیں ان کے لیے بھی کوششیں کی گئیں کہ انہیں جہل اور گمراہی سے نکالا جائے۔ اللہ تعالیٰ کو جہل سے اس درجہ نفرت ہے کہ دنیا کے بدترین کافر اور اسلام اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سب سے بڑے دشمن کو اسی حوالے سے پہچانا جاتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف سازشیوں کے سربراہ اور اللہ کی وحدانیت کے منکر ابوالحکم بن ہشام کو جاہلوں کا باپ یا سردار (ابوجہل) کا نام دے دیا گیا جو آج تک موجود ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو جاہلوں سے اعراض برتنے کا مشورہ بھی دیا گیا (القرآن)

وَاَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِيْنَ ﴿۱۹۹﴾ (۷-۱۹۹) (اعراف-پ-۹)

اور رخ (انور) پھیر لیجئے نادانوں کی طرف

نہ ماننے والوں اور حجت کرنے والوں کے بارے میں سب سے واضح ریمارک ان کے جہل کی نشاندہی تھا۔ (القرآن)

وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ يَجْهَلُوْنَ ﴿۱۱۱﴾ (۶-۱۱۱) (الانعام-پ-۸)

لیکن اکثر ان میں سے (بالکل) جاہل ہیں۔

قرآن کریم میں لوگوں کو سمجھانے کے لیے کئی مقامات پر مثالیں دی گئی ہیں وہ لوگ جو ان پر غور نہ کریں اور بلا سوچے سمجھے انہیں مسترد کر دیں ان کے لیے دوسروں کا حوالہ دے کر کہا گیا ہے کہ وہ جاہلوں کی طرح نہ کریں۔ (القرآن) فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ ﴿۳۵﴾ (۶-۳۵) (الانعام-پ-۷)

تو آپ نہ ہو جایئں ان میں سے جو (حقیقت کا) علم نہیں رکھتے۔

جاہلوں کو چوپایوں سے بھی تشبیہہ دی گئی ہے جن میں کوئی شعور نہیں ہوتا اسی لیے وہ دوسری مخلوق کے مقابلے میں کمتر اور حقیر سمجھے جاتے ہیں۔ (القرآن)

(فرقان-پ-۱۹)

اَمْ تَحْسَبُ اَنَّ اَكْثَرَهُمْ يَسْمَعُوْنَ اَوْ يَعْقِلُوْنَ اِنْ هُمْ اِلَّا كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ سَبِيْلًا (۲۵-۴۴)

کیا آپ خیال کرتے ہیں کہ ان میں سے اکثر لوگ سنتے ہیں یا کچھ سمجھتے ہیں، نہیں ہیں۔ یہ مگر چوپایوں کی مانند بلکہ یہ ان سے بھی زیادہ گمراہ ہیں۔

عقل سے کام نہ لینے والوں کو اللہ تعالیٰ نے اسی طرح حقیر اور قابل نفرت گردانا ہے ایک اور مقام پہ بہت ہی واضح ارشاد ہوا۔ (القرآن)

اِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ عِنْدَ اللّٰهِ الصُّمُّ الْبُكْمُ الَّذِيْنَ لَا يَعْقِلُوْنَ (۸-۲۲) (الانفال-پ ۹)

بیشک سب جانوروں سے بدتر اللہ کے نزدیک وہ بہرے گونگے انسان ہیں جو کچھ نہیں سمجھتے (عقل سے کام نہیں لیتے)

علم و حکمت کی روشنی اور ہدایت سے دور رہنے والوں میں جو لوگ یا گروہ شامل ہوئے انہیں اللہ تعالیٰ نے ناپسندیدہ قرار دیا۔ اس کی ایک انفرادی مثال تو ابوجہل کا کردار ہے جو صدیوں سے اپنے

اصلی نام کے بجائے اس قابل نفرت نام سے موسوم ہوا۔ اس کی دوسری مثال اہل یہود ہیں جن کے اجتماعی اور قومی کردار سے سب ہی واقف ہیں انہوں نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں سازشوں اور ریشہ دوانیوں کا سلسلہ شروع کیا تھا جو بین الاقوامی سطح پہ آج بھی جاری ہے ان لوگوں کیلئے قرآن میں ارشاد ہوا ہے (القرآن)

وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۸۵﴾ (۱۷۔ ۸۵) (بنی اسرائیل۔ پ ۱۵)

اور نہیں دیا گیا ہے تمہیں علم مگر تھوڑا سا

وہ لوگ جو علم جیسی نعمت سے محروم ہیں یقیناً ان سے اللہ تعالیٰ ناراض ہوتا ہے۔

۷۔ خوف خدا بھی علم ہی کے ذریعے آتا ہے

اللہ تعالیٰ کی حاکمیت اور اس کے اختیارات کا اندازہ کرنے کے لیے بھی علم کا ہونا ضروری ہے، جو علم نہیں رکھتے ان میں خدا کا خوف بھی نہیں ہوتا یہاں تک کہ عبادت گزاروں کے لیے بھی یہ لازم ہے کہ وہ علم حاصل کریں اس لیے کہ علم کے بغیر انہیں خالق حقیقی کا صحیح اندازہ نہیں ہو سکتا۔ (القرآن)

اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا ۗ (۳۵۔ ۲۸) (فاطر۔ پ ۲۲)

اللہ کے بندوں میں سے صرف علماء ہی پوری طرح اس سے ڈرتے ہیں۔

۸۔ اہل علم روز قیامت کے گواہ ہیں

علم حاصل کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ نے اس درجہ معتبر قرار دیا ہے کہ خود اپنی تصدیق کے لئے ان کی گواہی کا حوالہ دیا۔ یہ صرف اس لیے تھا کہ اہل علم دوسروں کے برعکس عقل و دانش سے کام لیتے ہیں اور جو عقل و دانش سے کام لیں وہ یقیناً اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور اس کی حاکمیت کی تائید کرتے ہیں۔ دنیا کے تمام اعمال کے احتساب کے لیے روز محشر پہ ایمان بھی اسلام کے اساسی عقائد میں شامل ہے روز محشر کی تصدیق کے حوالے سے بھی اہل علم کو اس درجہ معتبر سمجھا گیا ہے کہ ان کی گواہی کو اہل ایمان کی گواہی کے ساتھ شامل کیا گیا ہے۔ (القرآن)

وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ يُقْسِمُ الْمُجْرِمُوْنَ ۙ مَا لَبِثُوْا غَيْرَ سَاعَةٍ ۭ كَذٰلِكَ كَانُوْا يُؤْفَكُوْنَ ﴿۵۵﴾
وَقَالَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ وَالْاِيْمَانَ لَقَدْ لَبِثْتُمْ فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ اِلٰى يَوْمِ الْبَعْثِ ۡ فَهٰذَا يَوْمُ الْبَعْثِ وَلٰكِنَّكُمْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۵۶﴾

(۳۰۔ ۵۶/۵۵) (الروم۔ پ ۲۱)

اور جس روز قیامت قائم ہوگی قسمیں اٹھائیں گے مجرم کہ نہیں ٹھہرے وہ (دنیا میں) مگر ایک ساعت

یوں ہی وہ پہلے بھی غلط بیانی کیا کرتے تھے اور کہیں گے وہ لوگ جنھیں علم اور ایمان دیا گیا (انہیں) کہ تم ٹھہرے رہے ہو نوشتۂ الٰہی کے مطابق روزِ حشر تک۔ پس یہ (آگیا) ہے یومِ محشر، لیکن تم نہیں جانتے تھے

گنہ گاروں کے سامنے حقیقت بیان کرنے کے لیے علم اور ایمان رکھنے والوں کی گواہی کا حوالہ دیا گیا ہے علم اور ایمان کی ان دونوں خصوصیات کے حوالے سے ایک ہی گروہ کے افراد مراد لئے گئے ہیں گویا گواہ ہونے کی سعادت کے ساتھ ساتھ یہ سعادت بھی اہل علم ہی کے حصے میں آتی ہے کہ انہیں علم کے ساتھ ایمان کی دولت بھی عطا ہوتی ہے۔

۹۔ اہل علم کی پیروی کرنی چاہیے

اہل علم بھی عام لوگوں کی طرح انسان ہوتے ہیں فرق صرف یہ ہے کہ وہ عقل وشعور کے ذریعے تمام اشیا کا ادراک کرتے ہیں اور پھر سچائی اور حقیقت کو قبول کرتے ہیں یہ سچائی اور حقیقت جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے انہیں منجانب اللہ عطا ہوتی ہے۔ اہل علم کو اس خصوصیت کی بنا پر دوسروں پر ترجیح دی گئی ہے بلکہ دوسروں کو اس امر کی ہدایت کی گئی ہے کہ وہ ان کی پیروی کریں۔

(القرآن) أُولَٰئِكَ الَّذِينَ هَدَى اللَّهُ فَبِهُدَاهُمُ اقْتَدِهْ ؕ (۶-۹۰) (الانعام پ ۷)

یہی وہ لوگ ہیں جنھیں ہدایت دی تھی اللہ نے تو انہی کے طریقہ کی پیروی کرو

پیروی کرنے والوں کی تخصیص نہیں کی گئی کہ صرف ان پڑھ ہی ان کی پیروی کریں یا صرف غربا اور مساکین پر یہ فرض عائد کر دیا گیا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہدایت حاصل کرنے والوں کی پیروی کریں بلکہ یہ سب لوگوں پر لازم ہے امرا اور حکام بھی اس سے بالاتر نہیں ہیں۔ مسلمانوں کی تاریخ میں اس نوعیت کی کئی مثالیں موجود ہیں جن سے اہل علم کی اطاعت اور ان کی فرمانبرداری کے شواہد ملتے ہیں۔

۱۰۔ علم بھلائی ہے

اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں علم کے لیے بے شمار مقامات پر واضح ارشادات فرمائے ہیں۔

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم پر پہلی وحی کے ذریعے نازل ہونے والی پہلی سورۃ اور اس کا سب سے پہلا لفظ ہی رسمی تعلیم کی نشاندہی کرتا ہے۔ اسی سورۃ میں انسان کی تخلیق کے عمل کی نشاندہی کے ساتھ ساتھ قلم اور تعلیم کا ذکر ہے جو اللہ تعالیٰ نے انسان کو اس لئے عطا کی کہ وہ بھی حقیقت کو جان سکے۔

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَۚ۝ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍۚ۝ اِقْرَاْ وَ رَبُّكَ الْاَكْرَمُۙ۝ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِۙ۝ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْؕ۝ (۹۶ - ۵/۱) (العلق - پ - ۳۰)

آپ پڑھیئے اپنے رب کے نام کے ساتھ جس نے (سب کو) پیدا فرمایا پیدا کیا انسان کو جمے ہوئے خون سے پڑھیے آپ کا رب بڑا کریم ہے جس نے علم سکھایا قلم کے واسطہ سے اُسی نے سکھایا انسان کو جو وہ نہیں جانتا تھا۔ اللہ نے خود ہی انسان کو علم عطا کیا جس کے ذریعے اس نے کائنات کی حقیقتوں کو سمجھا اور تسلیم کیا۔ یہی وہ خصوصیت تھی جس کی وجہ سے ایک قوم کو دوسری قوم پر فضیلت حاصل ہوئی اور جنہوں نے اس سے کنارہ کشی اختیار کی وہ گمراہ اور برباد ہوئے۔ (القرآن)

وَ تِلْكَ حُجَّتُنَاۤ اٰتَیْنٰهَاۤ اِبْرٰهِیْمَ عَلٰى قَوْمِهٖؕ نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَآءُؕ اِنَّ رَبَّكَ حَكِیْمٌ عَلِیْمٌ (۶ - ۸۳) (انعام - پ - ۷)

اور یہ ہماری دلیل تھی جو ہم نے ابراہیم کو دی اس کی قوم کے مقابلے میں۔ ہم بلند کرتے ہیں درجے جس کے چاہتے ہیں بے شک آپ کا رب بڑا دانا سب کچھ جاننے والا ہے۔

اللہ تعالیٰ چونکہ خود دانا اور حکمت والا ہے اس لیے اس کی جانب سے جن افراد اور قوموں کو دانائی اور حکمت عطا ہوتی ہے وہ ان افراد اور قوموں کے حق میں نعمت خداوندی ہے کیونکہ علم دراصل دنیا اور آخرت دونوں کے لیے ایک بڑی بھلائی ہے۔ (القرآن)

یُّؤْتِی الْحِكْمَةَ مَنْ یَّشَآءُۚ وَ مَنْ یُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِیَ خَیْرًا كَثِیْرًاؕ (۲ - ۲۶۹) بقرہ پ ۳

عطا فرماتا ہے دانائی جسے چاہتا ہے اور جسے عطا کی گئی دانائی۔ تو یقیناً اسے دے دی گئی بہت بھلائی۔ انسان کو حکمت اور دلیل جیسی نعمتیں دینا درحقیقت علم کی دو خصوصیات کی نشاندہی بھی ہے جنہوں نے علم حاصل کرنے کی جدوجہد کی انہوں نے گویا اللہ سے اس نعمت کے حصول میں کوشش کی اور یقیناً وہ کامیاب رہے۔ علم انسانوں کے لیے ایسی بھلائی سے تعبیر کیا گیا ہے جس کی کوئی حد مقرر نہیں ہے اور نہ ہی مختلف خصوصیات کے حوالے سے یہ زندگی کے مخصوص شعبوں تک ہی محدود ہے۔

۱۱۔ علم اور ایمان باہم مربوط ہیں

علم حاصل کرنے والے دنیا کے تمام انسانوں سے ممتاز اور افضل ہوتے ہیں اللہ نے واضح ارشادات کے ذریعہ جاننے والوں اور نہ جاننے والوں میں اس فرق کی نشاندہی فرما دی ہے۔ وہ لوگ جو نہیں جانتے ان کے لیے نجات کے راستے بھی مسدود ہو جاتے ہیں ان کے برعکس جو لوگ عقل سے کام لیتے ہیں (اور علم حاصل کرتے ہیں) وہی حقیقت کو پا کر صحیح راستے کا انتخاب کر سکتے ہیں (القرآن)

قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِينَ يَعْلَمُونَ وَالَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ ۗ إِنَّمَا يَتَذَكَّرُ أُولُو الْأَلْبَابِ ۝

(الزمر - پ۲۳) (۳۹ - ۹)

آپ پوچھیے کیا کبھی برابر ہو سکتے ہیں علم والے اور جاہل البتہ صرف عقل مند ہی نصیحت قبول کرتے ہیں۔

جاننے اور نہ جاننے والوں میں اس واضح فرق کی نشاندہی ایک اور مقام پر بھی واضح طور پر کی گئی ہے۔ (القرآن)

أَفَمَن يَعْلَمُ أَنَّمَا أُنزِلَ إِلَيْكَ مِن رَّبِّكَ الْحَقُّ كَمَنْ هُوَ أَعْمَىٰ (۱۳-۱۹) (الرعد - پ ۱۳)

تو کیا جو شخص جانتا ہے کہ جو نازل کیا گیا آپ کی طرف۔ آپ کے رب کی جانب سے وہ حق ہے وہ اس جیسا ہوگا جو اندھا ہے۔

جاننے اور نہ جاننے والوں کے مابین فرق کی نشاندہی ان قرآنی آیات کی روشنی میں بہت ہی واضح ہو جاتی ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تو اس سلسلے میں اپنی ذات کو مثال بنا کر پیش کیا اور فرمایا کہ علم حاصل کرنے والا عام لوگوں کے نزدیک بالکل اس درجہ محترم ہے جتنے آپ صلی اللہ علیہ وسلم تمام لوگوں سے محترم تھے۔ یہ مختلف احکامات اور حوالے اس بات کی تائید کرتے ہیں کہ علم کے بغیر فضیلت اور بزرگی تو درکنار انسان خالق حقیقی کو بھی نہیں پہچان سکتا۔ اس طور سے مزید غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ علم اور ایمان باہم مربوط ہیں۔ بلکہ علم کے بغیر ایمان میں استحکام پیدا نہیں ہوتا حضور کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ذات گرامی کی مثال دے کر حصول علم کے معاملے کو اور بھی زیادہ محترم بنا دیا ہے۔ غرض وہ لوگ جنہیں علم دیا گیا ہے وہی بہتر جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے اور عام لوگوں کے لیے کیا راہ متعین فرمائی ہے وہی اللہ تعالیٰ اور اس کی طرف سے جو کچھ نازل کیا گیا ہے اسے تسلیم کرتے ہیں جبکہ ان کے برعکس علم نہ رکھنے والے اپنے خالق حقیقی اور مقصد حیات دونوں سے بے خبر ہوتے ہیں۔ (القرآن)

وَيَرَى الَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ الَّذِي أُنزِلَ إِلَيْكَ مِن رَّبِّكَ هُوَ الْحَقَّ (۳۴-۱)

اور جانتے ہیں وہ لوگ جنھیں علم دیا گیا کہ جو آپ کی طرف نازل کیا گیا ہے۔ آپ کے رب کی طرف سے وہی (عین) حق ہے۔

۱۲۔ اہل علم انبیا کے وارث ہیں

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنے قول اور عمل کے اعتبار سے دنیا کی مثالی شخصیت تھے۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک آپؐ کا مرتبہ اتنا بلند تھا کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تمام انبیاء کرام کے پروگرام کی تکمیل

کی ذمہ داری سونپی گئی۔ آپؐ نے بھی علم کی اہمیت اور افادیت پر بہت زور دیا بلکہ اہل علم کو اپنا وارث قرار دیا (حدیث)

العلماء ورثۃ الانبیاء ان الانبیاء لم یورثوا دینارًا ولا درھما انما ورثوا العلم فمن اخذہٗ اخذ بحظ وافر (ابوداؤد۔ ترمذی)

علماء ہی انبیاء کے وارث ہوتے ہیں انبیاء اپنے ترکے میں دینار اور درہم نہیں چھوڑ جاتے ان کا ترکہ علم ہوتا ہے جس نے اسے اخذ کیا پس اس نے وافر حصہ (اس علمی ترکہ سے حاصل کرلیا (ترجمہ)

انبیاء کرام کو دنیا میں اللہ تعالیٰ نے اسی لیے مبعوث کیا تھا کہ وہ لوگوں کو اللہ کی وحدانیت کی تعلیم دیں اور انہیں وہ سب کچھ بتائیں جس کا جاننا ان کے لیے ضروری ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد دنیا میں انبیاء کرام کی بعثت کا سلسلہ بند کردیا گیا اس لئے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہوتے ہوئے ہی اللہ تعالیٰ نے دین کو مکمل کردیا تھا اور بعد میں کسی کے آنے کی گنجائش ہی باقی نہیں رہی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق آپؐ کے بعد اب یہ ذمہ داری اہل علم پر عائد ہوتی ہے کہ وہ انبیاء کی تقلید کرتے ہوئے لوگوں کو سچائی اور حقیقت کی تعلیم دیں علم ہی دراصل وہ واحد تعلق اور رشتہ ہے جس کی بنا پر اہل علم کو نبیوں کا وارث قرار دیا گیا ہے۔ علم کو دنیا کی دولت اور سرمایہ سے بڑا تصور کرتے ہوئے واضح طور پر بتا دیا گیا کہ انبیاء کے ترکے میں دینار اور درہم نہیں ہوتے بلکہ علم ہوتا ہے اس حدیث مبارکہ کی روشنی میں علم انبیاء کرام کا اثاثہ ٹھہرا اور اس اثاثہ کے حقیقی وارث وہ لوگ قرار دیئے گئے جو علم حاصل کرتے ہیں اور اسے انسانی فلاح وبہبود کے لیے دوسروں تک منتقل کرتے ہیں۔ انبیاء اور علماء کے باہمی تعلق کی تصدیق ایک اور حدیث سے ہوتی ہے جو حسنؓ سے روایت ہے۔

من جاءہ الموت وھو یطلب العلم لیحیی بہ الاسلام فبینہ وبین النبیین درجۃ واحدۃ فی الجنۃ" (دارمی)

جس شخص کو موت آئی اور جبکہ علم کو تلاش کر رہا ہے تاکہ اس کے ساتھ اسلام کو زندہ کرے اس کے درمیان اور انبیاء کے درمیان جنت میں ایک درجہ کا فرق ہوگا۔ (ترجمہ)

اس حدیث مبارکہ سے اہل علم کی دو فضیلتیں ظاہر ہوتی ہیں۔ اول یہ کہ وہ جنت میں جائیں گے اور دوم یہ کہ ان کے اور انبیاء کرام کے درمیان صرف ایک درجے کا فرق ہوگا اور اس طرح دنیا کے باقی لوگ ان کے بعد جگہ پائیں گے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ان ارشادات سے علم

اور اہل علم کی اہمیت اور فضیلت کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔

۱۳۔ علم صدقہ جاریہ ہے

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے علم کو صدقہ جاریہ میں شمار فرمایا ہے۔

اذامات الانسان انقطع عنہ عملہ الا من صدقۃ جاریۃ او علم ینتفع بہ او ولدٍ صالح یدعوا لہٗ (مسلم)

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جب انسان مرجاتا ہے تو اس کے عمل کا (ثواب کا) سلسلہ منقطع ہوجاتا ہے مگر تین کاموں کا ثواب برابر جاری رہتا ہے اول صدقہ جاریہ جیسے کنویں یا اوقاف وغیرہ جن سے لوگ استفادہ کرتے رہیں دوم علم جس سے نفع حاصل کیا جائے جیسے کسی کو پڑھایا یا کوئی کتاب لکھی اور سوم اولاد صالح جو مرنے کے بعد اس کے لیے دعا کرتی رہے۔[۱]

علم حاصل کرنا اور اس سے دوسروں کو فائدہ پہنچانا (علم کی اشاعت کرنا تاکہ دوسرے لوگ بھی اس سے استفادہ کرسکیں) آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول کے مطابق صدقہ جاریہ ہے اس کا اجر انسان کے انتقال کرجانے کے بعد بھی جاری رہتا ہے اور یقیناً اس طرح علم حاصل کرنے اور اس کی اشاعت کرنے والے کو تاقیامت ثواب ملتا رہتا ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے اسی نوعیت کی ایک اور روایت منسوب ہے (حدیث)

ان مما یلحق المومن من عملہ و حسناتہ بعد موتہ علماً علمہ ونشرہ و ولداً صالحاً ترکہ او مصحفا ورثہ او مسجداً بناہ او بیتاً لابن السبیل بناہ او نھراً اجراہ او صدقۃ اخرجھا من مالہ فی صحتہ وحیوتہ تلحقہ من بعد موتہ (ابن ماجہ)

تحقیق اس قسم کے عمل سے جو مومن کو مرنے کے بعد پہنچتا ہے علم ہے کہ اسے سکھایا اور رواج دیا اور اولاد نیک بخت چھوڑ گیا یا قرآن چھوڑا اپنے وارثوں کو یا مسجد کو بنایا یا سرائے مسافروں کے لیے بنوائی یا نہر جاری کرگیا یا صدقہ جسے اپنے مال سے تندرستی اور زندگی میں نکالا۔ اس کو اس کی موت کے بعد پہنچتا ہے۔ (ترجمہ)

---

[۱] مشکوٰۃ شریف مترجم جلد اول۔ کتاب العلم۔ صفحہ ۹۴

۱۴۔ علم گناہوں کا کفارہ ہے

علم کی بزرگی اور برتری کی ایک سند یہ بھی ہے کہ اس شخص کے لیے جس نے ماضی میں کوتاہیاں کیں اور گناہ کئے علم کو اس کے لیے کفارہ قرار دیا گیا ہے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا قول مبارک سنجرہ ازدی رضؓ سے روایت ہے کہ (حدیث)

من طلب العلم کان کفارۃ لما مضیٰ (ترمذی۔ دارمی)

جو شخص علم طلب کرتا ہے یہ کفارہ بن جاتا ہے ان گناہوں کا جو اس نے پہلے کئے ہوئے ہیں (ترجمہ)
گویا جس نے علم سے رجوع کیا اس نے حقیقت اور سچائی سے رجوع کیا اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اس کی ماضی کی کوتاہیاں جو لاعلمی اور جہل کے سبب اس سے سرزد ہوئی ہیں معاف ہو جاتی ہیں۔ تصور یہی ہے کہ جو لوگ علم حاصل کر لیں ان کا آئندہ عمل غلطیوں سے پاک ہو جاتا ہے اور وہ ان غلطیوں کا اعادہ نہیں کرتے جو اس سے پہلے کر چکے ہوں۔ علم کی اہمیت اور افادیت کی اس سے بڑی تصدیق اور کیا ہوگی کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زندگی ہی میں دین حق کو سمجھ لینے والے لوگوں کو عام مسلمانوں کی طرح عزت اور احترام دیا اور ان سے ان کے ماضی کے اعمال کے بارے میں استفسار نہیں کیا۔ اس قول سے یہ بات بھی سمجھ میں آتی ہے کہ اسلام لوگوں کو سزا دینے پر اصرار نہیں کرتا بلکہ انہیں رجوع کرنے کے مواقع فراہم کرتا ہے تاکہ ان کی کوتاہیاں معاف کر دی جائیں۔

۱۵۔ علم کی فضیلت عبادت سے زیادہ ہے

وعن ابن عباس رضؓ قال تدارس العلم ساعۃ من اللیل خیر من احیائھا (دارمی)

ابن عباس سے روایت ہے کہ رات کو تھوڑی دیر علم کا درس کہنا رات کے زندہ رکھنے (رات بھر عبادت کرنے) سے بہتر ہے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک بار دو آدمیوں کے متعلق معلوم کیا گیا جن دونوں کا تعلق بنی اسرائیل سے تھا ان میں ایک عالم تھا وہ فرض نمازیں پڑھتا اور پھر لوگوں کو علم سکھانے بیٹھ جاتا تھا اور دوسرا عابد تھا جو دن کو روزہ رکھتا اور رات کو قیام (عبادت) کرتا تھا۔ آپؐ سے پوچھا گیا کہ ان دونوں میں سے افضل کون ہے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

فضل هذا العالم الذی یصلی المکتوبۃ ثم یجلس فیعلم الناس الخیر علی العابد الذی یصوم النھار و یقوم اللیل کفضلی علی ادنٰکم (دارمی)

اس عالم کی فضیلت جو فرض نمازیں پڑھتا ہے پھر لوگوں کو علم سکھانے بیٹھ جاتا ہے اس عابد پر جو دن کو روزہ رکھتا ہے اور رات کو قیام کرتا ہے اس قدر ہے جیسے مجھے تمہارے ایک ادنیٰ پر فضیلت حاصل ہے۔ (ترجمہ)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے عمل سے بھی اہل علم کی فضیلت کی تصدیق فرمائی، ایک بار مسجد نبوی میں علم اور عبادت میں مشغول دو الگ الگ مجالس کو بہتری کی مجالس قرار دیا اور خود یہ فرماتے ہوئے کہ علم کی مجلس میں شریک لوگ زیادہ بھلائی پر ہیں خود بھی اہل علم کی مجلس میں شریک ہو گئے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات اور اس عمل سے عبادت کی نفی نہیں ہوتی کہ جیسے جواز بنا کر انسان بنیادی عبادات کو ترک کر دے اور صرف حصول علم میں مصروف ہو جائے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے علم کو بھی عبادت ہی کی ایک شکل بیان فرمایا ہے اس طرح عالموں کو عابدوں پر فضیلت عطا کی ہے۔ اسلام بنیادی طور پر دین عمل ہے اور عمل کا تعلق عبادت کے مقابلے میں علم سے زیادہ ہے۔ علم اور عمل دونوں ہی ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔ ابن وہب سے روایت ہے کہ وہ ایک بار امام مالک کے پاس بیٹھے لکھنے میں مشغول تھے کہ اپنی تختیوں کو چھوڑ کر نماز پڑھنے لگے امام مالک نے یہ دیکھ کر فرمایا کہ جس کام کے لیے اٹھے ہو وہ اس کام سے بہتر نہیں جسے تم نے چھوڑا ہے۔[1]

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کے مطابق اشاعت علم تو ایسا عمل ہے جو انسان کے مرنے کے بعد بھی جاری رہتا ہے جبکہ عبادت کا سلسلہ صرف اسی وقت تک جاری رہتا ہے جب تک انسان اس دنیا میں موجود ہے یہی سبب ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے علم کو عبادت پر فوقیت دی۔

۱۶۔ حصول علم مثل جہاد ہے

اسلام میں جہاد کی بڑی فضیلت ہے، حق کے لیے جد و جہد کرنا ویسے بھی دنیا میں سب سے افضل کام تصور کیا جاتا ہے۔ ان لوگوں کو آخرت میں بھی اعلیٰ درجات عطا کیے جاتے ہیں جو اپنی

---

[1] حافظ ابن القیم: فضائل علم و علما: مترجم عبدالحکیم۔ المکتبہ سلفیہ۔ لاہور ۱۹۶۲ء صفحہ ۱۲۰

زندگیاں جہاد کے لئے وقف کردیں، علم حاصل کرنے والوں کو بھی اسی زمرے میں شامل کیا گیا ہے اور حصول علم کو جہاد ہی کی طرح سمجھا گیا ہے۔ (القرآن)

وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُونَ لِيَنْفِرُوا كَافَّةً ۚ فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِنْهُمْ طَائِفَةٌ لِيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّينِ وَلِيُنْذِرُوا قَوْمَهُمْ إِذَا رَجَعُوا إِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُونَ ۝ (۹-۱۲۲) توبہ (پ - ۱۱)

اور یہ تو ہو نہیں سکتا کہ مومن نکل کھڑے ہوں سارے کے سارے تو کیوں نہ نکلے ہر قبیلے سے چند آدمی تاکہ تفقہ حاصل کریں دین میں اور ڈرائیں اپنی قوم کو جب لوٹ کر آئیں ان کی طرف تاکہ وہ (نافرمانیوں سے) بچیں۔

قوم کے تمام افراد کے لیے جہاد کے ساتھ ساتھ علم کی اہمیت بھی اجاگر کی گئی ہے انہیں ہدایت کی گئی ہے کہ وہ علم کے شعبے میں بھی جدوجہد کریں تاکہ لوگوں کو حقائق سے باخبر کر سکیں انہیں ان کے حقیقی مقصد حیات سے روشناس کرائیں۔ یہ عمل بھی جہاد ہی کی طرح ہے۔

اسلام نے تعلیم کو صرف اہمیت ہی نہیں دی بلکہ تعلیم حاصل کرنے والوں کو انبیاء کا وارث اور عام لوگوں (یہاں تک عبادت گزاروں) سے بھی زیادہ فضیلت کا حامل قرار دیا۔ علم کے معاملے میں اللہ تعالیٰ اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو عقل اور حواس سے کام لینے کی مکمل اجازت دی بلکہ کئی مقامات پر ان اعضا کا حوالہ بھی دیا گیا جو سننے سمجھنے اور دیکھنے کا کام کرتے ہیں۔ اسی حوالے سے بعض ماہرین آنکھ کان اور دل کو آلات علم Instruments of knowledge کہتے ہیں[1] کیونکہ انہی کے ذریعہ چیزوں کو دیکھا اور سنا جاتا ہے بعض مقامات پر اللہ تعالیٰ نے ان تین اعضا کے ساتھ زبان کو بھی شامل کیا ہے تاکہ سننے دیکھنے اور سمجھنے کے بعد اظہار بھی کیا جا سکے (القرآن)

وَاللَّهُ أَخْرَجَكُمْ مِنْ بُطُونِ أُمَّهَاتِكُمْ لَا تَعْلَمُونَ شَيْئًا وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْأَبْصَارَ وَالْأَفْئِدَةَ ۙ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ۝ (۱۶-۷۸) (النحل - پ ۱۴) اور اللہ تعالیٰ نے تمہیں نکالا ہے تمہاری ماؤں کے شکموں سے اس حال میں کہ تم کچھ نہیں جانتے تھے اور بنائے تمہارے لیے کان، اور آنکھیں اور دل تاکہ تم (ان بیش بہا نعمتوں پر) شکر ادا کرو۔

جن لوگوں نے ان اعضا کے باوجود علم حاصل نہیں کیا اللہ تعالیٰ نے ان کا بھی اسی حوالے سے تذکرہ کیا ہے جس سے واضح ہو جاتا ہے کہ یہ اعضا حصول علم کے لیے دیئے گئے ہیں۔ (القرآن)

---

[1] ایضاً، صفحہ ۱۰۴

وَجَعَلْنَا لَهُمْ سَمْعًا وَّ اَبْصَارًا وَّ اَفْئِدَةً فَمَآ اَغْنٰى عَنْهُمْ سَمْعُهُمْ وَلَآ اَبْصَارُهُمْ وَلَآ اَفْئِدَتُهُمْ مِّنْ شَيْءٍ (۴۶ - ۲۶) الاحقاف - پ ۲۶

اور ہم نے عطا کیے تھے انھیں کان اور آنکھیں اور دل لیکن ان کے کسی کام نہ آئے ان کے کان نہ انکی آنکھیں اور نہ ان کے دل

اسلام میں علم سے مراد صرف رٹنا اور بعض الفاظ کا یاد کر لینا ہی نہیں بلکہ ان تمام حالات اور واقعات کا مشاہدہ اور تجزیہ کرنا ہے جن سے انسان دوچار ہوتا ہے اسے یہ تمام صلاحیتیں اسی مقصد کے لیے دی گئی ہیں ۔ (القرآن)

اَلَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ عَيْنَيْنِ ۝ وَلِسَانًا وَّشَفَتَيْنِ ۝ وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ ۝ (۹۰ - ۱۰/۸) (البلد - پ ۳۰)

کیا ہم نے نہیں بنائیں اس کے لیے دو آنکھیں اور ایک زبان اور دو ہونٹ اور ہم نے دکھا دیں اُسے دونوں نمایاں راہیں ۔

یہ تمام اعضا جنہیں آلات علم کہا گیا ہے باتوں کو سمجھنے اور ان کی حقیقت جاننے کے لیے دیئے گئے ہیں ۔ ان سے کام نہ لیا جائے تو گویا یہ کفران نعمت کے مترادف ہوگا۔ (القرآن)

صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ ۝ (۲ - ۱۷۰) (بقرہ - پ ۲)

یہ لوگ بہرے ہیں گونگے ہیں اندھے ہیں سو وہ کچھ نہیں سمجھتے

ایسے لوگوں سے باز پرس کی جائے گی تو ان اعضا کا حوالہ بھی ہوگا۔ (القرآن)

اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا ۝ (۱۷ - ۳۶)

بے شک کان اور آنکھ اور دل ان سب کے متعلق (تم سے) پوچھا جائے گا۔

غرض انسان کو تمام اعضا اور حواس دے کر اس بات کا موقع فراہم کیا گیا ہے کہ وہ اپنے مشاہدات اور تجربات کے ذریعے نتائج اخذ کرے اور ان نتائج کی بنیاد پر اپنے آئندہ عمل کا تعین کرے یہ پورا عمل علم کے دائرے میں آتا ہے جس کی تعریف و توصیف کے بارے میں آیات اور احادیث کے حوالے پہلے ہی بیان کئے جا چکے ہیں ان حوالوں کے علاوہ قرآن پاک میں وہ تمام اصطلاحات اور الفاظ بھی بکثرت استعمال کئے گئے ہیں جن کا تعلق رسمی تعلیم سے ہے ۔ خود قرآن پاک ہی مثل کتاب ہے اور اس میں ورق اور قرطاس (کاغذ) قلم ۔ نسا (دوات) نسخہ مرقوم ۔ مسطور ۔ مستطر ۔ مکتوب ۔ تخطّہ ۔ تملیٰ اور یملل جیسے وہ تمام الفاظ استعمال کیے گئے ہیں جو عربی زبان میں لکھنے کے مختلف افعال کے صیغوں کے طور پر استعمال ہوتے ہیں ۔ قرآن پاک میں کتابوں ۔ اشیا ، تحریر اور نوشت و خواند یا انشا پردازی کی تراکیب بھی ملتی ہیں ۔ کاتب ۔ مداد (سیاہی) زبر ۔ کتب ۔ لوح اور صحف وغیرہ جیسی اصطلاحات

انہی معنوں میں رائج ہیں۔ سے ان سب اصطلاحات سے بھی قرآن میں علم کی اہمیت اور افادیت کا ثبوت ملتا ہے۔

تعلیم کا سہ رخی عمل

سرسری جائزہ لیا جائے تو اسلامی تعلیمات کے حوالے سے تعلیم کے مندرجہ ذیل تین پہلو سامنے آتے ہیں جنہیں الگ الگ عمل کی حیثیت حاصل ہے لیکن یہ باہم مربوط بھی ہیں۔ ان اعمال کی ترتیب وار تکمیل نہ کی جائے تو تعلیم کا عمل بھی نامکمل رہ جاتا ہے۔ یہ تینوں اعمال بالترتیب اس طرح ہیں۔

۱۔ علم حاصل کرنا

۲۔ علم کے مطابق عمل کرنا اور

۳۔ دوسروں تک علم پہنچانا (اشاعت علم)

مندرجہ بالا تینوں اعمال ایسے ہیں جن پر تمام انبیاء کرام نے عمل کیا اور مختلف ادوار میں بنی نوع انسان کو بھی انہی تین اعمال کی ہدایت کی۔ قرآن پاک میں علم کے ساتھ ساتھ کئی اور اصطلاحات بھی استعمال کی گئی ہیں جنہیں مفسرین اور شارحین علم کی متبادل اصطلاحات تصور کرتے ہیں۔ ان اصطلاحات میں "نور" "ہدایت" اور "حکمت" جیسی اصطلاحات بکثرت ملتی ہیں۔ عام طور پر تعلیمی عمل کا تذکرہ کرتے ہوئے "کتاب و حکمت" پر زیادہ زور دیا گیا ہے بغور جائزہ لیا جائے تو جہاں عقل اور حواس خمسہ کے ذریعے سے کام لینے کی تلقین کی گئی ہے وہیں حکمت اور نور کا تذکرہ بھی کیا گیا ہے یہ دونوں اصطلاحات واضح ہو جائیں تو علم کا حقیقی مفہوم اور یہ تینوں مزلوط اعمال واضح ہو جاتے ہیں۔

انسان کے وہ تمام اعضا جو اشیا اور واقعات کے ادراک، مشاہدات اور تجربات کے سلسلے میں معاون ثابت ہوتے ہیں ان میں دیکھنے اور سننے جیسے حواس کو بنیادی حیثیت حاصل ہے کسی شے یا واقعہ کو دیکھنے اور اس سے باخبر ہونے کو علم کا نقطہ آغاز کہا جاتا ہے جس کی تکمیل عقل و حواس کے ذریعہ سے ہوتی ہے۔ ان اعضا کو جن سے یہ حواس وابستہ ہیں پہلے ہی آلات علم

سے محمد طفیل نقوش رسولؐ نمبر۔ جلد چہارم۔ ادارہ فروغ اردو۔ لاہور ۱۹۸۳ء صفحہ ۱۱۷

کا نام دیا گیا ہے وہ لوگ جو ان آلات Instruments of Education
علم سے کام نہ لیں ان کے لیے مشاہدات اور تجربات کرنے یا ان کا تجزیہ کرکے نتائج اخذ کرنے کا مرحلہ ہی رونما نہیں ہوتا۔ گویا سب سے پہلا مرحلہ ہی یہ ہے کہ اپنے گرد و پیش کی اشیا اور واقعات سے واقفیت حاصل کی جائے اس عمل کو "سوجھ بوجھ" اس کی حقیقت اور ماہیت کو سمجھنے کی جانب پہلا قدم کہا جا سکتا ہے۔ وہ لوگ جو اس طرح نہیں کرتے (اپنے اعضا اور حواس سے کام نہیں لیتے) ان کے لیے حقیقتوں کو سمجھنے کا مرحلہ ہی شروع نہیں ہوتا۔ اسلام پہلے سے طے شدہ حقائق اور واقعات کو من و عن قبول کرنے پر اصرار نہیں کرتا۔ بلکہ سب کو اس بات کا موقع فراہم کرتا ہے کہ وہ اپنی آنکھوں اور کانوں سے ان تمام چیزوں اور حقائق کو دیکھیں اور سنیں اور پھر اپنے ذہن (عقل) اور قلب (دل) سے انہیں تسلیم کریں۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلامی تعلیمات دیتے وقت علم کے بارے میں یہی انداز اختیار کیا تھا وہ لوگ جنہوں نے اپنے کان اور آنکھیں بند رکھیں ان کے قلب اور ذہن بھی بیدار نہ ہو سکے اور ایسے لوگ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک گمراہ اور جاہل قرار دیئے گئے۔

دیکھنے اور سننے کے بعد غور و فکر کرنا حصول علم کے پہلے مرحلے کا دوسرا حصہ ہے جس میں ذہن اور قلب کے مشترکہ عمل سے حقائق کو قبول کرنا اور ان کے مطابق عمل کرنا شامل ہے۔ وہ افراد جنہوں نے بے سوچے سمجھے اسلام کی تعلیمات کو قبول کرنے سے انکار کیا یا وہ لوگ جنہوں نے اپنی روایات پر غور کیے بغیر سختی سے عمل جاری رکھا ایسے لوگوں کے بارے میں کہا گیا کہ انہوں نے اپنے قلب اور ذہن کو نور کے بجائے تاریکی اور ظلمت میں رہنے دیا۔ قرآن پاک کی اس آیت سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ غور و فکر اور تدبر سے کام نہ لینا بالکل ایسے ہی ہے جیسے قلب کو مقفل کر لیا جائے۔ اس کیفیت میں انسان یقیناً سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے محروم ہو جاتا ہے۔

أَفَلَا يَتَدَبَّرُونَ الْقُرْآنَ أَمْ عَلَىٰ قُلُوبٍ أَقْفَالُهَا ﴿٢٤﴾ (محمد ۔ ۲۴) (محمد ۔ پ ۔ ۲۶)

کیا یہ لوگ غور نہیں کرتے قرآن میں یا ان کے دلوں پر قفل لگا دیئے گئے ہیں۔

مشاہدات اور تجربات کے بعد غور و فکر کے مواقع فراہم کرنا در اصل حصول علم کا سائنسی اور عقلی طریقہ ہے جسے آج کے متمدن معاشروں کے افراد بھی تسلیم کرتے ہیں۔ دنیا میں رائج مختلف عقائد کے برعکس اس سلسلہ میں اسلام کا نقطہ نظر بہت ہی حقیقت پسندانہ Realistic رہا ہے۔ اس نے حصول علم کی بنیاد ہی اس اصول پر رکھی ہے کہ پہلے انسان ظاہری طور پر اشیا اور واقعات

کو دیکھے اور سنے اس کے بعد اپنے ذہن اور قلب کی مدد سے انہیں قبول کرے اور اپنے باطن سے ان کی تصدیق اور تائید کرے۔ اس طریقہ کار کو آزادانہ طریقہ بھی کہا جا سکتا ہے جو جبر اور روایت پسندی کے برعکس آزادی اور تحقیق اور مشاہدہ پر مبنی ہے۔ قرآن کریم کی تصدیق کے لیے بھی اللہ تعالیٰ نے یہی طریقہ اختیار کیا لوگوں کے لیے دنیا میں اور خود ان لوگوں کے قلوب کے ذریعے ایسی علامتیں سامنے لائی گئیں جن سے انہوں نے اس کی حقیقت کو تسلیم کیا۔ (القرآن)

سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنفُسِهِمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ (۴۱-۵۳) (حٰمٓ - پ ۲۵)

ہم دکھائیں گے انہیں اپنی نشانیاں آفاق (عالم) میں اور ان کے اپنے نفسوں میں تاکہ ان پر واضح ہو جائے قرآن واقعی حق ہے۔

تعلیم کا یہ مرحلہ پہلے سے رائج باتوں اور واقعات کو تسلیم کرنا نہیں بلکہ اپنے طور پر حقائق کی جستجو کرنا ہے اس سلسلے میں ان تمام اعضاء اور حواس سے کام لینا ہے جو اللہ تعالیٰ نے اسی مقصد کے لیے عطا کیے ہیں۔ تعلیم کے حصول کے اس عمل کے بعد دوسرا مرحلہ شروع ہوتا ہے۔ اس مرحلے کے مطابق جو کچھ سیکھا جائے اس کا اپنی زندگی پر اطلاق کیا جاتا ہے۔ یہ عمل پہلے عمل کی تکمیل سے مشروط ہے اگر ایسا نہ ہو تو یہی تاثر لیا جاتا ہے گویا سرے سے علم حاصل نہیں کیا گیا۔ دوسرے مرحلے پر عمل کے دوران اس کے اثرات انسان کے قول اور فعل سے نمایاں ہوتے ہیں اس نے جو کچھ حاصل کیا ہے یا جن باتوں سے واقفیت حاصل کی ہے اس کے برتاؤ میں ان تمام باتوں کا عکس لازمی طور پر موجود ہوگا۔ اس کا ایک سبب تو یہ ہے کہ انسان تحقیق اور مشاہدے کے بعد جب کسی حقیقت سے باخبر ہوتا ہے تو اس سے پہلے کے اعمال اور برتاؤ سے کنارہ کر لیتا ہے۔ اگر وہ ماضی کے اعمال کو نئی معلومات کے حوالے سے ناقابل قبول (غیر حقیقی) سمجھنے لگے تو خود بھی ان سے علیحدگی اختیار کرنے لگتا ہے۔ برتاؤ میں تبدیلی کا دوسرا سبب خود فطرت انسانی ہے علم کے ذریعے جب انسان ظاہری نشانیوں اور علامتوں سے اپنے باطن (قلب) کو تبدیل کرتا ہے تو اس کے اثرات عام زندگی پر بھی پڑتے ہیں۔ ذہن اور قلب کی یہ مشترکہ کاوش فرد کو آمادہ کرتی ہے کہ وہ خود کو تبدیل کرے۔

اللہ تعالیٰ نے تمام لوگوں کے لیے جس طرح جاننا اور تحقیق کرنا لازمی قرار دیا ہے بالکل اسی طرح جو کچھ جان لیا جائے اس کے مطابق عمل کرنا بھی لازمی قرار دیا ہے۔ ایمان اور عقیدے کے سلسلے میں بھی یہی اصول کارفرما رہا ہے۔ اگر کسی چیز کو حق تسلیم کر لیا گیا ہے تو پھر اس کے

مطابق عمل کرنا ضروری ہے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی علم اور عمل کے باہمی تعلق پر زور دیا ہے حضرت ابوہریرہ سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ۔

مثل علم لا ینتفع بہ کمثل کنز لا ینفق منہ فی سبیل اللہ (احمد ۔ دارمی)

وہ علم جس سے نفع حاصل نہ کیا جائے اس خزانے کی مانند ہے جسے اللہ کی راہ میں خرچ نہ کیا جائے ۔

علم سے نفع حاصل کرنے کا مطلب ہی یہ ہے کہ اس پر عمل کیا جائے اور جو لوگ عمل نہیں کرتے وہ گویا جو کچھ جانتے ہیں اس پر کامل یقین نہیں رکھتے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تو عالم کے باعمل ہونے کو علم کی تصدیق قرار دیا تھا ۔ قرآن کریم میں علم کے لیے "نور" "حکمت" اور "ہدایت" کی جو اصطلاحات استعمال کی گئی ہیں ان میں جامعیت کے اعتبار سے حکمت کی اصطلاح علم کے بہت قریب ہی نہیں بلکہ علم کے صحیح مفہوم اور اس کی حقیقت کی وضاحت بھی کرتی ہے ۔ حکمت کی مزید تشریح کی جائے تو واضح ہو جاتا ہے کہ علم اور عمل کا چولی دامن کا ساتھ ہے ۔ اللہ تعالیٰ نے مختلف انبیا کرام کو لوگوں کو تعلیم دینے کے لیے مبعوث فرمایا تھا ۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذمے بھی یہی فریضہ تھا کہ وہ لوگوں کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دیں ۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کے ارشادات (کتاب) اور اس کے مطابق اپنی زندگی کے مختلف اعمال (حکمت) کو اختیار کرنے کی تعلیم دی ۔ قرآنی آیات

وَاذْكُرْنَ مَا يُتْلَىٰ فِي بُيُوتِكُنَّ مِنْ آيَاتِ اللَّهِ وَالْحِكْمَةِ (۳۳-۳۴) احزاب ۔ پ ۔ ۲۲)

اور یاد رکھو اللہ کی آیتوں اور حکمت کی باتوں کو جو پڑھی جاتی ہیں تمہارے گھروں میں

• وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ ۚ (۳-۱۶۴) آل عمران پ ۔ ۴ ۔)

اور پاک کرتا ہے انہیں اور سکھاتا ہے انہیں قرآن اور سنّت (کتاب اور حکمت)

کسی حد تک اس امر کی تصدیق کرتی ہیں ۔ قتادہ اور حسن بصری کی تفسیر میں آیت اللہ اور کتاب سے مراد قرآن پاک اور حکمت سے مراد سنت ہے یہ دونوں صورتیں بھی عمل کی متقاضی ہیں کیونکہ قرآن پڑھنے سمجھنے اور عمل کرنے کے لیے ہے اور اسی کے مطابق حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ تھی جو لوگوں کے لیے مثال ہے تاکہ وہ اسی کے مطابق زندگی بسر کریں ۔ دونوں میں عمل کی کیفیت موجود ہے ۔ علم اور عمل کے باہمی تعلق کی ایک واضح شہادت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد بھی ہے جس میں انہیں ایک دوسرے سے لازم و ملزوم بتایا گیا ہے اور عمل نہ کرنے کو گمراہی سے تعبیر کیا گیا ہے ۔ (حدیث)

العلم بدون العمل وبال والعمل بدون العمل ضلال (لوامع الاشراق)

علم عمل کے بغیر وبال ہے اور عمل علم کے بغیر گمراہی ہے۔ (ترجمہ)

حکمت کی اصطلاح قرآن میں بکثرت استعمال کی گئی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اور عام لوگوں کی تعلیم و تربیت کے حوالے سے یہ اصطلاح کئی مقامات پر ملتی ہے متفقہ رائے یہی ہے کہ حکمت کا مطلب اور مفہوم دراصل علم باطن یا علم فی القلب ہے۔ انسان قلب کی گہرائیوں سے کسی بات کی تصدیق کرے اور اسے مکمل طور پر قبول کرے اس کیفیت کو حکمت کہا جاتا ہے۔ یہ اسی وقت ممکن ہے جب انسان اپنے طور پر مکمل تحقیق اور تجزیئے کے ذریعے کسی بات کو اپنے وجود میں شامل کرے اور اس کے قول اور عمل میں اسی بات کو مرکزی حیثیت حاصل ہو جائے۔ سید سلیمان ندوی نے سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم جلد چہارم میں حکمت کی وضاحت اور تشریح سے متعلق کئی اکابرین کے قول درج کئے ہیں۔ امام جوہری صحاح اللغات میں فرماتے ہیں۔ الحکمۃ من العلم و الحکیم العالم و صاحب الحکمۃ انہوں نے حکمت کو علم سے تعبیر کیا ہے اور بالکل واضح الفاظ میں کہا ہے کہ حکمت علم سے ہوتی ہے اور حکیم (صاحب حکمت) عالم کو کہا جاتا ہے۔

لغت عربی کی مستند کتاب لسان العرب میں حکمت کا مفہوم اس طرح بیان کیا گیا ہے۔ والحکمۃ عبارۃ عن معرفت افضل الاشیا با افضل العلوم۔ حکمت افضل چیز کو، افضل علم کے ذریعے جاننے کو کہتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ عام اور سرسری معلومات کے برعکس فہم و دانش کی باتیں اور اعلیٰ ذہنی اور قلبی کاوشوں کے ذریعے حقائق کی تلاش کو حکمت کہتے ہیں۔

امام راغب اصفہانی نے مفردات القران میں بتایا ہے کہ والحکمۃ اصابۃ الحق باالعلم و العقل فا الحکمۃ من باللہ تعالیٰ معرفت الاشیا و ایجاد ھا علی غایۃ الاحکام و من الانسان معرفت الموجودات و فعل خیرات۔ حکمت علم اور عقل کے ذریعے حق کو پہچاننا ہے اللہ تعالیٰ کی حکمت چیزوں کو جاننا اور ان کی تخلیق ہے جو درجہ کمال کو پہنچی ہوئی ہے اور انسان کی حکمت موجودات کو جاننا اور اعمال صالحہ ہے۔

مقاتل سے حکمت کی یہ تعریف سامنے آتی ہے کہ۔ العلم و العمل بہ لا یکون الرجل حکیما حتیٰ یجمعھا۔ علم اور اس پر عمل کرنے کو حکمت کہتے ہیں۔ کوئی شخص اس وقت تک حکیم (حکمت والا) نہیں ہو سکتا جب تک عالم اور عامل نہ ہو۔

حکمت کے بارے میں مختلف ماہرین کی آرا سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ حکمت سطحی معلومات

یا کچھ یاد کر لینے اور جاننے کا نام نہیں بلکہ کسی بھی شے کی حقیقت اور اس کی اصلیت سے باخبر ہونے اور پھر اس کے مطابق عمل کرنے کو حکمت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ گویا حصول علم کے پہلے مرحلے کی تکمیل کے بعد جب دوسرے مرحلے کے مطابق عمل کیا جائے اور علم اور عمل دونوں کو باہم مربوط کر دیا جائے تب ہی حکمت اور دانائی کی حقیقی صورت سامنے آتی ہے۔

حصول علم اور اس کے مطابق عمل کے بعد تیسرا مرحلہ اشاعت علم ہے۔ اشاعت علم کا یہ عمل پہلے دو اعمال سے وابستہ ہے اور ایسا نہ کیا جائے تو پہلے دو اعمال کی تکمیل بھی نہیں ہوتی۔ اللہ تعالیٰ نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے جو پیغام عام کیا اس میں یہی خوبی رکھی گئی تھی کہ اسے تمام لوگوں کا فریضہ بنا دیا گیا۔ وہ جو کچھ جان لیں اس پر عمل کریں اور دوسروں کو بھی اس سے باخبر کریں۔ اس طرح انفرادی اور اجتماعی اعمال کے اعتبار سے اشاعت علم کو مقاصد حیات میں ایک نمایاں حیثیت سے شامل کر دیا گیا۔ انسان دوستی اور معاشرتی فلاح وبہبود کا یہ اصول کہ لوگ سچائی اور حقیقت کی جستجو کریں اس کے لیے تمام صلاحیتوں اور وسائل سے استفادہ کریں اور جب اسے پالیں تو اس پر عمل پیرا ہوں اور دوسروں کو بھی ایسا کرنے کی ترغیب دیں اسلام کی تعلیمات کا طرۂ امتیاز ہے۔ علم سے نیک اور صالح اعمال پرورش پاتے ہیں اور بنی نوع انسان ہی سب کا یہ فرض ہے کہ وہ دوسروں کو بھی ایسے اعمال کرنے کی تعلیم دیں۔ اس طرح حصول علم کی طرح اشاعت علم بھی ہر فرد کے لیے لازمی ہو جاتی ہے۔ جن لوگوں نے اسلام قبول کیا انہوں نے آنحضورؐ کے اسوہ حسنہ کو دیکھا اور خود بھی اسی انداز سے لوگوں کی رہنمائی کے لیے سرگرم عمل ہو گئے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا واضح ارشاد ہے کہ (القرآن)

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ

(آل عمران پ ۴) (۳-۱۱۰)

ہو تم بہترین امت جو ظاہر کی گئی ہے لوگوں (کی ہدایت و بھلائی) کے لیے
تم حکم دیتے ہو نیکی کا اور روکتے ہو برائی سے

علم کی بنیادیں

اسلامی تصور کے مطابق علم کا منبع اور ماخذ اللہ تعالیٰ کی ذات ہے وہی ہے جسے تمام جہانوں کا علم ہے اور وہی وہ ذریعہ ہے جس سے انبیاء کرام اور دوسرے لوگوں کو علم منتقل ہوتا ہے اللہ تعالیٰ کی تمام مخلوق کے لیے علم کی حد مقرر ہے اور لوگ وہی کچھ جان سکتے ہیں جو وہ چاہے۔ اس امر کی

تصدیق خود آیات ربانی سے ہوتی ہے (القرآن)

اِلَّا بِاِذْنِهٖ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا يُحِيْطُوْنَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖٓ اِلَّا بِمَا شَآءَ وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ (۲-۲۵۵) (البقرہ پ ۳) کون ہے جو سفارش کر سکے اس کے پاس بغیر اس کی اجازت کے جانتا ہے جو ان سے پہلے (ہو چکا) ہے اور جو ان کے بعد (ہونے والا) ہے اور وہ نہیں گھیر سکتے کسی چیز کو اس کے علم سے مگر جتنا وہ چاہے سما رکھا ہے اس کی کرسی نے آسمانوں اور زمین کو۔

اسلام کے بنیادی عقائد کے مطابق اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق (خصوصاً انسانوں) کو علم حاصل کرنے کے مختلف راستے اور طریقے تجویز کیے ہیں اس طرح لوگوں کو یہ اختیار دے دیا ہے کہ وہ اپنی صلاحیتوں کے مطابق جتنا چاہیں جان سکتے ہیں۔ اس سلسلے میں لوگوں کو جو فطری اوصاف اور خصوصیات عطا کی گئی ہیں وہ اس عمل میں ان کی معاونت کرتی ہیں کوئی ان سے کام نہ لینا چاہے تو یہ اس کی اپنی کم نظری ہی کہی جا سکتی ہے۔ گویا اللہ تعالیٰ کے بارے میں جاننا اور اللہ تعالیٰ جن علوم اور باتوں سے باخبر ہے انہیں جاننے کی کوشش کرنا انسان کے لیے شجر ممنوعہ نہیں ہے اور نہ ہی اس سلسلے میں اس پر کوئی پابندی عائد کی گئی ہے۔ اب اگر یہ طے کر لیا جائے کہ علم کی بنیاد صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے تو پھر یہ معاملہ سامنے آتا ہے کہ انسان کو علم حاصل کرنے کے لیے کن باتوں سے واقف ہونا چاہیے۔ اس سلسلے میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اصل علم تین چیزوں کا علم ہے۔

العلم ثلاثۃ ایۃ محکمۃ اوسنۃ قائمۃ اوفریضۃ عادلۃ وما کان سوی ذالک فھو فضل

آیت محکمہ سے مراد مضبوط اور غیر منسوخ آیات ہیں جبکہ سنت قائمہ سے مراد مستند احادیث ہیں اور فریضہ عادلہ اجماع امت اور قیاس کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔

علم کے تعین سے متعلق ایک اور حدیث حضرت معاویہؓ سے روایت کی گئی ہے صحیحین کی اس حدیث کے مطابق حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

من یرد اللہ بہ خیرا یفقھہ فی الدین

اللہ تعالیٰ جس سے خیر کا ارادہ فرماتا ہے اسے دین کی سمجھ عطا فرماتا ہے (ترجمہ) اس کا مطلب ہے کہ دین کے علم اور اس کی سمجھ کو خیر و برکت سے تعبیر کیا گیا ہے اور اس طرح دین کی تعلیم ہی اصل تعلیم قرار پاتی ہے۔ صحیحین کی ایک اور حدیث قرآن کی تعلیم کی تائید کرتی ہے۔

حدیث: خیرکم من تعلم القرآن وعلمہ

تم میں سے بہتر وہ آدمی ہے جس نے قرآن پڑھا اور پڑھایا (ترجمہ)

گویا یہاں بھی دینی تعلیم اور قرآن کی تعلیم کو علم کا درجہ دیا گیا ہے اور انہیں تعلیم کی بنیاد تصور کیا گیا ہے

بیشتر مفسرین اور مفکرین اس امر پر متفق ہیں کہ اسلام میں علوم کی دو مختلف اقسام ہیں اور یہ تقسیم دینی اور دنیاوی اعتبار سے کی گئی ہے۔ پہلی قسم میں قران اور سنت کی تعلیم شامل ہے جن کے بارے میں اسلام کا تصور یہ ہے کہ وہ تمام علوم کا سرچشمہ ہیں اس لیے کہ ان کا تعلق براہ راست اللہ تعالیٰ اور اس کے پیغمبر محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے۔ ان علوم کی تخلیق کسی انسانی ذہن کا کارنامہ نہیں بلکہ انہیں خود اللہ تعالیٰ نے تخلیق کیا ہے۔ ان کی آفاقیت اور ہمہ گیری کے باعث انہیں آج بھی تمام علوم میں مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ ابتدائی عہد میں اسی کو کتاب کا درجہ حاصل تھا دوسرے علوم کی تدریس یا ان کی اہمیت اپنی جگہ مسلم سہی لیکن ابتداً فرض عین صرف قرآن اور سنت ہی تھے۔

اسلام کا دینی علوم کا تصور عام مذاہب سے مختلف ہے اسلام نے دین میں اللہ تعالیٰ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی حقانیت کے ساتھ ساتھ لوگوں کی تعلیم و تربیت کے لیے ایسے بے شمار اصول بیان کئے ہیں جن سے اگر صرف دینی تعلیمات کے تحت ہی استفادہ کیا جائے تب بھی ان کے اثرات عام زندگیوں تک سرایت کر جاتے ہیں جس کی وجہ سے زندگی کے مختلف شعبوں میں تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں تعلیم کے مختلف مراحل کا جائزہ لینے سے یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ اسلام کی دینی تعلیمات کا پروگرام بھی دراصل انسانی زندگیوں کو زیادہ سہل اور خوشگوار بنانے کا عمل سرانجام دیتا ہے بلکہ اس سے دوہرا فائدہ ہوتا ہے ایک جانب تو دنیا میں اطمینان اور سکون میسر ہوتا ہے دوسری جانب آخرت اور احتساب کے مراحل میں بھی رہنمائی ہوتی ہے، یہ اس پروگرام کی جامعیت کی ایک دلیل ہے۔ قرآن اور اس کی عملی تفسیر (سنت) ہر اعتبار سے مکمل اور ہمہ گیر ہیں قرآن کی ہمہ گیری کے بارے میں تو ارشاد خداوندی بھی موجود ہے کہ (القرآن)

مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتٰبِ مِنْ شَيْءٍ (۶-۳۸) انعام۔ پ۔۷)

نہیں نظر انداز کیا ہم نے کتاب میں سے کسی چیز کو

گویا کوئی ایسی شے باقی نہیں رہی جو دنیا میں موجود ہو اور جس کا قرآن میں تذکرہ نہ کیا گیا ہو۔

اسلام کی دینی تعلیم غور و فکر اور تدبر کی نفی نہیں کرتی بلکہ اسلام تو لوگوں کو اپنے گرد و پیش

کا جائزہ لینے اور تمام اشیاء اور موجودات کی حقیقت سے باخبر ہونے کی دعوت دیتا ہے۔ جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے اس طرح حصول علم کے عمل کو زیادہ سے زیادہ جامع اور مکمل بنایا جاتا ہے تاکہ اس کے اثرات دیرپا اور مستحکم ہوں۔ جہاں تک دنیاوی علوم کا تعلق ہے اسلام ان سے قطعی اختلاف نہیں کرتا بلکہ کئی بار تو اللہ تعالیٰ کے بارے میں بھی ان علامتوں اور نشانیوں کا تذکرہ کیا گیا ہے جو کائنات میں موجود ہیں (واضح رہے کہ یہ سارے موجودات جنہیں ہم دنیاوی اور مادی وجود کی حیثیت سے تسلیم کرتے ہیں اللہ تعالیٰ ہی کی تخلیق ہیں) دنیا میں موجود یہ تمام اشیاء بالواسطہ طور پر اللہ تعالیٰ کو سمجھنے اور اس کی حیثیت سے باخبر ہونے میں مدد دیتی ہیں۔ (القرآن)

اَفَلَا یَنْظُرُوْنَ اِلَی الْاِبِلِ کَیْفَ خُلِقَتْ ۝ وَاِلَی السَّمَآءِ کَیْفَ رُفِعَتْ ۝ وَاِلَی الْجِبَالِ کَیْفَ نُصِبَتْ ۝ وَاِلَی الْاَرْضِ کَیْفَ سُطِحَتْ ۝ (۸۸ - ۱۷/۲۰) (الغاشیہ - پ - ۳۰)

کیا یہ لوگ (غور سے) اونٹ کو نہیں دیکھتے کہ اُسے کیسے (عجیب طرح) پیدا کیا گیا ہے اور آسمان کی طرف نہیں دیکھتے اُسے کیسے بلند کیا گیا ہے اور پہاڑوں کی طرف کہ انہیں کیسے نصب کیا گیا ہے اور زمین کی طرف کہ کیسے اُسے بچھایا گیا ہے۔

کائنات کی ان تمام اشیاء کو مظاہر قدرت سمجھا جاتا ہے۔ ان سب کا جائزہ لینے اور ان کی تشکیل اور تغیرات کو دیکھ کر انسان ان کے خالق کا قائل ہو جاتا ہے۔ زمینوں اور آسمانوں کا تذکرہ اور پھر ان میں پوشیدہ اور ظاہر تمام اشیاء کی علامتوں کے جائزوں اور غور و فکر کی دعوت دینے کا مقصد ہی یہی ہے کہ لوگ ان مظاہر قدرت کا مطالعہ کریں اور اس کے بعد اپنی زندگیوں میں اللہ تعالیٰ کی کارفرمائی کا اندازہ کریں۔ اللہ تعالیٰ نے اس ضمن میں خود لوگوں کی مدد کی بلکہ انہیں باطنی اور خارجی ہر دو اعتبار سے مشاہدہ اور تجربہ کرنے کے لیے اعضا اور جبلتوں کے ساتھ ساتھ مظاہر قدرت بھی عطا کیے (القرآن)

وَسَخَّرَ لَکُمْ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا مِّنْهُ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَفَکَّرُوْنَ ۝

(الجاثیہ - پ ۲۵) (۴۵: ۱۳)

اور اس نے مسخر کر دیا ہے تمہارے لیے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے سب کا سب اپنے حکم سے بے شک اس نظام میں نشانیاں ہے ان لوگوں کے لیے جو غور و فکر کرتے ہیں۔

آسمانوں اور زمینوں میں پوشیدہ اسرار، سیارے، معدنیات، زیر آب وسائل، موسم، فصلیں برسات یہ سب انسانوں کے لیے بنائے گئے ہیں۔ اور لوگوں سے کہا گیا ہے کہ وہ ان چیزوں کو دیکھیں اور ان کے بارے میں تحقیق کریں۔ (القرآن)

قُلِ انْظُرُوْا مَاذَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (سورہ یونس ۱۰-۱۰۱، پ ۱۱)

فرمائیے غور سے دیکھو کیا کیا (عجائبات) ہیں آسمانوں اور زمین میں

کائنات کی ان تمام اشیا اور موجودات کے دیکھنے کی دعوت ایک جانب تو لوگوں کے تجربات اور ان کی معلومات میں اضافے کا سبب بنتی ہے دوسری جانب ان کے ذریعے وہ اللہ تعالیٰ کو صحیح طور پر پہچان سکتے ہیں۔ اس کی حیثیت اور کائنات کی تمام اشیا اور اجسام پر اس کی فوقیت اور برتری کو تسلیم کر سکتے ہیں۔ یہ تمام مظاہر دراصل اللہ تعالیٰ کی قدرت کی نشانیاں ہیں جن میں انسان کی سماعت اور بصارت دونوں ہی مصروف عمل ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس ضمن میں خود بھی لوگوں کی مدد فرماتے ہیں (القرآن)

وَسَخَّرَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُوْمُ مُسَخَّرٰتٌ بِاَمْرِهٖ (۱۶-۱۲) (النحل-پ ۱۴)

اور اللہ تعالیٰ نے مسخر فرما دیئے تمہارے لیے رات دن، سورج اور چاند کو اور
تمام ستارے بھی اس کے حکم کے پابند ہیں۔

یہ سب کچھ اسی لیے کیا گیا کہ لوگ کرہ ارض کا مشاہدہ کریں اور ایک ایک شے اور ایک ایک واقعے سے سبق حاصل کریں تاکہ ان کے قلوب پر نئے حقائق آشکار ہو جائیں۔ (القرآن)

اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَتَكُوْنَ لَهُمْ قُلُوْبٌ يَّعْقِلُوْنَ بِهَآ اَوْ اٰذَانٌ يَّسْمَعُوْنَ بِهَا

کیا انہوں نے سیر و سیاحت نہیں کی زمین میں تاکہ (ان کھنڈرات کو دیکھ کر) ان کے دل ایسے ہو جاتے جن سے وہ (حق کو) سمجھ سکتے اور کان ایسے ہو جاتے جن سے نصیحت سن سکتے۔

اللہ تعالیٰ نے اسلامی تعلیمات ہی میں ان تمام باتوں کو شامل کر دیا ہے جنہیں بعض لوگ "دنیاوی" کہتے ہیں۔ یہ سب کچھ اسی لیے کیا گیا کہ لوگوں کو عقل اور شعور کے ذریعے حقیقت کو سمجھنے اور پھر اس کے مطابق عمل کرنے کے مواقع فراہم کیے جائیں۔ اللہ تعالیٰ تمام علوم کا مرکز ہے اور چونکہ دنیا کی ہر شے اسی کی تخلیق ہے اس لیے کوئی شے اس سے الگ ہو کر اپنا وجود باقی نہیں رکھ سکتی۔ ہر شے میں اس کی نشانیاں موجود ہیں۔ بظاہر اللہ تعالیٰ کو دیکھا نہیں جا سکتا اس لیے کہ وہ مادی وجود نہیں رکھتا لیکن غور طلب بات یہ ہے کہ کائنات کی تمام مادی اور غیر مادی اشیا اور اجسام میں اس کی قدرت کی علامتیں نمایاں ہیں۔ انہی علامتوں اور نشانیوں سے اسے شناخت کیا جا سکتا ہے۔ (القرآن)

وَكَاَيِّنْ مِّنْ اٰيَةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ يَمُرُّوْنَ عَلَيْهَا وَهُمْ عَنْهَا مُعْرِضُوْنَ ۝ (پ-۸) (انعام ۶-۱۶۳)

اور کتنی ہی (بیشمار) نشانیاں ہیں جو آسمانوں اور زمین (کے ہر گوشے) میں (سجی ہوئی) ہیں جن پر یہ (ہر صبح و شام) گذرتے ہیں اور وہ ان سے روگردانی کیسے ہوتے ہیں (ذرا توجہ نہیں کرتے)

اسلام کی دینی تعلیم کے تصور میں دنیا کا رنگ موجود ہے جس طرح اسلام دین۔۔ اور دنیا کو الگ الگ

تصور نہیں کرتا بالکل اسی طرح تعلیم میں بھی (علامتی تفریق کے باوجود جو بہت سے اذہان میں موجود ہے) اسلام انہیں الگ نہیں کرتا اسلام کی دینی تعلیم کا بیشتر حصہ دنیاوی امور ہی سے متعلق ہے اور اگر ان دنیاوی امور کو اسلامی اصولوں کے مطابق بہتر بنا لیا جائے تو اسلام کے دینی تقاضے بھی پورے ہو جاتے ہیں۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی حیات طیبہ میں لوگوں کو ان دنیاوی امور کی تعلیم بھی دی تھی بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کی اس ہمہ گیری پر اس دور کے کفار بیحد متعجب ہوتے تھے حقیقت بھی یہ ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس دور کی انسانی زندگی میں رونما ہونے والا کوئی واقعہ یا موضوع ایسا نہیں چھوڑا جس کے بارے میں لوگوں کو تعلیم نہ دی ہو۔ بعض مشرکین تو انتہائی چھوٹے چھوٹے دنیاوی معاملات کے بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کا مذاق اڑایا کرتے تھے۔ ایک بار انہی مشرکین نے حضرت سلمان فارسیؓ سے کہا کہ تمہارے پیغمبر تم کو ہر چیز کی تعلیم دیتے ہیں یہاں تک کہ اس کی بھی کہ تم کو کس طرح قضائے حاجت کرنی چاہیے حضرت سلمان فارسیؓ نے کہا کہ ہاں یہ سچ ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو حکم دیا ہے کہ ہم ایسی حالت میں قبلہ رخ نہ بیٹھیں نہ اپنے دائیں ہاتھ سے طہارت کریں اور نہ ہی تین ڈھیلوں سے کم استعمال کریں جن میں کوئی ہڈی اور گوبر نہ ہو۔[1] (بحوالہ جامع ترمذی وسنن ابن ماجہ کتاب الطہارت)

اسلام میں دینی تعلیم کی ہمہ گیری کا یہ عالم تھا کہ دینی اور دنیاوی تعلیم اور موضوعات کی الگ الگ نشاندہی کرنا ہی مشکل ہو جاتا ہے۔ اسلام کی تعلیمات کا سارا زور عمل پر رہا ہے اس لئے علم کو عمل سے الگ کرنا ممکن ہی نہیں ہے۔ عمل کا تعلق چونکہ زندگی سے ہے اس لیے اسلام میں علم کا تعلق بھی زندگی اور دنیا کے مسائل اور معاملات سے رہا ہے جس میں صرف یہی دنیا نہیں بلکہ اس کے بعد والی دنیا کی تعلیم بھی موجود تھی۔ موجودہ عہد کے بعض مسلمان مورخین تو اسلام کی اس ہمہ گیریت کو سیکولر سے تعبیر کرتے ہیں۔[2]

> Islam does not distinguish between the religion and the prefane - There being no ecclesia, its counterpart the saeculum became redundant - In a sense Islam is a secular religion because it has no church.

---

[1] سید سلیمان ندوی، سیرۃ النبی، جلد چہارم قرآن لمیٹڈ۔ لاہور۔ ۱۳۹۵ھ ص ۳۹۵

[2] Dr. I.H. Rureshi : Ulema in Politics : Marref Limited Second Edition - Karachi - 1974 -- P - 3

جدید علمی اصطلاحات کے مطابق علم مادی اور غیر مادی ہر دو قسم کے امور کا احاطہ کرتا ہے۔ یہ کہنا کسی طرح درست نہیں کہ روحانیت کی تمام منازل طے کرنا ہی علم ہے یا روحانیت اور اخلاقیات سے قطع نظر صرف مادی معاملات کو سمجھنا اور ان کے لیے تگ و دو کرنا ہی علم ہے اسلام میں علم کا تصور بالکل واضح ہے اس کا محور و مرکز ذات خداوندی ہے جس نے اپنا پسندیدہ دین اس لیے عام لوگوں تک بھیجا تاکہ لوگ راہ نجات اختیار کر سکیں لوگوں کو دیکھنے سننے اور بولنے کے لیے مختلف اعضاء دیئے گئے انہیں غور و فکر کی صلاحیت عطا کی گئی تاکہ وہ کائنات میں موجود اللہ تعالیٰ کی نشانیوں سے اپنے ظاہر اور باطن کی اصلاح کر سکیں، زندگی کے تمام شعبوں کے مختلف اعمال اسی انداز سے ترتیب دینے کی صلاحیت کو علم کا درجہ دیا گیا ہے اسلام کا تصور علم پوری زندگی کا احاطہ کرتا ہے غور و فکر اور تدبر کی ترغیبات اسے حالات و واقعات سے موجودات اور امکانات تک وسعت دیتی ہیں۔ اس میں دین اور دنیا کا الگ الگ تصور رائج نہیں ہے بلکہ دونوں کو زندگی کا جزو لاینفک تصور کرتے ہوئے ان سے مکمل واقفیت اور ان پر دسترس حاصل کرنا ہی علم سمجھا جاتا ہے۔

تعلیم کے مقاصد

تعلیم سے متعلق اب یہ اختلاف باقی نہیں رہا کہ اس سے مقاصد وابستہ کیے جائیں یا اسے صرف اور صرف مقدس اور بابرکت سرگرمی تصور کرتے ہوئے اس کے حصول کی کوششیں جاری رکھی جائیں۔ تعلیم دراصل انسانی افعال ہی کا ایک حصہ ہے اور چونکہ تمام افعال کسی نہ کسی مقصد کے تحت سرانجام دیئے جاتے ہیں اس لئے تعلیم بھی ایک بامقصد عمل اور سرگرمی کی حیثیت رکھتی ہے۔ اسلام نے بھی اسی اصول کے تحت تعلیم میں مقصدیت کی اہمیت کو اجاگر کیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بھی علم سے فائدہ اٹھانے کی ترغیب دی۔ حضرت ابوہریرہؓ سے ایک روایت کے مطابق حضور اکرم نے فرمایا کہ اس علم کی مثال جس سے نفع نہ اٹھایا جائے اس خزانے کی مانند ہے جس میں سے خدا کی راہ میں کچھ خرچ نہ کیا جائے (احمد دارمی) ایک اور حدیث کے مطابق آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے علم سے واضح اختلاف فرمایا جو غیر نافع ہو

حدیث ۔ اعوذ باللہ من علم لاینفع (سیوطی)

میں اللہ کی طرف سے پناہ مانگتا ہوں ایسے علم سے جو غیر نافع ہو۔ (ترجمہ)

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کے مطابق علم سے نفع حاصل کرنا چاہیے گویا علم جیسی سرگرمی کو بامقصد سرگرمی ہونا چاہیے اس حدیث مبارکہ کے مطابق نفع کا مفہوم مالی اور اقتصادی نفع نہیں ہے بلکہ اس سے مراد افعال میں مقصدیت اور منفعت ہے۔ اس کا تعین بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خود ہی فرمایا تھا اور اس طرح تعلیم کے اغراض و مقاصد متعین کرنے میں واضح رہنمائی حاصل ہوتی ہے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات اور اللہ تعالیٰ کے احکامات کی روشنی میں مندرجہ ذیل مقاصد کی نشاندہی ہوتی ہے جنہیں تعلیم کے عمومی مقاصد میں بنیادی حیثیت حاصل ہے ۔

اللہ کی اطاعت

تعلیم کا سب سے اولین مقصد اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہے ۔ اس مقصد کی تصدیق حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث مبارکہ سے ہوتی ہے جس میں آپ نے اللہ کی رضا کا تذکرہ کیا ہے ۔

من تعلم علما مما یبتغی به وجه الله لا یتعلمه الا لیصیب به عرضا من الدنیا لم یجد عرف الجنة یوم القیامة یعنی ریحها

جس نے اللہ کی رضا جوئی کے سوا علم کو دنیا کی کسی غرض سے سیکھا اس کو قیامت میں جنت کی بو بھی نصیب نہ ہوگی ۔ (ترجمہ)

جس طرح اللہ تعالیٰ تمام علوم کا سرچشمہ ہیں اسی طرح تعلیم کے تمام مقاصد میں اولین حیثیت اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی کو حاصل ہے ۔ اس مقصد کے علاوہ کسی اور غرض سے علم حاصل کیا جائے تو ایسا کرنے والوں کے لیے سزا کا اعلان کیا گیا ہے ۔ یہ مقصد تعلیم دراصل انسان کے مقصد حیات سے وابستہ ہے ۔ اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور اس کی رضا کے مطابق کام کرنے کا طریقہ کار کیا ہے اس کا تعین بھی اللہ تعالیٰ نے بہت ہی واضح الفاظ میں کر دیا ہے قرآن میں انسان کی تخلیق اور اس کی زندگی کے تمام امور کا تذکرہ کیا گیا ہے ۔ صاف صاف بتا دیا گیا ہے کہ انسان کے روز و شب نشست و برخاست غرض تمام سرگرمیاں صرف اور صرف اللہ کے لیے ہونی چاہئیں (القرآن)

قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَ نُسُکِیْ وَ مَحْیَایَ وَ مَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ (پ ۸) (انعام : ۱۶۳)

آپ فرما دیجئے بیشک میری نماز اور میری قربانیاں اور میرا جینا اور میرا مرنا سب اللہ کے لیے ہے جو رب ہے سارے

جب زندگی کی روزمرہ سرگرمیوں کا محور و مرکز اللہ تعالیٰ کی ذات ہے اور انسان کے لیے یہ لازمی ہے
کہ وہ ساری سرگرمیاں اسی نقطہ نظر سے سرانجام دے کہ جیسے اللہ تعالیٰ نہ صرف اسے دیکھ رہا ہے بلکہ
اس کے تمام اعمال اور نیتوں سے باخبر ہے تو یقیناً وہ جو کچھ کرے وہ سب اللہ ہی کے لیے ہونا چاہیے
اس اصول کے مطابق تعلیمی عمل میں بھی خود بخود اللہ تعالیٰ کی اطاعت لازمی ہو جاتی ہے احادیث میں
بھی اللہ کی رضا کے لیے علم حاصل کرنے کی اہمیت بیان کی گئی ہے اس لیے کہ اسلام نے تعلیم اور
زندگی دونوں کے مقاصد میں یکسانیت کو فروغ دیا ہے۔ قرآن کریم کے مطابق زندگی کا جو مقصد بیان
کیا گیا ہے وہی مقصد حصول علم سے بھی وابستہ ہو جاتا ہے۔ اس طرح زندگی اور تعلیم
میں باہمی ربط اور تعلق اور مستحکم ہو جاتا ہے۔ Life and Education

اسلام میں تعلیم کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی حاصل کرنے کا جو مقصد وابستہ
ہے وہ دراصل مقصد حیات بھی ہے جس سے کئی اور مقاصد سامنے آتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی
حاصل کرنے کا کیا طریقہ ہے اور اس کے مطابق عمل کرنے کے لیے کن اوصاف اور صلاحیتوں کی ضرورت
ہوگی یہ تمام اعمال براہ راست یا بالواسطہ تعلیم کے مقاصد میں شامل ہیں گویا اسلامی عقائد کے
مطابق زندگی کی تمام سرگرمیاں اللہ تعالیٰ کے بتائے ہوئے اصولوں کے مطابق گزارنا تعلیم کا
اہم مقصد ہے۔ اسلام نے اپنی جامع اور ہمہ گیر تعلیمات کے ذریعے حقوق اور فرائض کا ایسا نظام
مرتب کر دیا ہے جس میں عام انسانوں پر جتنے فرائض عائد ہوتے ہیں انہیں اتنے ہی حقوق اور مراعات
بھی حاصل ہیں۔ ان تمام کو احسن طریقے پر سرانجام دینا دراصل اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنے
کا عمل ہے۔ گویا اسلام کے بنیادی عقائد اور ارکان کی ادائیگی کے ساتھ ساتھ حقوق اور فرائض
کے اس نظام کے مطابق عمل کرنا تعلیم کے بنیادی مقاصد میں شامل ہے۔

مخلوق کی خدمت

انسان کی تخلیق کے عمل سے جہاں اللہ تعالیٰ کی صناعی اور قدرت کا اندازہ ہوتا ہے وہیں
اس امر کی نشاندہی بھی ہوتی ہے کہ انسان کو زمین پر اللہ تعالیٰ نے اپنا نائب مقرر کیا ہے۔ (القرآن)

وَهُوَ الَّذِي جَعَلَكُمْ خَلَائِفَ الْأَرْضِ وَرَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجَاتٍ لِيَبْلُوَكُمْ فِي مَا آتَاكُمْ (الانعام ۶ - ۱۶۵، پ - ۸)

اور وہی جس نے بنایا تمہیں (اپنا) خلیفہ زمین میں اور بلند کیا تم میں سے بعض کو بعض پر درجوں میں تاکہ آزمائے
تمہیں اس چیز میں جو اس نے تمہیں عطا فرمائی ہے۔

انسانوں کو دنیا میں اپنا نائب بنا کر اللہ تعالیٰ نے انہیں دوسری مخلوق پر فضیلت عطا کی ہے لیکن اسی مناسبت سے انسان کی ذمہ داریاں بھی دوسرے سے زیادہ ہو گئی ہیں۔ انسان پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کے ساتھ ساتھ دوسری مخلوق کے کام بھی آئے۔ اسی فریضے کے حوالے سے اسے بہترین امت قرار دیا گیا ہے (القرآن)

كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ (آل عمران پ ۴)

ہو تم بہترین امت جو ظاہر کی گئی ہے لوگوں (کی ہدایت و بھلائی) کے لیے (۳ - ۱۱۰)
تم حکم دیتے ہو نیکی کا اور روکتے ہو برائی سے۔

برے کاموں سے روکنے اور نیک کاموں پر آمادہ کرنے کے لیے انسان کو دوسرے انسانوں کے سلسلے میں جو اختیار دیا گیا ہے وہ انسان کا اپنا عمل ہے ایمان کے حوالے سے یہی عمل عمل صالحہ Right doing تصور کیا جاتا ہے۔ اور یہی وہ ذریعہ ہے جس سے انسان دوسرے کو نیکی کی طرف آمادہ کر سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ خود انسانوں سے بھلائی کرتا ہے اس لیے اس کے نائبین (انسانوں) کا بھی یہ فرض ہے کہ وہ اپنے خالق کی اطاعت میں انسانوں سے بھلائی کریں۔ آنحضورؐ نے اس سلسلے میں واضح طور پر ارشاد فرمایا ہے کہ۔

الخلق اعیال اللہ فاحب الخلق الی اللہ من احسن الی عیالہ (بیہقی)

ساری مخلوق اعیال اللہ ہے اور اللہ اس سے محبت کرتا ہے جو اللہ کی مخلوق سے سب سے زیادہ بھلائی کرتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی مخلوق سے بھلائی بھی انسانوں کے مقصد زندگی میں شامل ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے دوسروں کو نیکی کی طرف لانے اور برائی سے روکنے والوں کو بہترین قرار دیا ہے۔ ان حوالوں سے اللہ تعالیٰ کی رضا اور مخلوق خدا سے بھلائی دو اہم مقاصد سامنے آتے ہیں جو درحقیقت مسلمانوں کے مقاصد حیات بھی ہیں۔ زندگی کے باقی تمام اعمال انہی دو مرکزی اعمال کے تابع ہوں تو دین اور دنیا دونوں میں علم سے نفع حاصل کرنے کا معاملہ بھی واضح ہو جاتا ہے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں اعمال کو یکجا بھی کر دیا ہے (حدیث)

التعظیم لامر اللہ والشفقۃ علی عیال اللہ (بیہقی)

اللہ کے احکام کی تعظیم کرو اور اللہ کی مخلوق سے محبت رکھو (ترجمہ)

مخلوق کی خدمت ایک ایسی جامع اصطلاح ہے جس میں کئی ایسی سرگرمیاں شامل ہیں جن سے

انسانوں کی فلاح وبہبود کی نئی راہیں متعین ہوتی ہیں اسلام ایسی تمام سرگرمیوں کی تائید کرتا ہے جو اللہ کی اطاعت کے بنیادی اصول کے تحت تمام انسانوں کی بھلائی کے لیے سرانجام دی جائیں انہی سے وہ اہم مقاصد تعلیم سامنے آتے ہیں جو مسلمانوں کے نظام تعلیم وتربیت کی نمایاں خصوصیت تھے

٭٭٭

باب ۲

دورِ جاہلیت کی تعلیم

دورِ جاہلیت کا تصور

حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت عین موسم بہار میں بارہ ربیع الاول یکم عام الفیل (اپریل ۵۷۱ء) کو ہوئی۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کا ابتدائی دور بھی اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور اس کے بنائے ہوئے اصولوں کے مطابق انسانوں کی تعلیم و تربیت کے لیے ایک مثال تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا بچپن۔ لڑکپن اور جوانی سب ہی اس انداز پر بسر کئے۔ آپؐ نے نبوت کا باقاعدہ اعلان اپنی عمر کے چالیسویں سال میں کیا اور پہلی بار علانیہ دعوت اسلام ۶۱۰ء یا ۶۱۱ء میں عام لوگوں تک پہنچائی۔ اس طرح ساتویں صدی عیسوی کے آغاز ہی سے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انسانوں کی تعلیم و تربیت کا سلسلہ شروع کیا۔ یہیں سے وہ عہد شروع ہوتا ہے جسے انسانی تاریخ کے انقلابات کا نقطہ عروج بھی کہا جاتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے پوری دنیا خصوصاً عرب میں جہالت اپنے عروج پر تھی۔ ایسے ایسے واقعات عام ہو چکے تھے جنہیں آج بھی ہر معاشرہ اپنی پیشانی پر بدنما داغ تصور کرتا ہے۔ اخلاقی پستی اور ظلم و زیادتی کے اس دور میں گھناؤنے جرائم پر بھی احساس ندامت کے بجائے فخر کا اظہار کیا جاتا تھا۔ انفرادی اور اجتماعی اعتبار سے پورے عرب میں بدکاریوں اور برائیوں کو علانیہ فروغ دیا جا رہا تھا۔ منشیات زنا، جوا، جھوٹ اور لوٹ کھسوٹ نے عام لوگوں کی زندگی اجیرن کر رکھی تھی اور معاشرہ میں کمزوروں کا کوئی پرسان حال نہیں تھا۔ حق و صداقت اور دیانتداری جیسے اوصاف کا دور دور تک نشان نہیں تھا مجموعی طور پر صورت حال اس درجہ ابتر تھی کہ انسانیت تباہی کے دہانے پر پہنچ گئی تھی اور اسے یقینی تباہی سے نجات دلانے کے لیے کسی محسن انسانیت کا ورود لازمی ہو گیا تھا۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت اور پھر اعلان نبوت سے پہلے کا دور یقیناً ظلم و زیادتی

اور بداخلاقی اور بدقماشی کے اعتبار سے دنیا کا بدترین دور تھا۔ اسی لیے اسے دورِ جاہلیت یا دورِ ظلمت Dark age کا نام دیا جاتا ہے۔ دورِ جاہلیت کے دورانیہ کا ماہ و سال کے اعتبار سے تعین تو نہیں کیا جا سکتا البتہ یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ طلوعِ اسلام سے قبل کا یہ دور کئی صدیوں پر محیط تھا اور اس کا اختتام اس وقت ہوا جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس دنیا میں تشریف لے آئے۔

عربوں کی تاریخ کا بغور مطالعہ کیا جائے اور ان کی معاشرت کو سمجھنے کی کوشش کی جائے تو یہ عجیب بات سامنے آتی ہے کہ جہالت اور ظلمت کے اس طویل دور میں بھی عربوں کو اپنی انفرادی اور اجتماعی خصوصیات کا خیال رہتا تھا۔ وہ اپنی نسل۔ زبان اور قوم کے حوالے سے خود کو دوسروں سے برتر تصور کرتے تھے اور یہی وجہ ہے کہ دوسری قومیں (غیر عرب) ان کے خیال میں عجمی تھیں۔ زبان اور اس کی فصاحت و بلاغت اور پھر جسمانی صحت اور تنومندی نے عربوں کو دورِ جاہلیت میں بھی کچھ ایسے مواقع فراہم کر دیئے تھے کہ وہ اپنی تمام برائیوں کے باوجود بہت سے اوصاف میں دوسروں سے ممتاز حیثیت رکھتے تھے ظہورِ اسلام سے پہلے کے عرب میں تعلیم و تدریس کا جائزہ لیا جائے تو کوئی محقق بھی اس دور میں تعلیمی اداروں کی موجودگی یا غیر موجودگی کے بارے میں واضح معلومات فراہم نہیں کرتا اگر تعلیمی اداروں کے وجود کے حوالے مل بھی جائیں تب بھی ان تعلیمی اور تبلیغی اداروں کی شکل و صورت واضح ہو کر سامنے نہیں آتی دورِ جاہلیت کے لوگوں میں علم و ادب سے لگاؤ اور اس شعبے میں مہارت کی نفی کرنا بھی ممکن نہیں ہے۔ اس کی ایک واضح مثال تو اس دور کا بازارِ عکاظ ہے جس کی علمی اور ادبی حیثیت کی وجہ سے اسے بین العرب مجلس Pan-Arab literary Congress کا نام دیا جاتا ہے، عکاظ مدینے سے کئی میل کے فاصلے پر ایک ایسا مقام تھا جہاں ہر سال میلہ لگا کرتا تھا۔ اس عہد کی روایت کے مطابق اس میلے کو ایک معاشرتی اجتماع کی حیثیت حاصل تھی۔ اس میلے میں عرب کے دور دراز علاقوں سے لوگ شریک ہوتے تھے اور کھیل کود اور جوانمردی کے مظاہروں کے ساتھ ساتھ ادبی تقریبات بھی منعقد ہوتی تھیں ان ادبی مجالس میں شعر و شاعری سرِفہرست تھی۔ اس میلے کے بارے میں مشہور ہے کہ یہاں پڑھے جانے والے اہم قصائد کو سونے کے پانی سے لکھ کر خانہ کعبہ (جسے اس دور میں بتوں کا مسکن بنا دیا گیا تھا) میں آویزاں کر دیا جاتا تھا ظہورِ اسلام سے پہلے بھی لوگ خانہ کعبہ کا احترام کرتے تھے اس لیے کہ وہاں ان کے وہ بت رکھے ہوئے تھے جن کی وہ پرستش کرتے تھے۔ ایسی قابلِ احترام اور نمایاں جگہ پر قصائد آویزاں کرنے کا مطلب یقیناً یہ بھی رہا

ہوگا کہ دوسرے لوگ انہیں پڑھ سکیں یعنی اس دور میں کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو لکھنے کی صلاحیت رکھتے تھے اور یقیناً جو کچھ لکھا جاتا تھا اسے پڑھنے کی صلاحیت رکھنے والے بھی موجود تھے۔ انہی لوگوں کی وجہ سے قصائد تحریر کرنے اور انہیں آویزاں کرنے کا سلسلہ رائج رہا۔ یہاں آویزاں ہونے والے سات قصائد سبع المعلقات کے نام سے مشہور ہوئے[1]

دور جاہلیت کے عرب شعراء کے ان مشہور زمانہ قصائد کے بارے میں یہ روایت بھی مشہور ہے کہ یہ لوگوں کے حافظے میں محفوظ ہو گئے تھے۔ اس عہد کی شاعری اس حد تک مستند اور معروف ہے کہ اسے آج بھی عربی ادب میں اہم مقام حاصل ہے عربوں کے اس عظیم ادبی ذوق اور بین العرب ادبی مجالس کے انعقاد کا یہ مطلب نہیں لیا جاسکتا کہ اس دور میں تعلیمی ادارے موجود تھے اور عربوں کو درس و تدریس کی سہولتیں حاصل تھیں۔ ان کے اس ادبی سرمائے کا تعلق ان کی زبان کی فصاحت و بلاغت اور خود ان کی خصوصیات کی نشاندہی سے تو ہے لیکن اس سے ان کی تعلیمی حیثیت اور مرتبے کا تعین نہیں ہوتا۔ درس و تدریس کے حوالے سے دیکھا جائے تو عرب تعلیم سے نابلد تھے اور ان میں پڑھنے لکھنے کی صلاحیتیں نہ ہونے کے برابر تھیں ظہور اسلام کے ابتدائی دور میں عام لوگوں کی تعلیمی حالت تو اس درجہ ناگفتہ بہ تھی کہ دور دور تک ایسے لوگ نہیں ملتے تھے جو پڑھنا جانتے ہوں۔ سنہ ۶ھ میں الحاء کے مقام پر ایسی ہی کیفیت رونما ہوئی اور ایک بچے کے علاوہ کوئی بالغ فرد ایسا نہیں تھا جو پڑھنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ خود آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تبلیغ اسلام کیلئے جو خطوط روانہ کیے تھے اس آبادی میں اسے پڑھنے والا کوئی بھی نہیں تھا[2] عرب کے بعض علاقوں میں البتہ چند افراد پڑھنے لکھنے کی صلاحیت رکھتے تھے یہی سبب ہے کہ حضور پُرنور صلی اللہ علیہ وسلم نے تبلیغ کے لیے تحریر کا ذریعہ بھی اختیار کیا اور خطوط کے ذریعے لوگوں کو اپنے پروگرام سے آگاہ کیا۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ خطوط مختلف سلطنتوں کے حکمرانوں کو روانہ کیے تھے اور بیشتر خطوط اسی دور کے لوگوں نے پڑھ کر آپ کا نقطہ نظر لوگوں تک پہنچایا تھا۔ عربوں میں لکھنے کی صلاحیت کا ایک اور ثبوت مسلمانوں کے سوشل بائیکاٹ والے معاہدے سے ملتا ہے۔ اہل مکہ نے جب آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا معاشی

1۔ حبیب الرحمٰن شیروانی: علمائے سلف و نابینا علماء (تعلیقات و حواشی) انتظام اللہ شہابی) اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ طبع اول۔ کراچی سنہ ۱۹۶۱ء

2۔ ایضاً، صفحہ۔ ۱۸

مقاطعہ کیا تھا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو مع خاندان اور احباب شعب ابی طالب میں محصور ہونا پڑا تھا تب بھی اسے ایک تحریری معاہدہ کی شکل دی تھی جو ان پہاڑیوں کے دامن میں آویزاں کر دیا گیا تھا۔ ان تمام باتوں سے اس امر کی تصدیق ہوتی ہے کہ دورِ جاہلیت میں گو درس و تدریس کے شواہد نہیں ملتے پھر بھی چند ایسے افراد کا وجود ضرور ملتا ہے جو شعر و شاعری کے ساتھ ساتھ لکھنے پڑھنے کی صلاحیت بھی رکھتے تھے۔ ان لوگوں نے یہ صلاحیت اور مہارت وہیں کے کسی ادارے یا افراد سے حاصل کی تھی یا بیرون عرب کے لوگوں سے استفادہ کیا ہوگا۔ ان دونوں میں سے کوئی بھی بات درست ہو یہ بات تو پایہ ثبوت تک پہنچ جاتی ہے کہ ان میں چند افراد ایسے بھی تھے جو تمام تر اخلاقی اور معاشرتی برائیوں کے باوجود ادب اور شاعری کے ساتھ ساتھ لکھنے پڑھنے کی صلاحیت بھی رکھتے تھے۔

یہودیوں اور نصرانیوں کے ادارے

دورِ جاہلیت کے عرب میں یہودی اور نصرانی بھی خاصی تعداد میں آباد تھے بعض تاریخوں میں یہودیوں کے چند پڑھے لکھے حضرات کا تذکرہ ملتا ہے جن میں سے بیشتر مذہبی تبلیغ کیا کرتے تھے تاریخ کے انہی واقعات سے یہودیوں کے ایک ادارے "بیت المدارس" کا سراغ بھی ملتا ہے۔ یہ ادارہ بتایا جاتا ہے کہ مدینے کے نواح میں واقع تھا یہیں ایک بار تبلیغ اسلام کے لیے حضرت ابوبکر صدیق رضؓ کا جانا ہوا وہاں کئی یہودی اپنے ایک مذہبی پیشوا فنحاص کے گرد جمع تھے جسے اس دور میں یہودیوں کا بڑا عالم سمجھا جاتا تھا۔ حضرت صدیق رضؓ نے اس یہودی کو دعوت اسلام دی اور کہا کہ فنحاص خدا کا خوف کر اور مسلمان ہو جا، خدا کی قسم تو جانتا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم خدا کے رسول ہیں اور تو ان کا ذکر تورات اور انجیل میں لکھا ہوا پاتا ہے آپ کے جواب میں فنحاص نے بدتمیزی شروع کر دی اور کہا کہ خدا (نعوذ باللہ) ہمارا محتاج ہے ہم اس کے محتاج نہیں ہیں۔ یہودی عالم کی اس گستاخی پر حضرت صدیق رضؓ نے اسے زدو کوب کیا جس کی اس نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے شکایت بھی کی۔[۱]

اس واقعے سے جہاں مسلمانوں میں اللہ تعالیٰ سے والہانہ محبت اور عقیدت کا اندازہ ہوتا ہے وہیں اس بات کا پتہ بھی چلتا ہے کہ ظہور اسلام کے وقت یہودیوں کے اپنے ادارے موجود تھے جہاں وہ لوگوں کو اپنے مذہب کی تعلیم دیتے تھے ان اداروں میں مذہب کے علاوہ اور کیا کیا پڑھایا جاتا

---

[۱] محمد بن ہشام: سیرۃ (ابن ہشام)، مترجم شیخ محمد اسماعیل، مقبول اکیڈمی۔ لاہور سنہ ۱۹۶۱ء صفحہ ۲۷۴

تھا اس کا کچھ پتہ نہیں ملتا البتہ ایسی جگہ کا نشان ضرور مل جاتا ہے جہاں لوگوں کو گروہی انداز میں تعلیم دی جاتی تھی۔ مدینے کے نواح میں واقع اس ادارے کو ایک مذہبی ادارے کی حیثیت حاصل تھی۔ بعد میں بھی یہودی یہاں جمع ہوتے تھے اور مسلمانوں کے خلاف مختلف سازشیں کیا کرتے تھے۔

ایک مسلمان محقق ڈاکٹر احمد شلبی نے ظہور اسلام سے پہلے مکے کے ایک تعلیمی ادارے کے بارے میں لکھا ہے کہ یہ ادارہ ظہور اسلام سے پہلے ہی وہاں موجود تھا۔ انہوں نے مکے کے قریب رہنے والی ایک عورت ظلمہ کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے کہ ظلمہ بچپن میں ایک مدرسے میں جاتی تھی اور وہاں بقول اس کے اس کا سب سے محبوب مشغلہ دواتوں میں قلم ڈالنا اور اسے نکال کر کھیلنا تھا۔ یہ عورت قریش کے رشتہ دار قبیلے ہذیل سے تعلق رکھتی تھی اور بعد میں فاحشہ بن گئی تھی۔ قبیلے ہذیل کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ان کی آبادی میں اور بھی کئی ادارے تھے ڈاکٹر شلبی کی یہ تحقیق اگر درست ہے تو ظہور اسلام سے پہلے بھی تعلیمی اداروں کے وجود کا اعتراف کرنا پڑتا ہے لیکن صرف ایک قبیلے کی ایک لڑکی اور وہ بھی ایسی جو فاحشہ ہو چکی ہو اس کے حوالے سے سامنے آنے والی بات کو مستند قرار نہیں دیا جا سکتا[1] کئی مورخین کا یہ کہنا ہے کہ اس عہد کے عرب اپنے قبائلی مزاج اور خصوصیات سے اعتبار سے اتنے مختلف تھے کہ خواتین کو انتہائی کمزور سمجھنا ان کی عادت بن چکی تھی اور وہ ان پر ہر ظلم روا رکھتے تھے ایسے ماحول میں لڑکیوں کو تعلیم کے مواقع فراہم کرنا ان عربوں کے مزاج کے قطعی برعکس لگتا ہے۔ اس لیے یہی کہا جا سکتا ہے کہ یا تو انہیں زندہ دفن کر دینے کی عام روایت غلط ہے یا پھر انہیں زیور تعلیم سے آراستہ کرنے کے لیے تعلیمی اداروں میں بھیجنے کی روایت انتہائی غیر معتبر معلوم دیتی ہے۔

مدینے میں واقع یہودیوں کے بیت المدارس اور مکے میں واقع ادارہ (جہاں لڑکوں اور لڑکیوں کے تعلیم حاصل کرنے کے حوالے ملتے ہیں) کے علاوہ بعض لوگوں نے کچھ عیسائی اساتذہ کا تذکرہ بھی کیا ہے ان میں ایک نام بشر بن عبدالمالک کا ہے اس نے ظہور اسلام سے پہلے بھی مکے کے ابوسفیان بن امیہ اور ابو متین بن مناف کو لکھنا پڑھنا سکھایا تھا۔ خیال ہے کہ انہی دو افراد کو مکے میں سب سے پہلے لکھنے پڑھنے کی مہارت حاصل ہوئی۔ ڈاکٹر احمد شلبی اور دیگر محققین کے مطابق عرب کے سب سے بڑے مدرس کا تعلق بھی وادی القریٰ ہی سے تھا دور جاہلیت

---

[1] محمد حمید اللہ: عہد نبوی کا نظام حکمرانی (جلد اول) مکتبہ ابراہیمیہ۔ حیدر آباد دکن بار دوم ۱۹۴۹ء۔ صفحہ ۲۰۳

کے مکے میں ایک بڑے عالم کی حیثیت سے ورقہ بن نوفل کا نام بھی بہت مشہور رہا ہے۔[1] یہ وہی صاحب ہیں جو ام المومنین حضرت خدیجہؓ کے ماموں زاد بھائی تھے اور نزول وحی کے بعد حضرت خدیجہ نے انہی سے مشورہ کیا تھا۔ ورقہ بن نوفل کئی زبانوں کے ماہر تھے اور انہوں نے توریت اور انجیل کا عربی میں ترجمہ بھی کیا تھا۔ ان کا شمار عبرانی خط کے بڑے ماہرین میں ہوتا تھا اور انہیں الہامی کتابوں میں بھی بڑا درک حاصل تھا۔ تاریخ میں ان کے علم و کمال کے بہت سے حوالے ملتے ہیں لیکن اس بات کی کوئی شہادت نہیں ملتی کہ انہوں نے لوگوں کو باقاعدہ درس دیا ہو یا کسی کو لکھنے پڑھنے کی تربیت دی ہو حالانکہ وہ خود اس دور کے پڑھے لکھے ہی نہیں بلکہ بڑے اہل علم میں شمار کیے جاتے تھے۔ ان کی یہ خصوصیت البتہ اس امر کی غمازی ضرور کرتی ہے کہ انہوں نے خود کہیں نہ کہیں سے تعلیم ضرور حاصل کی ہوگی۔[2]

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مدینہ ہجرت سے پہلے بھی وہاں ایک یہودی صاحب علم کا پتہ ملتا ہے یہ یہودی مدینے میں لکھنا پڑھنا سکھاتے تھے۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کے بعد مدینہ میں مقیم ہوئے تو وہاں اٹھارہ یا انیس افراد ایسے تھے جو لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔ ان افراد میں سعید بن زرارہؓ منذر بن عمرؓ، ابی وہبؓ، واقع بن مالکؓ، اور اوسؓ بن خولی بھی شامل تھے۔ یہ لوگ ظہور اسلام کے وقت لکھنے کی صلاحیت حاصل کر چکے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد کے بعد مدینے میں علم کو اور بھی فروغ حاصل ہوا اور بعد میں وہاں تحریر کے لیے عربی خط بھی رائج کیا گیا۔[3]

مندرجہ بالا حوالوں سے یہودیوں یا نصرانیوں میں ظہور اسلام سے پہلے یا اس کے فوراً بعد بھی تعلیم عام ہونے کی شہادتیں نہیں ملتی ہیں البتہ مکے اور مدینے کے بعض اداروں اور صاحب علم افراد کے وجود کی تصدیق ضرور ہوتی ہے ان اداروں یا افراد سے ان لوگوں کا تعلق بھی رہا تھا جنہوں نے بعد میں اسلام قبول کر لیا۔ اس طرح یہ بات تو تسلیم کرنی پڑتی ہے کہ اس عہد کے معاشرے میں تمام اخلاقی اور معاشرتی برائیوں کے باوجود کچھ لوگ ایسے ضرور تھے جو لکھنا پڑھنا جانتے تھے اور جنہیں اپنی مذہبی کتابوں اور دوسری زبانوں پر بھی عبور حاصل تھا گنتی کے یہ چند افراد

---

[1] ڈاکٹر احمد شبلی: تاریخ تعلیم و تربیت اسلامیہ۔ مترجم محمد حسین خاں زبیری۔ ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور سنہ ۱۹۶۳ء صفحات ۱۰ تا ۱۹۔

[2] محمد حمید اللہ: عہد نبوی کا نظام حکمرانی (جلد اول) مکتبہ ابراہیمیہ۔ حیدر آباد دکن، بار دوم سنہ ۱۹۴۹ء صفحہ ۲۰۵۔

[3] علامہ شمس بریلوی: سرور کونین کی فصاحت۔ مدینہ پبلشنگ کمپنی کراچی سنہ ۱۹۸۵ء، صفحہ ۱۰۰

درس و تدریس سے منسلک تو نہ تھے البتہ وہ اپنی اپنی قوم کے مذہبی پیشوا کی حیثیت سے پہچانے جاتے تھے

عربوں میں تعلیم کا رواج

عربوں میں تعلیم کا جائزہ لینے سے پہلے عرب کی اصطلاح کی وجہ تسمیہ کے بارے میں دو اہم آراء کو دیکھا جائے تو وہاں کی معاشرت کا کچھ اندازہ ہو جاتا ہے۔ ایک رائے کے مطابق عرب کا لفظ عربہ سے مشتق ہے جس کے معنی دشت و صحرا ہیں چونکہ یہ خطہ دشت اور صحرا پر مشتمل ہے اس لئے اسے عرب کہا جاتا ہے دوسری رائے کے مطابق عرب کے لغوی معنی فصیح اللسان اور زبان آور ہیں چونکہ عرب میں رہنے والے اپنی زبان کی فصاحت کے مقابلے میں ساری دنیا کو کمتر سمجھتے تھے۔ اس لیے خود کو عرب اور دوسروں کو عجمی (زبان بستہ یا بے زبان) کہا کرتے تھے [1] دنیا کے بیشتر مورخ اور محقق اس بات کے معترف ہیں کہ عرب قوم دنیا میں سب سے زیادہ فصیح اللسان قوم رہی ہے۔ ان میں یہ خصوصیت اس دور میں بھی موجود تھی جب وہاں اسلام کا ظہور نہیں ہوا تھا بلکہ پورا عرب کفر اور شرک کی جہالت میں ڈوبا ہوا تھا۔ اپنی اس نمایاں ترین خصوصیت کے باوجود انہیں علمی و ادبی اعتبار سے زبان جیسا مؤثر وسیلہ فراہم کرتی ہے عرب رسمی تعلیم سے بہت دور تھے۔ گو عربوں کو ظہور اسلام سے پہلے بھی خطابت میں کمال حاصل تھا وہ علم الانساب میں بھی مہارت رکھتے تھے، داستان گوئی (تاریخ کی ابتدائی شکل) ان کا محبوب ترین موضوع تھی انہیں علم بیطار (علم الحیوان) سے بھی شغف تھا اور قیافہ شناسی اور نجوم جیسے علوم تک انہیں رسائی حاصل تھی لیکن یہ سب صلاحیتیں اور مہارتیں ان کی روایات کا لازمی جزو بن کر نسل در نسل منتقل ہو رہی تھیں۔ اس میں ان کی شعوری کوششوں اور درس و تدریس یا منتقلی کے کسی باقاعدہ نظام کو کوئی دخل نہیں تھا مجموعی طور پر عربوں میں لکھنے پڑھنے کی صلاحیت (جو حصول علم اور اشاعت علم کے لیے بنیادی مہارت کا درجہ رکھتی ہے) نہ ہونے کے برابر تھی۔ بڑی مشہور روایت ہے کہ ظہور اسلام کے وقت عرب کے سب سے مقتدر اور متمول قبیلے قریش میں بھی پڑھے لکھے افراد کی کل تعداد بمشکل تمام سترہ تھی، ان سترہ افراد میں ایسے چار افراد بھی شامل تھے جنہیں انہی روایات کے مطابق حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد امیر المومنین بننے کا اعزاز حاصل ہوا۔ یہ چاروں حضرات عمرؓ، عثمانؓ، معاویہؓ اور علیؓ تھے۔ [2]

---

[1] شاہ معین الدین احمد ندوی: تاریخ اسلام۔ غضنفر اکیڈمی کراچی۔ ۱۹۷۵ء صفحہ ۱۳

[2] ایضاً صفحہ ۔ ۱۹۶

رسمی تعلیم میں عربوں کی یہ معمولی حیثیت ان کی اس خصوصیت کے باوجود برقرار تھی کہ وہ ادب اور شاعری کے شعبے میں بہت نمایاں تھے۔ وہ اپنی زبان کے علاوہ دوسری زبانوں میں بھی دسترس رکھتے تھے شاید یہ اس دور کے معاشرہ کا تقاضہ تھا کہ انہیں اپنی زبان کے علاوہ دوسری زبانوں کے لوگوں سے میل جول اور انہیں سمجھنے کے لیے ان زبانوں کی ضرورت محسوس ہوئی ہوگی پڑھنے لکھنے کا رجحان ان میں نہ ہونے کے برابر تھا اور ایسا کوئی طریقہ کار یا سسٹم بھی موجود نہیں تھا جس سے وہ لوگ استفادہ کرتے۔ اس دور کے کچھ لوگوں نے اپنی انفرادی کوششوں سے تھوڑی بہت تعلیم حاصل کر لی تھی۔ ایسے لوگوں میں سب سے نمایاں حضرت عمرؓ تھے جو ظہور اسلام سے پہلے ہی لکھنا پڑھنا جانتے تھے آپ کو کئی زبانوں پر عبور حاصل تھا یہاں تک کہ توریت بڑی روانی سے پڑھ لیتے تھے۔ آپ کا مختلف زبانیں سیکھنے کا یہ سلسلہ بعد میں بھی جاری رہا اور آپ نے مدینے ہجرت کرنے کے بعد وہاں جا کر عبرانی زبان بھی سیکھ لی تھی۔ حضرت عمرؓ ان چند لوگوں میں شامل تھے جو ظہور اسلام سے پہلے ہی عربی خط لکھنے سے واقف تھے[۱] حضرت عمرؓ کی طرح یہ صلاحیت حضرت عثمانؓ، ابو سفیانؓ، طلحہؓ، معاویہؓ، علیؓ اور یزید بن ابو سفیانؓ کو بھی حاصل تھی۔ علم و فن میں ورقہ بن نوفل ایک اعلیٰ درجہ پہ فائز تھے۔ جن کا تذکرہ پہلے ہی کیا جا چکا ہے۔

مختلف زبانوں کے علاوہ عربوں کو علم الانساب میں بھی بڑا کمال حاصل تھا انسانوں کے نسب کے علاوہ عرب گھوڑوں اور اونٹوں کے نسب بھی محفوظ رکھتے تھے۔ حضرت ابو بکرؓ علم الانساب کے بہت بڑے ماہر تصور کیے جاتے تھے انہیں انساب کے ساتھ ساتھ عربوں کے مختلف واقعات، اور حالات کا بھی علم تھا آپ میں یہ ساری صلاحیتیں ظہور اسلام سے پہلے بھی موجود تھیں[۲] اس دور کے پڑھے لکھے لوگوں میں حضرت ابو بکرؓ کا نام شامل نہیں ہے حالانکہ ایک روایت سے اس بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ آپ لکھنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ ہجرت کے سفر میں آپ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ تھے اور اسی سفر میں رونما ہونے والا ایک واقعہ آپ کی اس صلاحیت کی تصدیق کرتا ہے۔ دوران سفر جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم غار ثور

---

[۱] سید شبلی نعمانی :۔ الفاروق۔ صفحہ ۲۳۲

[۲] ڈاکٹر حسن ابراہیم حسن بکتاب اعلام الاسلام۔ مترجم سید معین الحق۔ مشاہیر اسلام۔ پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کراچی ۱۹۵۵ء صفحہ ۳۔

سے نکل کر مدینے کی طرف جانے لگے تو کفار مکہ میں سے ایک شخص سراقہ بن مالک نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا تعاقب کرتے کرتے آپ ﷺ کو ڈھونڈھ نکالا۔ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کرنے کے ارادے سے آپ ﷺ کو تلاش کر رہا تھا۔ کھلے میدان میں جیسے ہی وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے آیا اس کا گھوڑا قابو سے باہر ہوگیا اور خود اس پر دہشت طاری ہوگئی یہ کیفیت دیکھ کر سراقہ بن مالک کو اپنی نیت اور فعل پر ندامت محسوس ہوئی اور اس نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے معافی کی درخواست کی۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے معاف کر دیا۔ اس نے مزید التجا کی کہ اسے کوئی ایسی نشانی دے دی جائے جس سے معافی کی تصدیق ہو جائے۔[1] آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق حضرت ابوبکرؓ نے کسی ٹھیکری یا ہڈی پر معافی نامہ لکھا اور سراقہ بن مالک کے حوالے کر دیا اس کے بعد آپ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مدینے روانہ ہوگئے بعض روایات کے مطابق اس موقع پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکرؓ کے علاوہ تیسرا آدمی بھی موجود تھا جو حضرت ابوبکرؓ کا غلام تھا اور یہ معافی نامہ اسی غلام عامر بن فہیرہ نے لکھا تھا۔[2] (یہ روایت باب الہجرہ بخاری سے ماخوذ ہے اور سیرۃ النبی میں شبلی نے اسی کے حوالے سے لکھنے والے کا نام عامر بن فہیرہ لکھا ہے) اس کے برعکس سیرۃ ابن ہشام کے مترجم محمد اسماعیل پانی پتی نے عامر بن فہیرہ کا کوئی ذکر نہیں کیا بلکہ واضح طور پر لکھا ہے[3] کہ وہ معافی نامہ حضرت ابوبکرؓ نے لکھ کر دیا) ان دو ناموں کے اختلاف کے باوجود اس امر کی تصدیق تو ہوتی ہے کہ وہ تحریر کسی نہ کسی نے لکھی تھی اور اندازہ ہوتا ہے کہ بعض غلام بھی لکھنے پڑھنے کی صلاحیت رکھتے تھے

عربوں میں چند افراد کے پڑھے لکھے ہونے کی واضح شہادتوں کے ساتھ ساتھ اس بات کا ثبوت بھی ملتا ہے کہ وہ علم اور اہل علم کی حوصلہ افزائی بھی کرتے تھے۔ اس سلسلے کی ایک مثال بشر بن مالک کی ہے ان کا تعلق عراق سے تھا اور وہ سند حمیری (خطاطی) کے بڑے ماہرین میں شمار ہوتے تھے۔ ظہور اسلام سے پہلے مکے کے ایک تاجر حرب بن امیہ بن عبدالشمس کاروبار کے سلسلے میں عراق گئے تو بشر بن مالک سے ملاقات ہوئی انہوں نے وہیں سے بشر کی شاگردی اختیار کر لی۔ انہوں نے اس حد تک ان کی خدمت کی کہ جب مکے واپس آئے تو انہیں بھی اپنے ہمراہ لے آئے۔ کچھ دنوں

---

[1] سید امیر علی۔ اسپرٹ آف اسلام، مترجم محمد ہادی حسین، ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور طبع سوم ۱۹۸۴ء صفحہ ۱۳۴

[2] سید شبلی نعمانی، سیرۃ النبیؐ، جلد اول، قرآن لمیٹڈ، لاہور، پہلا ایڈیشن۔ صفحہ ۲۷۹

[3] محمد بن ہشام: سیرۃ (ابن ہشام) مترجم شیخ محمد اسماعیل، مقبول اکیڈمی لاہور ۱۹۶۱ء صفحہ ۲۴۵

بعد حرب بن امیہ نے اپنی بیٹی صہبا کی شادی انہی استاد سے کر دی۔ خطاطی کے شعبے میں نمایاں حیثیت حاصل کرنے والے کئی مسلمان صحابہ مثلاً حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، ابوعبیدہؓ، معاویہؓ اور یزید بن ابوسفیان کا سلسلہ شاگردی انہی بشر بن مالک سے ملتا ہے۔[۱]

پڑھنے لکھنے اور مختلف شعبہ ہائے زندگی میں تھوڑی بہت مہارت حاصل کرنے کی ان چند شہادتوں کے علاوہ اس امر کے شواہد بھی ملتے ہیں کہ عرب سماجی اعتبار سے بھی کسی حد تک باشعور تھے اس کی ایک مثال دارالندوہ کا قیام ہے۔ یہ ادارہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وطن مولود مکہ میں تھا اور اسے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت سے کئی سو سال پہلے تعمیر کیا گیا تھا اس ادارے کو کفار مکہ کے لیے ایک معاشرتی یا سماجی مرکز Community Centre کی حیثیت حاصل تھی۔ اس کے قیام میں بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خاندان کا بڑا دخل تھا۔ آپ کے جد امجد قصی بن کلاب (ولادت ۴۰۰ء) کے دور میں مکے میں سوائے خانہ کعبہ کے اور کوئی عمارت موجود نہیں تھی۔ لوگ احتراماً خانہ کعبہ کی عمارت سے دور اپنے گھر بناتے تھے اور وہیں رہتے تھے ان کے ذہن میں یہ بات تھی کہ وہ اپنے خداؤں کے گھر کے ساتھ گھر بنائیں گے تو ان کا یہ عمل ایسا سمجھا جائے گا جیسے وہ ان کی برابری کر رہے ہوں۔ اس طرح ان کے خداؤں کی اہمیت کم ہوتی جائے گی۔ جب مکے میں قصی بن کلاب کو اقتدار ملا تو انہوں نے قریش کے ایک اجلاس میں اپنی یہ تجویز رکھی کہ مکے میں مکانات تعمیر کیے جائیں جب اس کے فوائد بیان کیے گئے تو لوگوں نے اس کی تائید کی اور یوں پہلا مکان قصی بن کلاب ہی نے بنوایا۔ یہی مکان دارالندوہ کہا جاتا تھا۔ معززین مکہ یہاں جمع ہوتے تھے اور اہم معاملات یہیں بیٹھ کر طے کرتے تھے۔ اس مکان کی تعمیر کے بعد رفتہ رفتہ اور مکان بھی تعمیر ہونے لگے اور خانہ کعبہ کے گرد طواف کے لیے میدان چھوڑ کر باقی زمین پر مکانات تعمیر کر لیے گئے۔ کفار مکہ کے اس دارالندوہ کے بارے میں یہ شواہد تو نہیں ملتے کہ یہاں تبلیغ یا درس و تدریس کا سلسلہ بھی جاری ہوا تھا لیکن اس امر کی تصدیق ضرور ہوتی ہے کہ اہل مکہ اپنے انتظامی اور اختلافی معاملات طے کرنے کے لیے اس عمارت کو بحیثیت اسمبلی استعمال کرتے تھے اس سے ان کے معاشرتی شعور کا اندازہ ہوتا ہے۔[۲] یہ وہی دارالندوہ تھا جہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت کے موقع پر کفار مکہ کا اجلاس منعقد

---

[۱] عبدالرزاق کانپوری: علم الکتابت یا ابجد کی تاریخ۔ مطبوعہ سلور جوبلی نمبر ماہنامہ زمانہ کانپور بھارت صفحہ ۲۴

[۲] ڈاکٹر محمد حسین ہیکل: سیرۃ الرسولؐ (حیات محمدؐ) مترجم مولانا محمد وارث کامل مرحوم، مکتبہ کارواں لاہور ۱۹۶۴ء صفحہ ۱۲۴

ہوا تھا اور اس اجلاس میں کفارِ مکہ نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کرنے کا فیصلہ کیا تھا[1]

شاعری اور علم الانساب

جیسا کہ پہلے ہی بتایا جا چکا ہے عربوں کو دورِ جاہلیت میں بھی اپنی زبان اور اس کی فصاحت پر بڑا ناز تھا۔ ابتدا ہی سے مختلف عرب قبائل میں زبان کے مختلف اسلوب رائج تھے ان میں اس درجہ وسعت تھی کہ دورِ جاہلیت کی عربی کی بے شمار اصطلاحات اور تراکیب قرآن کریم میں بھی استعمال کی گئی ہیں۔ مختلف عرب قبائل میں مروج الفاظ جمع ذخائر کی قرآن میں موجودگی سے جہاں قرآن کی جامعیت اور اس کے من جانب اللہ ہونے کی دلیل ملتی ہے وہیں عربوں کی زبان کی وسعت کا اندازہ بھی ہوتا ہے قرآن میں دورِ جاہلیت کے روزمرہ استعمال ہونے والے وہ فصاحت و بلاغت رکھنے والے الفاظ اسی مفہوم کے ساتھ موجود ہیں جس مفہوم میں انہیں دورِ جاہلیت کے شعرا نے استعمال کیا تھا۔ اس دور کے ایک عظیم مفسر حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے بارے میں روایت ہے کہ آپ حرم کے دروازے پر بیٹھے لوگوں کو تفسیر قرآن کا درس دے رہے تھے اور کچھ لوگ آپ کے گرد جمع تھے وہاں حضرت نافع بن الازرق اور حضرت نجدہ بن عویمرؓ پہنچے اور آپ سے کچھ باتیں کیں اس گفتگو کو جلال الدین سیوطی نے لکھا ہے۔ ان دو حضرات نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے مطالبہ کیا کہ قرآن کو اگر عربی میں نازل کیا گیا ہے تو وہ اس کے مصداق اشعارِ عرب پیش کریں وہ دونوں حضرات ان تمام محاورات اور تراکیب کے بارے میں استفسار کرتے گئے جو قرآن میں استعمال کئے گئے ہیں اور آپ جواباً انہیں ان اصطلاحات کے استعمال کی شہادتیں مختلف اشعار سے دیتے گئے۔ آپ نے جو اشعار پڑھے ان میں کافی اشعار ایسے بھی تھے جو دورِ جاہلیت کے مختلف عرب قبائل کے شعرا نے کہے تھے[2]۔ اس واقعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ عربوں کی زبان میں صرف الفاظ کی بھرمار نہیں تھی بلکہ اصطلاحات اور تراکیب میں حسن اور مفہوم کے ساتھ ساتھ جامعیت اور وسعت بھی موجود تھی۔

عرب شاعری کے شعبے میں دنیا میں سب سے آگے رہے ہیں آج بھی ان کا منظوم کلام دنیا

---

[1] ڈاکٹر محمد حسین ہیکل: سیرۃ الرسول (حیاتِ محمدؐ) مترجم مولانا محمد وارث کامل رحیم، مکتبہ کاروان لاہور ۱۹۶۳ء صفحہ ۲۰

[2] علامہ شمس بریلوی: سرورِ کونینؐ کی فصاحت، مدینہ پبلشنگ کمپنی کراچی، ۱۹۸۵ء صفحات ۹۰-۸۹

کے مختلف علاقوں میں بولی جانے والی تمام زبانوں کے مجموعی منظوم کلام سے زیادہ ہے۔ عربوں کو دور جاہلیت ہی سے نظم کا اس قدر شوق تھا کہ وہ اکثر اوقات انتہائی مشکل مضامین اور گفتگو کو بھی نظم کر لیا کرتے تھے۔ ان کی مہارت کی ایک مثال بہت ہی عام ہے اور وہ یہ کہ عرب اکثر فقہ، فلسفہ اور جبر و مقابلہ کو بھی نظم ہی میں کہتے تھے۔[۱] عربوں میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت سے کئی صدی پہلے سے سالانہ مشاعرے کی روایت موجود تھی۔ یہ مشاعرہ مکے سے تین دن کی مسافت کے فاصلے پر واقع عکاظ نامی جگہ پر ہوا کرتا تھا جہاں سالانہ میلہ بھی لگتا تھا۔ مشاعرے میں پڑھا جانے والا سب سے عمدہ کلام بیش بہا چیزوں پر سونے کے حروف سے لکھ کر خانہ کعبہ میں آویزاں کر دیا جاتا تھا۔ تاکہ آئندہ نسلیں اس سے مستفید ہوں یقیناً کچھ لوگ ایسے مقرر ہوں گے جو ان اشعار کو لکھنے کا کام سرانجام دیتے ہوں گے خانہ کعبہ میں آویزاں کرنے کی اس روایت کی وجہ سے دنیا تک وہ سات مشہور قصائد بھی پہنچے ہیں جو سبع المعلقات کہے جاتے ہیں جن کا تذکرہ پہلے کیا جا چکا ہے۔ ان قصائد کا موضوع بہادری، ریگستان کی سختیاں اور بدوی معاشرت تھا۔[۲] ان ساتوں قصائد کے خالق شعراء امراء القیس، زہیر بن ابی سلمی طرفہ بن العبد بن سفیان، عمرو بن کلثوم، عنترہ بن شداد، حارث بن حلزہ بن یزید بن عبداللہ اور لبید بن ربیعہ بن جعفر تھے۔ ان میں سے آخر الذکر کو اسلام قبول کرنے کا شرف بھی حاصل ہوا[۳] عربوں کی زبان دانی، شاعری اور قصائد کی اس تاریخی روایت سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ عربوں میں کسی حد تک پڑھنے لکھنے کا دستور موجود تھا اور یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ مکمل طور پر اس سے نابلد تھے۔

شاعری کے علاوہ عربوں کو علم الانساب میں بھی بڑی مہارت حاصل رہی ہے دور جاہلیت کے عرب بھی اس فن میں طاق تھے۔ ریگستان عرب کے بدوی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی پانچ اعلیٰ گھوڑیوں سے چلنے والی نسلوں سے اچھی طرح باخبر ہیں۔ جب بھی کوئی عمدہ نسل کا بچہ پیدا ہوتا ہے تو چند اشخاص کسی خیمے میں جمع ہوتے ہیں ان کی گواہی پر اس بچے کی تاریخ پیدائش ماں کا نام اور اس کے خاندان کا نام ایک کاغذ پر لکھا جاتا ہے گھوڑے کے بچے کے اس شجرے پر گواہ اپنی مہریں ثبت کر کے اس تحریر کی توثیق کرتے ہیں بعد میں یہ کاغذ تانبے کی کسی ڈبیہ میں بند کر کے اس بچے کی گردن

---

[۱] ڈاکٹر گستاولی بان: تمدن عرب۔ مترجم سید علی بلگرامی، مقبول اکیڈمی لاہور، صفحہ ۹۶-۴۹

[۲] ایضاً صفحات ۹۵-۴۹۴ [۳] ایضاً صفحہ ۴۹۵

[۴] علامہ شمس بریلوی: سرور کونین کی فصاحت۔ مدینہ پبلشنگ کمپنی کراچی ۱۹۸۷ء صفحات ۱۹-۱۸

میں لٹکا دیا جاتا ہے۔ یہ سلسلہ عرب میں صدیوں سے رائج ہے [1] اس علم کے ابتدائی ماہرین میں حضرت ابوبکرؓ کا نام بھی شامل ہے۔

کتابت اور تیر اندازی

عربوں میں شاعری اور علم الانساب کے ساتھ کتابت کا فن بھی موجود تھا انہوں نے ابتداً دوسری قوموں اور مذاہب کے ماننے والوں سے استفادہ کیا اور رفتہ رفتہ اس فن میں ماہر ہوتے گئے۔ عربی خط لکھنے والوں حضرت عمرؓ۔ حضرت علیؓ۔ حضرت طلحہؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت ابوسفیانؓ، حضرت معاویہؓ اور حضرت یزید بن ابوسفیانؓ کے نام شامل تھے [2] عرب اس فن کو تعلیم و تربیت میں بڑی اہمیت دیتے تھے اور وہ لوگ جو کتابت کے ساتھ تیر اندازی بھی سیکھ لیتے تھے انہیں حکمہ یا (کامل) learned or perfect کا خطاب دیا جاتا تھا۔ دورِ جاہلیت میں سوید بن صامت اور حضیر کتائب کو یہ خطاب ملا تھا ظہور اسلام کے ابتدائی دور میں کتابت اور تیر اندازی میں مہارت کی وجہ سے مسلمانوں میں سے حضرت رافعؓ، سعدؓ، اسیدؓ۔ عبداللہؓ بن ابی اور اوسؓ بن خولیؓ کو بھی یہ خطاب ملا تھا۔ ظہور اسلام سے پہلے الحکم بھی بڑے خوشنویس سمجھے جاتے تھے اسلام قبول کرنے کے بعد یہ عبداللہ بن سعید بن العاص کے نام سے مشہور ہوئے [3] کتابت کے فن اور مختلف انداز سے اس کے اظہار پر تیر اندازی کی طرح عربوں کو مکمل عبور تو حاصل نہیں تھا لیکن اس شعبے میں انہیں مکمل ناواقف بھی نہیں کہا جا سکتا۔ ان کے چند افراد رفتہ رفتہ اس فن کو حاصل کرنے کی جانب مائل ہو رہے تھے۔

قریش میں پڑھے لکھے افراد

شاعری، کتابت، علم الانساب اور تیر اندازی میں اچھی خاصی شُد بُد کے باوجود عربوں میں بہتر تعلیم یافتہ افراد تو درکنار معمولی پڑھنے لکھنے کی صلاحیت رکھنے والے بھی چند ہی افراد تھے۔

---

[1] ڈاکٹر گستاولی بان: تمدن عرب۔ مترجم سید علی بلگرامی۔ مقبول اکیڈمی لاہور صفحہ ۱۱۳

[2] جرجی زیدان: تاریخ تمدن اسلامی۔ مترجم محمد حلیم انصاری شیخ شوکت اینڈ سنز طبع اول جلد اول دوم سنہ ۱۹۶۴ء ص ۳۱۵-۳۱۴

[3] حبیب الرحمٰن شیروانی۔ علمائے سلف و نابینا علما (تعلیقات و حواشی۔ مفتی انتظام اللہ شہابی) اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ۔ طبع اول۔ کراچی سنہ ۱۹۶۱ء صفحہ ۲۰

بیشتر روایات یہی ہیں کہ ظہورِ اسلام کے وقت قریش میں سترہ افراد ایسے تھے جو لکھنے اور پڑھنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ قریش عرب کا ایک بڑا قبیلہ تھا جو اس دور کے مذہبی، معاشرتی اور ثقافتی اعتبار سے عرب کے تمام قبائل میں ممتاز حیثیت رکھتا تھا۔ اس ممتاز قبیلے میں پڑھنے لکھنے کی صلاحیت رکھنے والوں کی یہ معمولی تعداد اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ عربوں کو اسلام سے پہلے لکھنے پڑھنے سے زیادہ دلچسپی نہیں تھی۔ [1]

قریش کے ان پڑھے لکھے افراد میں مندرجہ ذیل چودہ مردوں کے علاوہ خواتین بھی شامل تھیں۔ (۱) حضرت عمرؓ (۲) حضرت علیؓ (۳) حضرت عثمانؓ (۴) حضرت ابوعبیدہؓ (۵) حضرت طلحہؓ (۶) یزیدؓ بن ابی سفیان (۷) ابوحذیفہ بن عتبہ (۸) حاطب بن عمرو (۹) ابوسلمہ بن عبدالاسد (۱۰) آبان بن سعید (۱۱) خالد بن سعید (۱۲) عبداللہ بن سعد رضؓ (۱۳) ابوسفیان بن حرب اور (۱۴) حضرت معاویہؓ۔ دو خواتین حضرت حفصہ بنت عمرؓ اور حضرت ام کلثوم بنت عقبہؓ بھی اس فہرست میں شامل تھیں جبکہ ایک اور خاتون کریمہ بنت المقداد صرف لکھنا جانتی تھیں۔ ان تین خواتین کے علاوہ ایک خاتون اور بھی تھیں جنہیں صرف لکھنا آتا تھا اور وہ پڑھنا نہیں جانتی تھیں یہ خاتون حضرت ام سلمہؓ تھیں۔ خواتین کی فہرست سے الگ دو خواتین کے نام اور بھی ملتے ہیں، یہ خواتین حضرت شفاؓ بنت عبداللہ اور عائشہ بنت سعدؓ تھیں جنہیں دورِ جاہلیت ہی سے لکھنے پڑھنے میں مہارت حاصل تھی۔ ان سب کو اگر اس فہرست میں شامل کر لیا جائے تو تعداد سترہ سے بڑھ جاتی ہے (اس فہرست میں حضرت ابوبکرؓ یا ان کے غلام عامر بن فہیرہ کا نام بھی شامل نہیں ہے حالانکہ یہ تصدیق ہوتی ہے کہ انہوں نے سراقہ بن مالک کو معافی نامہ لکھ کر دیا تھا) ظہورِ اسلام کے وقت قریش میں پڑھے لکھے افراد کی تعداد سترہ ہو یا بیس دونوں صورتوں میں اسے حوصلہ افزا قرار نہیں دیا جا سکتا اور ہر آدمی اس بات کو تسلیم کرے گا کہ اسلام سے پہلے قریش جیسے معزز قبیلے میں بھی پڑھنے لکھنے پر زیادہ توجہ نہیں دی جاتی تھی۔ [2] (بحوالہ فتوح البلدان۔ بلاذری۔ ۴۷۸ - ۴۷۷)

---

[1] ڈاکٹر احمد شلبی : تاریخ تعلیم و تربیت اسلامیہ : مترجم محمد حسین خاں زبیری۔ ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور ۱۹۶۳ء صفحات ۲۰-۱۹۔

[2] حاجی معین الدین ندوی: مہاجرینؓ (حصہ اول) دارالمصنفین اعظم گڑھ طبع ثانی ۱۹۵۱ء صفحہ ۳۴

قریش میں جو چند افراد پڑھنے لکھنے کی صلاحیت رکھتے تھے ان میں خواتین بھی شامل تھیں ۔ مختلف حوالوں سے یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ حضرت شفا بنت عبداللہؓ ایام جاہلیت ہی سے لکھنا پڑھنا جانتی تھیں اور یہ حضرت حفصہؓ بنت عمر کو اس وقت بھی پڑھاتی رہیں جب حضرت حفصہؓ کی حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے شادی ہو چکی تھی ۔ کیونکہ وہ اس سے پہلے صرف لکھنا جانتی تھیں ۔ شفا بنت عبداللہؓ کے علاوہ لکھنے کی صلاحیت ام کلثوم بنت عقبہ اور کریمہ بنت مقداد کو بھی حاصل تھی اور لبعد میں جب یہ سلسلہ اور آگے بڑھا تو کئی مسلمان خواتین سامنے آئیں جن میں دو امہات المومنین حضرت عائشہؓ اور حضرت ام سلمہؓ بھی شامل تھیں (بلاذری کے مطابق ان دونوں کو صرف پڑھنا آتا تھا) ان کے علاوہ حضرت عائشہؓ بنت سعد اور شفا بنت عبداللہ دو ایسی خواتین تھیں جو لکھنا اور پڑھنا جانتی تھیں [۱]

اسلام اور علم کے باہمی تعلق کے حوالے سے دیکھا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ قریش مکہ میں سب سے پہلے اسلام قبول کرنے والے افراد وہی تھے جو پڑھے لکھے تھے ۔ بلکہ ان میں سے بیشتر نے اسلام قبول کر لیا تھا ۔ بعض ماہرین دورِ جاہلیت کے پڑھنے لکھنے کی صلاحیت رکھنے والے افراد کے اسلام قبول کرنے کو اسلام کے عقلی اور سائنسی ہونے کی دلیل قرار دیتے ہیں ۔ اس دور میں اسلام قبول کرنا ایک بڑی سعادت بھی تھی اور حسن اتفاق ہے کہ یہ سعادت سب سے پہلے ایک خاتون کے حصے میں آئی اور ان کے بعد جن لوگوں نے اسلام قبول کیا وہ سب پڑھے لکھے لوگ تھے

مدینہ میں پڑھے لکھے افراد

اوائل اسلام میں صرف مکے اور قبیلہ قریش ہی میں نہیں بلکہ پورے عرب میں ناخواندگی بہت زیادہ تھی ۔ اس کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ پڑھے لکھے لوگ اس حد تک نمایاں تھے کہ اس دور میں بھی ان لوگوں کو واضح طور پہ گنا جا سکتا تھا ۔ اور آج تک ان افراد کے ناموں سے سب ہی آگاہ ہیں اس دور میں مدینے کی کیفیت بھی مکے سے مختلف نہ تھی وہاں بھی بہت کم افراد ایسے تھے جو باقاعدہ لکھنا پڑھنا جانتے تھے ان افراد میں سعد بن عبادہ ۔ منذر بن عمرو ۔ ابی بن کعب ۔ زید بن ثابت ۔ عبداللہ بن ابی منافق ۔ رافع بن مالک ۔ اسید بن حضیر ۔

---

[۱] مولانا سعید انصاری: سیر انصارؓ (حصہ اول و دوم) دار المصنفین اعظم گڑھ ۔ طبع دوم ۱۹۴۸ء

معن بن عصری ۔ بشیر بن سعد ۔ سعد بن ربیع اور اوس بن خولی کے نام سب سے نمایاں ہیں ۔ ان سب میں سے حضرت رافع بن مالک بن عجلان کو ابتدا ہی میں بہت شہرت حاصل ہوئی ۔ آپ مکے گئے اور جس قدر قرآن نازل ہوا تھا لے کر مدینے آئے تھے تاکہ لوگوں کو اس سے باخبر کیا جا سکے۔

مکے اور مدینے میں پڑھے لکھے لوگوں کی اس مختصر سی تعداد سے اندازہ ہوتا ہے کہ مجموعی طور پر عرب کی زمین خواندگی اور تعلیم جیسی روشنی سے محروم تھی ۔ شاعری اور علم الانساب یہ دو ہی ایسی مہارتیں تھیں جن میں عربوں کو نمایاں مقام حاصل تھا اس کے علاوہ کتابت کا فن جاننے والے لوگوں کی تعداد بھی بہت محدود تھی ۔ اس دور میں تعلیم و تدریس نام کی کوئی شے واضح شکل میں موجود نہیں تھی مختلف عرب قبائل جو اپنی اپنی زبان اور ثقافت کے حوالے سے منفرد حیثیت رکھتے تھے انہیں بھی شہسواری اور تیراندازی جیسی چیزوں سے زیادہ رغبت تھی ۔ عربوں کے علاوہ مجموعی طور پر عرب کی دوسری قوموں یہودیوں اور نصرانیوں میں بھی یہی کیفیت تھی ۔ ان کے مذہبی پیشوا صرف مذہبی کتابیں پڑھنے اور لوگوں کو ان کے مندرجات سے آگاہ کر کے انہیں اپنے عقائد پر قائم رہنے کی ترغیب تو دیتے تھے لیکن انہوں نے عام لوگوں کو تعلیم دینے اور خود سمجھنے کا موقع فراہم نہیں کیا ۔ ظہور اسلام کے وقت سرزمین عرب کی معاشرتی زندگی میں بدکاریاں اور برائیاں عام ہونے کا ایک سبب لوگوں کا علم اور کتاب سے نابلد ہونا بھی تھا اور یہ صورت حال ظہور اسلام کے بعد تبدیل ہونا شروع ہوئی ۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت سے پہلے خانہ کعبہ پر ابرہہ کے لشکر اور اس کے ہاتھیوں کی یلغار کے حوالے سے عام الفیل کا سال مشہور ہوا تھا یہ واقع عیسوی سن کے اعتبار سے سن ۵۷۰ء میں رونما ہوا تھا ۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت ابرہہ اور اس کے لشکر کی تباہی کے ٹھیک پچاس دن بعد ہوئی تھی ۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے والد بزرگوار حضرت عبداللہ آپ کی ولادت سے چند روز پہلے ہی انتقال کر گئے اس وقت ان کی عمر پچیس برس تھی آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تربیت ابتدا ہی سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دادا عبدالمطلب نے کی

---

[1] محمد بن ہشام : سیرت (ابن ہشام) مترجم شیخ محمد اسماعیل ۔ مقبول اکیڈمی لاہور ۱۹۶۱ء صفحہ ۴۷

جو قریش کے ایک ممتاز فرد تھے۔ زندگی کے چھٹے برس آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی والدہ کا بھی انتقال ہوگیا اور اس طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ابتدا ہی سے یتیمی کا صدمہ برداشت کرنا پڑا حضور صلی اللہ علیہ وسلم عرب کی روایت کے مطابق بنی سعد کی ایک خاتون حضرت حلیمہ کے پاس بھی رہے جنہوں نے آپ کی دیکھ بھال کی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا بچپن اور لڑکپن دونوں ہی والدین کی شفقت سے محرومی اور بڑی تنگدستی اور عسرت میں بسر ہوئے جلد ہی آپ کے دادا عبدالمطلب کا بھی انتقال ہوگیا اور اس طرح آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو مزید مصائب اٹھانے پڑے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عام لوگوں کے درمیان آنکھ کھولی اور انہی کے ساتھ زندگی بسر کی وہ سب لوگ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دیانتداری، محنت اور خلوص کے ابتدا ہی سے معترف تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پچیس سال کی عمر میں ایک بیوہ خاتون حضرت خدیجہؓ سے نکاح کیا۔ اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر غار حرا میں پہلی وحی نازل ہوئی۔ اللہ تعالیٰ کی جانب سے عائد کردہ اس ذمہ داری کی ادائیگی میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلا تعاون ام المومنین حضرت خدیجہؓ نے کیا اور حضور صلی اللہ علیہ کی دعوت پر دنیا میں سب سے پہلے اسلام قبول کرنے کا شرف بھی انہی کو حاصل ہوا۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے چالیس سال کی عمر میں اللہ تعالیٰ کے ارشاد کے مطابق اعلان نبوت کیا اور لوگوں کو علانیہ درس و ہدایات دینی شروع کیں اسلام کی تبلیغ کی وجہ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بڑی صعوبتیں برداشت کرنی پڑیں یہاں تک کہ رضائے الٰہی کی خاطر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو باون سال کی عمر میں اپنے احباب کے ساتھ یثرب ہجرت کرنی پڑی۔ یہ شہر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد کے بعد مدینۃ النبیؐ مشہور ہوا اور آج تک اسی نام سے موسوم ہے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت ۶۲۲ء کا واقعہ ہے اور یہیں سے ہجری سن کا آغاز ہوا۔ مدینے میں بھی مکے کی طرح مختلف قبائل موجود تھے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی راہ میں حائل ہوتے رہے لیکن رفتہ رفتہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات اور حسن سلوک نے لوگوں کو اپنا گرویدہ بنا لیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کچھ عرصہ کے بعد مکے واپس آگئے اور خانہ کعبہ کو خدائے واحد کی تعلیمات کی مطابق بتوں سے پاک کر دیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ۶۳۲ء کو دنیا سے رحلت فرمائی[1] مورخین کے مطابق آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت بھی آپ کی ولادت والی تاریخ کو

---

[1] سید امیر علی: اسپرٹ آف اسلام: مترجم محمد ہادی حسین۔ ادارہ ثقافت اسلامیہ۔ لاہور۔ طبع سوم ۱۹۸۴ء صفحہ ۸۱

یعنی بارہ ربیع الاول ہی کو ہوئی۔ سن ہجری کے اعتبار سے یہ واقعہ گیارہ ہجری کو رونما ہوا آپؐ کے وصال کے وقت آپؐ کی عمر تریسٹھ سال تھی۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم و تربیت

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں ان روایات پر سب ہی متفق ہیں کہ آپؐ امی تھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیاوی اعتبار سے رسمی تعلیم حاصل نہیں کی تھی اور نہ ہی کبھی کسی کے آگے جاننے کے لیے دست سوال دراز کیا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے ابتدائی تلخ ایام اور یکے بعد دیگرے باپ اور ماں کی شفقت سے محرومی اور پھر سرپرستی کرنے والے دادا کے انتقال سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم معاشی طور پر کتنے مشکل حالات سے دوچار رہے تھے بعض روایات کے مطابق آپ کچھ عرصہ اپنے چچا ابوطالب کی سرپرستی میں بھی رہے۔ حضرت ابوطالب خود اتنے غریب تھے کہ جیسے ہی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات کچھ بہتر ہوئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے محسن چچا کی تنگدستی کا خیال کرتے ہوئے ان کے بیٹے علیؓ کو اپنی سرپرستی میں لے لیا۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ابوطالب کے پاس رہتے ہوئے بھی کام کرنا پڑتا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اکثر ان کے کام میں شریک رہتے تھے ایک بار انہی کے ساتھ سامان تجارت لے کر شام گئے تو وہاں بصرہ کی ایک خانقاہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ملاقات ایک نصرانی راہب بحیرا سے ہوئی غیر مصدق روایات خصوصاً نصرانیوں کی روایات یہ بتاتی ہیں کہ اس راہب نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو توریت کی تعلیم دی[1] اس واقعہ کی توثیق کسی اور حوالے سے نہیں ہوتی اور نہ ہی حالات اور واقعات اس کی تصدیق کرتے ہیں اس لیے یہی کہا جا سکتا ہے کہ یہ گستاولی بان کے اپنے ذہن کی اختراع ہے یا وہ بغیر سوچے سمجھے نصرانیوں کی روایت کو نقل کر گئے ہیں۔ حضورؐ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ پر دنیا میں سب سے زیادہ تحقیق کی گئی ہے اور اگر ایسا واقعہ رونما ہوتا تو کسی اور حوالے یا محقق کی نظر سے پوشیدہ نہ رہتا سب لوگوں کی متفقہ رائے یہی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم رسمی اعتبار سے لکھنا اور پڑھنا نہیں جانتے تھے۔ البتہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے غیر رسمی تعلیم حاصل کی تھی اور اس غیر رسمی تعلیم

---

[1] ڈاکٹر گستاولی بان: تمدن عرب: مترجم سید علی بلگرامی۔ مقبول اکیڈمی۔ لاہور، صفحہ ۱۰۸۔

کا بیشتر حصہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس ذریعہ سے حاصل کیا تھا اس کا اندازہ اس حوالے سے ہو سکتا ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بہترین رفیق حضرت ابوبکر صدیق نے ایک بار آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں یہ عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں عرب کے تمام قبائل میں گھوما پھرا ہوں اور میں نے ان قبائل کے فصحاء سے گفتگو کی ہے لیکن میں نے آپؐ سے زیادہ کسی کو فصیح نہیں پایا یہ تعلیم آپؐ کو کس نے دی ہے۔ حضرت ابوبکرؓ کے استفسار پہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ (حدیث)

اَدّبنی ربّی فاحسن ادبی

میرے رب نے میری تعلیم اور ادب آموزی کی ہے اور خود ہی ادب سکھایا ہے[1]

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کے حوالے کے بعد اس امر کی گنجائش نہیں رہتی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی غیر رسمی تعلیم کے بارے میں کوئی اور سراغ تلاش کیا جائے۔ بلاشبہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی مکمل طور پہ بے داغ تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا اخلاق بہترین نمونہ تھا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی فصاحت و بلاغت نے عربوں جیسے ماہر اللسان لوگوں کو بھی قائل کر دیا تھا۔ یہ سب اسی غیر رسمی تعلیم و تربیت کا نتیجہ تھا جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو منجانب اللہ عطا ہوئی تھی۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا مقصد

دنیا میں مبعوث کیئے گئے تمام انبیاء کرام کی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا مقصد بھی یہی تھا کہ لوگوں کو اللہ تعالیٰ کے ارشادات سے آگاہ کریں انہیں وہ سب کچھ بتائیں جس میں ان کی فلاح ہے اور لوگوں کو ان باتوں کا علم دیں جن سے وہ آگاہ نہیں ہیں انہیں برائیوں سے روکیں اور اچھائی کی تعلیم دیں تاکہ وہ اپنی تخلیق کے مقاصد سے واقف ہوں اور اپنے دنیاوی اور اخروی معاملات کا شعور حاصل کر سکیں اس طرح لوگوں کی انفرادی اور اجتماعی تعلیم و تربیت اور انہیں صراط مستقیم تک لانا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا اولین مقصد تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کا پیغام لے کر دنیا میں تشریف لائے تھے اور پوری زندگی لوگوں

---

[1] علامہ شمس بریلوی: سرور کونین کی فصاحت۔ مدینہ پبلشنگ کمپنی۔ کراچی ۔ ۱۹۸۵ء صفحہ ۲۰۷

تک وہ پیغام پہنچاتے رہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے متعلق ارشاد ربانی ہے کہ (القرآن)

هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَ
يُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَإِن كَانُوا مِن قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ ‎(۲-۶۲) (الجمعہ - پ ۲۸)

اللہ نے امیوں میں ان ہی میں سے ایک رسول بھیجا جو ان کو اس کی آیتیں سناتا اور ان کو پاک بناتا ہے اور ان کو کتاب و حکمت سکھاتا ہے ۔ (ترجمہ)

قرآن کریم میں ایک اور مقام پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے متعلق ارشاد ہوا کہ (القرآن)

كَمَا أَرْسَلْنَا فِيكُمْ رَسُولًا مِّنكُمْ يَتْلُو عَلَيْكُمْ آيَاتِنَا وَيُزَكِّيكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُم مَّا لَمْ تَكُونُوا تَعْلَمُونَ

جس طرح ہم نے تمہیں میں سے ایک رسول بھیجا جو ہماری آیتیں پڑھ کر تمہیں سناتا ہے اور تمہاری اصلاح کرتا ہے اور تمہیں کتاب (قرآن) اور شریعت سکھاتا ہے اور تمہیں وہ باتیں سکھاتا ہے جن کی تمہیں خبر نہیں (ترجمہ)

قرآن ہی میں ایک اور مقام پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا مقصد لوگوں کو کتاب و حکمت کی تعلیم دینا بتایا گیا ہے بالکل واضح طور پر ارشاد ہوا کہ (القرآن)

وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُم مَّا لَمْ تَكُونُوا تَعْلَمُونَ

یہ رسول تم کو کتاب و حکمت سکھاتا اور ایسے علوم سکھاتا ہے جو تم نہ جانتے تھے (ترجمہ)

قرآنی ارشادات کے مطابق آپ کی بعثت کا مقصد یہی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دنیا میں لوگوں کو تعلیم دینے کے لیے بھیجا گیا تھا۔ یہ وہی فریضہ ہے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے دوسرے انبیاء کرام کو سونپا گیا تھا۔ جدید تعلیمی تصورات کے مطابق ایسے لوگوں کو تعلیم دینا جو کچھ بھی نہ جانتے ہوں در اصل انہیں تاریکی سے روشنی میں لانے کے مترادف ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم اسی کام کے لیے مبعوث کیے گئے تھے اور ساری دنیا جانتی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کام نہائی خوش اسلوبی سے سرانجام دیا جہالت کی تاریکی سے علم کی روشنی میں لانے کے اس عمل کی نشاندہی اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے بھی ہوتی ہے ۔ (القرآن)

قَدْ أَنزَلَ اللَّهُ إِلَيْكُمْ ذِكْرًا ‎۝ رَّسُولًا يَتْلُو عَلَيْكُمْ آيَاتِ اللَّهِ مُبَيِّنَاتٍ لِّيُخْرِجَ الَّذِينَ آمَنُوا وَ
عَمِلُوا الصَّالِحَاتِ مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ ‎(الطلاق - پ ۲۸) (۶۵ - ۱۰/۱۱)

اللہ تعالیٰ نے تمہاری طرف ذکر بھیجا یعنی اپنا رسول جو تم پر اللہ کی ظاہر باہر آیات پڑھتا ہے تاکہ ایمان والوں اور اچھے عمل کرنے والوں کو ظلمت سے نکال کر نور تک پہنچا دے (ترجمہ)

ان تمام آیات کی روشنی میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا ایک ہی مقصد سامنے آتا ہے اور وہ لوگوں کو ظلمت سے نکال کر نور تک پہنچانا ہے۔

to lead out from darkness to light.

اس مقصد کے حصول کے لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو تعلیم دی اور تعلیم کے ساتھ ساتھ خود عملی نمونہ بن کر ان میں یہ یقین پیدا کیا کہ فلاح اور بہتری کے لیے ان تعلیمات پر عمل بھی کیا جا سکتا ہے اس طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے قول اور عمل سے لوگوں کو کتاب و حکمت کے مفہوم سے روشناس کرایا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل سے بھی آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اپنے محبوب مشغلے (درس و تدریس) سے رغبت کا اظہار ہوتا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی روایت کے مطابق ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دو مجلسوں میں سے گزرے جو مسجد میں منعقد تھیں آپؐ نے فرمایا دونوں مجلسیں بھلائی پر ہیں لیکن ایک ان میں دوسری سے بہتر ہے۔ ان دونوں مجالس (اگروہوں) میں سے ایک عبادت میں مصروف ہے اور خدا سے دعا کر رہی ہے اور اس سے اپنی خواہش و رغبت کا اظہار کر رہی ہے خواہ اس کو دے یا نہ دے اور دوسری مجلس فقہ یا علم کو حاصل کر رہی ہے اور جاہلوں کو علم سکھا رہی ہے پس یہ لوگ بہتر ہیں اور میں بھی معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں (یہ کہہ کر) آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی ان میں بیٹھ گئے۔

اپنی بعثت کے مطابق آپ نے اللہ تعالیٰ کی بتائی ہوئی تمام باتیں بلا کم و کاست لوگوں تک پہنچائیں اور اتنے موثر پیرایہ میں پہنچائیں کہ لوگوں نے نہ صرف انہیں سنا بلکہ اپنی زندگیوں کو انہی تعلیمات کے مطابق تبدیل کر لیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ کردار ایک عظیم ماہر تعلیم کا کردار تھا جس نے ایسی قوم کو جو جہالت کے گھٹا ٹوپ اندھیروں میں بھٹک رہی تھی اپنی محنت لگن اور طریقہ تعلیم سے ایسی سمت رہنمائی کی جہاں انہیں روشنی نصیب ہوئی۔ آپؐ صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ تدریس اتنا موثر اور جامع تھا کہ جس نے ایک بار آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بات سنی اس نے اسے من و عن قبول کر لیا۔

❁ ❁ ❁

باب ۳

تعلیمی اداروں کا قیام

تعلیم گاہ کا تصور

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ابتدائی دور میں موجودہ اسکولوں کالجوں اور یونیورسٹیوں کی طرز پر تعلیمی اداروں کا وجود تو نہیں ملتا البتہ تاریخ عرب میں پہلی بار ایسی واضح علامتیں ضرور ملتی ہیں جن سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اس دور میں تعلیم گاہوں کا وجود تھا۔ رفتہ رفتہ یہی تعلیم گاہیں باقاعدہ تعلیمی اداروں کی حیثیت اختیار کر تی گئیں جواب بھی موجود ہیں بعض محققین حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ابتدائی عہد میں باقاعدہ تعلیمی اداروں Formal Educational Institutions کی موجودگی کی تائید کرتے ہیں اور ان کی موجودگی کا پتہ دینے والے دو واقعات کا حوالہ بھی دیتے ہیں [1] ان میں سے ایک واقعہ انس بن مالک کی والدہ ام سلمہ (یا ام المومنین ام سلمہ رض) سے منسوب ہے جس کے مطابق انہوں نے ایک معلم کتّاب (مکتب کی ابتدائی شکل) سے کتّاب کے بچوں کو اپنے گھر بلوایا تاکہ وہ بچے اون تومنے میں ان کی مدد کریں یہ روایت نہ صرف مکتبوں کی موجودگی بلکہ ان میں باقاعدہ اساتذہ کی تقرری اور گروہی انداز میں بچوں کے تعلیم حاصل کرنے کی شہادت فراہم کرتی ہے۔ دوسرا واقعہ بھی ایک خاتون ہی سے منسوب ہے اس کے مطابق حضرت ام الدرداء نے ایک لوح پر چند نصیحت آموز جملے لکھ کر ایک لڑکے کو سبق کے طور پر دیئے۔ اس روایت سے تعلیم میں خواتین کی دلچسپی کا اندازہ ہوتا ہے اور اس امر کا پتہ بھی چلتا ہے کہ اس دور میں مکتب اور معلم تو موجود تھے ہی قلم اور لوح (تختی یا سلیٹ) کا باقاعدہ استعمال بھی رائج تھا۔ یہ ساری علامتیں محققین کی اس بات کو پایہ ثبوت

---

[1] مشکوٰۃ شریف۔ مترجم جلد اول۔ کتاب العلم۔ صفحہ ۱۹۹

تک پہنچاتی ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں تعلیمی ادارے قائم ہو چکے تھے اور وہاں باقاعدہ درس وتدریس کا عمل جاری تھا اس عمل میں خواتین کی شرکت سے تدریسی عمل کی اہمیت اور ہمہ گیری کا اندازہ بھی ہوتا ہے۔

مندرجہ بالا دو حوالوں کے علاوہ ایک مسلمان محقق ڈاکٹر احمد شلبی نے بھی اسلام کے ابتدائی دور میں مکتبوں کی موجودگی کی تائید کی ہے۔ ان کے خیال میں دو قسم کے مکتب قائم ہوئے تھے، ایک میں قرآن اور مذہبی تعلیمات دی جاتی تھیں جبکہ دوسری قسم کے مکتبوں میں لکھنا پڑھنا سکھایا جاتا تھا۔ کئی اور لوگ بھی اس امر کی تصدیق کرتے ہیں لیکن وہ کتاب کی موجودگی اور ان کے قیام کی واضح تاریخوں اور مقامات کا تعین حضور صلی اللہ وسلم کے بعد کے دور سے کرتے ہیں بہت ممکن ہے

یہ ادارے ابتداً قائم کر دیئے گئے ہوں اور خلافت راشدہ یا اس کے بعد انہیں باقاعدہ اداروں کی صورت میں تسلیم کیا گیا ہو۔ بعض مورخین کے خیال میں مکتب کی یہ دو الگ الگ قسمیں رائج نہیں تھیں بلکہ دینی تعلیم اور لکھنے پڑھنے کی تعلیم سب کام ایک ہی مکتب میں سرانجام دیئے جاتے تھے۔ یہ رائے بھی قرین قیاس معلوم دیتی ہے کہ لکھنے پڑھنے کے کتّاب اساتذہ کے گھروں پر قائم تھے اور جنہیں اس کی ضرورت محسوس ہوتی وہ وہیں جا کر تعلیم حاصل کرتے تھے[1] ان اداروں میں مختلف مضامین کی تدریس یا ان تدریسی مضامین میں معلومات کے حوالے سے مختلف النوع سرگرمیوں کی تصدیق نہیں ہوتی ایسے ادارے یقیناً کچھ عرصہ بعد منظر عام پہ آئے تھے، جن میں کئی مضامین کی تدریس ہوتی تھی۔

باقاعدہ مکتبوں کی عدم موجودگی یا گھروں میں جا کر رسمی تعلیم حاصل کرنے کے مختلف تائیدی اور تردیدی حوالوں سے قطع نظر اگر اس امر کو تسلیم کر لیا جائے کہ عہد نبویؐ کے آغاز میں باقاعدہ تعلیمی ادارے نہیں تھے تب بھی یہ بات ضرور تسلیم کرنی پڑتی ہے کہ بچے گھروں میں پڑھا کرتے تھے۔ مختلف گھروں میں پڑھنے والے یہ بچے حلقوں میں شریک ہو کر پڑھتے تھے جسے موجودہ تعلیمی اصطلاح میں اجتماعی یا گروہی تدریس Collective or group teaching کا نام دیا جا سکتا ہے۔ اسی نوعیت کے حلقوں میں درس حاصل کرنے والے افراد میں حضرت علیؓ اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے نام سب سے نمایاں ہیں جنہوں نے معلم اعظم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے

---

[1] ڈاکٹر احمد شلبی۔ تاریخ تعلیم و تربیت اسلامیہ، مترجم محمد حسین خان زبیری۔ ادارہ ثقافت اسلامیہ، ۱۹۷۳ء

حلقہ درس میں شریک ہو کر تعلیم حاصل کی تھی (تعلیم حاصل کرنے کے لیے کسی گروہ کا حلقہ (دائرہ) بنا کر بیٹھنا مسلمانوں کی تعلیم کے آغاز ہی سے ان میں کلاس کے تصور کو اجاگر کرتا ہے۔ عہد نبوی سے جس نوعیت کی ترتیب سامنے آتی ہے اس میں طالب علم کلاس میں ایک دوسرے کے پیچھے نہیں بلکہ ایک دوسرے کے ساتھ دائرے (Circle _) میں بیٹھتے تھے۔ طالب علموں کی نشست کے اس انداز سے ان میں براہ راست تعلق Face to face relation پیدا ہوتا تھا اور وہ دوران تدریس ایک دوسرے کے تاثرات اور کیفیات کو بہتر طور پر دیکھ سکتے تھے۔ موجودہ کلاس میں یہ تعلق اساتذہ اور طلبہ کے مابین تو موجود ہوتا ہے لیکن مختلف طلبہ کے مابین قائم نہیں رہتا۔ تعلیمی اعتبار سے دوران تدریس طالب علم اور استاد اور طالب علم اور دوسرے طالب علموں کا یہ تعلق بہت ضروری سمجھا جاتا ہے)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ابتدائی عہد میں اگر تعلیمی اداروں کی موجودگی ثابت نہ ہو تب بھی مختلف مساجد اور گھروں کو تعلیم گاہ کی حیثیت سے استعمال کرنے کی تصدیق ضرور ہوتی ہے

تعلیم عام کرنے کا حکم

گذشتہ ایک دو صدیوں سے مغربی دنیا میں ترقی یافتہ اقوام تعلیم کو عام Universal بنانے پر زور دیتی رہی ہیں، اسلام نے تعلیم عام کرنے کا تصور آج سے چودہ سو سال پہلے رائج کیا اور اس سلسلے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ابتدائی اقدامات بھی کئے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے واضح طور پر یہ ارشاد فرمایا تھا کہ لوگ اپنے پڑوسیوں سے تعلیم حاصل کریں۔[۱] یعنی لوگ اپنے پڑوسیوں سے سیکھیں اور ضرورت ہو تو انہیں سکھائیں۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے تعلیم کو عام کرنے کے لیے ایک بہت ہی واضح لائحہ عمل سامنے آتا ہے جس میں تعلیمی اداروں کی عدم موجودگی اساتذہ کی کمی اور دیگر وسائل نہ ہونے کو تعلیم حاصل نہ کرنے کا جواز نہیں بنایا جا سکتا۔ ابتدا میں چونکہ وسائل بہت محدود تھے اس لیے تعلیم کو عام کرنے کے لیے اس سے زیادہ جامع اور کم خرچ کوئی اور طریقہ ممکن نہیں تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم

---

[۱] محمد حمید اللہ۔ عہد نبوی کا نظام حکمرانی۔ مکتبہ ابراہیمیہ، حیدر آباد دکن بار دوم ۱۹۴۹ء صفحات ۲۱۶ - ۲۱۵

کے ابتدائی دور میں تعلیم قرآنی احکامات اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات پر مبنی تھی، ہر مسلمان کے لیے مذہبی اعتبار سے بھی یہ لازمی تھا کہ وہ اپنے دین کے بارے میں جو کچھ جانتا ہے اسے ان لوگوں تک پہنچائے جو اس سے باخبر نہیں ہیں۔ اس مذہبی ذمہ داری نے بھی تعلیم عام کرنے کے اصول کو مزید استحکام بخشا۔ اس دور کے مسلمانوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کے مطابق مذہبی تعلیمات عام کرنے کا سلسلہ شروع کیا اور سیکھنے سکھانے Teaching and learning کا یہ عمل اس حد تک وسعت اختیار کر گیا کہ لوگوں نے ریگستانوں اور چراگاہوں میں بھی یہ کام جاری رکھا۔ لوگ اپنی بکریاں چراتے رہتے اور ایک دوسرے سے معلوم کرتے جاتے بہت سے لوگ دوران سفر ایک دوسرے سے ان تمام باتوں کے بارے میں معلومات حاصل کرتے جاتے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمائی تھیں غرض درس و تدریس کو اس حد تک عام کر دیا گیا کہ لوگ اپنے مختلف کاموں کے دوران علم حاصل کرتے رہتے۔ بلاشبہ اسی باعث اس دور کے صحراؤں اور ریگستانوں اور چراگاہوں نے اوپن یونیورسٹیز Open University کی ہیئت اختیار کر لی تھی۔ ایک مقتدر صحابی حضرت براء بن عازبؓ کہتے تھے کہ ہم لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے تمام حدیثیں نہیں سنیں بلکہ ہمارے دوست احباب انہیں ہم سے بیان کرتے اور ہم اونٹ چرانے میں مشغول انہیں سنتے جاتے تھے۔[1]

حصول علم کے لیے مسلمانوں کا یہ ذوق و شوق ان کی جہانبانی کا سبب بنا۔ اس حقیقت کے باوجود کہ ابتدا میں نہ تعلیمی ادارے عام تھے اور نہ ہی تعلیمی سہولتیں موجود تھیں مسلمانوں نے حصول علم کا سلسلہ جاری رکھا۔ انتہائی غربت اور تنگدستی کے عالم میں زندگی بسر کرنے والے مسلمانوں نے بھی حصول علم کو فوقیت دی اور اس شعبہ میں گراں قدر خدمات سرانجام دیں۔ تعلیمی وسائل سے محروم یہی مسلمان چند برسوں میں اتنا ممتاز مقام حاصل کر گئے کہ جہاں جہاں ان کے قدم پہنچے وہاں تعلیم و تربیت کے اعلیٰ مراکز قائم ہوتے گئے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے فوراً بعد ہی کئی مسند درس و ارشاد قائم ہو چکی تھیں جنہیں تعلیمی اعتبار سے مرکز فضیلت Centre of excellence. سمجھا جاتا تھا۔ یہ مراکز مختلف شہروں میں قائم تھے اور ان کے قیام میں ان اصحاب کی کوششیں شامل تھیں جنہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم

---

[1] محمد طفیل: نقوش "رسول نمبر" ۔ جلد چہارم ادارہ فروغ اردو ۔ لاہور ۔ ۱۹۸۳ء

سے تعلیم حاصل کی تھی۔ ان اداروں سے ایسے افراد وابستہ تھے جنہیں درس و تدریس کا وسیع تجربہ حاصل تھا۔ ان لوگوں کو آج بھی نہ صرف عالم اسلام بلکہ پوری دنیا کے عظیم ماہرین تعلیم کی صف میں شامل کیا جاتا ہے۔ مختلف حوالوں سے درس وارشاد کی ایسی سات مسندوں کا ثبوت ملتا ہے۔ جن شہروں میں یہ مسندیں قائم تھیں اور جو اساتذہ ان کے نگران اور منتظم تھے۔ ان کی تفصیل مندرجہ ذیل ہے۔[1]

۱۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ ——— مدینہ

۲۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ ——— مکہ

۳۔ حضرت معاذ بن جبلؓ ——— یمن

۴۔ حضرت ابوموسیٰ اشعری ——— بصرہ

۵۔ حضرت عبداللہ بن صامتؓ اور
حضرت ابوالدرداءؓ ——— شام

۶۔ عبداللہؓ بن عمرو بن العاص ——— مصر

۷۔ حضرت عبداللہ بن مسعود ——— کوفہ

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حصول علم اور اشاعت علم دونوں امور کو کچھ اس طرح ایک دوسرے سے مربوط کر دیا کہ علم کی روشنی ایک جگہ سے دوسری جگہ تک پہنچتی رہی۔ یہی وہ بنیادی اصول تھا جس نے حصول علم کے معاملے میں امیر اور غریب کی تفریق بھی ختم کر دی تھی اور عرب جیسی وحشی اور غیر متمدن قوم کو چند ہی برسوں میں مہذب اقوام کی صف میں کھڑا کر دیا تھا۔

مکے میں مسلمانوں کی پہلی درسگاہ

مکہ حضور کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا وطن مولد تھا اور آپؐ نے یہیں سے تبلیغ اسلام کا آغاز کیا اس سلسلے میں سب سے پہلا درس دار ارقمؓ میں دیا گیا۔[2] اسی مناسبت سے دار ارقم

---

[1] ڈاکٹر احمد شلبی؛ تاریخ تعلیم و تربیت اسلامیہ؛ مترجم محمد حسین خان زبیری۔ ادارہ ثقافت اسلامیہ۔ لاہور سنہ ۱۹۶۳ء، ص ۱۴۷

[2] ڈاکٹر حسن ابراہیم حسن؛ کتاب اعلام الاسلام؛ مترجم سید معین الحق مشاہیر اسلام، پاکستان ہسٹاریکل۔ سائٹی۔ کراچی سنہ ۱۹۵۵ء، ص ۸۱

کو تعلیمات اسلامی کا سب سے پہلا مرکز ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ یہ مکان مکے کے نواحی علاقے میں کوہِ صفا پر واقع تھا اور ابتدائی دور کے ایک مسلمان صحابی حضرت ابن ابی الارقم کی ملکیت تھا انہی سے منسوب ہونے کی وجہ سے اسے دارارقم رضؓ کہا جاتا ہے۔ درس و تدریس کا سلسلہ اس مکان میں تین سال تک جاری رہا۔ چھٹے نبوی سال کے آخر تک تبلیغ کے لیے مسلمانوں کے چھوٹے بڑے گروہ اسی مکان میں جمع ہوتے تھے اور یہاں معلم اعظم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم انہیں تعلیم دیتے تھے دارارقم رضؓ کے علاوہ مکے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ام المومنین حضرت خدیجہ کے مکان داب الحجر کو بھی تعلیم کا مرکز بنایا تھا۔ یہ مکان چونکہ گھر کے طور پر استعمال ہوتا تھا اور براہ راست حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے تصرف میں تھا اس لیے اسے تعلیم گاہ کی حیثیت سے وہ مقام حاصل نہیں تھا جو دارارقم کو حاصل ہوا۔ بہت سے محققین مکے کی اس درسگاہ کو مسلمانوں کی سب سے پہلی درسگاہ بھی قرار دیتے ہیں۔ حضورؐ صلی اللہ علیہ وسلم نے بعد میں دارارقم رضؓ کے بعد بھی تدریس کا سلسلہ جاری رکھا اور جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اصحاب کے ساتھ شعب ابی طالب میں محصور ہوئے تب بھی یہ عمل جاری رہا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ساتویں نبوی سال سے دسویں نبوی سال تک شعب ابی طالب میں بھی رشد و ہدایت کی شمع روشن رکھی[۱]

دارارقم رضؓ کی پہلی درسگاہ میں تعلیم حاصل کرنے والے بیشتر صحابی خود بھی معلم بنے اور اس طرح اس پہلے گروہ Batch کو دوسروں کو تعلیم دینے پر مامور کیا گیا۔ اسی درسگاہ میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد حضرت خباب بن الارت رضؓ نے اسلام قبول کیا تھا اور پھر خود لوگوں کو اسلام کی تعلیم دینی شروع کر دی تھی۔ آپ کی تعلیم کے نتیجے میں حضرت عمر فاروق رضؓ کی ہمشیرہ حضرت فاطمہ بنت خطاب رضؓ اور ان کے شوہر نے بھی اسلام قبول کیا تھا۔ حضرت فاروق رضؓ قبول اسلام سے پہلے جب طیش کے عالم میں حضورؐ کو قتل کرنے کے ارادے سے نکلے تو لوگوں نے انہیں بہن بہنوئی کے مسلمان ہونے کی خبر سنا کر مزید اشتعال دلایا تھا۔ آپ غصے میں جب اپنی بہن کے گھر میں داخل ہوئے اس وقت بھی حضرت خباب بن الارتؓ وہاں تعلیم دے رہے تھے۔

اسلام کے ابتدائی دور میں کئی مثالیں ملتی ہیں جن سے یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچتی ہے کہ لوگوں نے اشاعت علم کے لیے اپنے ذاتی مکانات وقف کر دیئے تھے یہ سلسلہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم

---

[۱] محمد طفیل: نقوش رسول نمبر۔ جلد چہارم۔ ادارہ فروغ اردو۔ لاہور۔ صفحہ ۸۳، ۱۹۸۳ء

کے وصال کے بعد بھی جاری رہا۔ ذاتی مکانات کو تعلیم و تدریس خصوصاً اشاعت اسلام کے لیے وقف
کی یہ روایت آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں مدینہ تک پہنچی اور وہاں بھی لوگوں نے اس پر
عمل کرنا شروع کیا۔ مدینے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے بھیجے گئے پہلے مسلمان معلم
حضرت مصعب بن زبیرؓ کو مدینے کے ابوامامہ اسید بن زرارہ نے اپنا مکان اسی مقصد کے لیے
خالی کر کے دے دیا۔ ہجرت کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم خود مدینہ تشریف لائے تو حضرت
ابوایوب انصاریؓ کے مکان پر قیام فرمایا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ابتدائی آٹھ نو ماہ تک
اسی مکان میں لوگوں کو تعلیم دینے کا سلسلہ رکھا (محمد حفیظ اللہ پھلواروی)[۱] اپنے مکانات کو
تعلیم و تبلیغ کے لیے مختص کرنے کی اس روایت کا بعض مورخین یہ سبب بتاتے ہیں کہ آغاز میں علانیہ
دعوت اسلام نہیں دی جا رہی تھی اس لیے پبلک مقامات کے بجائے گھروں کا انتخاب کیا گیا
جیسے جیسے مسلمانوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا اور زیادہ لوگ اس میں شامل ہوتے گئے مسلمانوں
نے مساجد قائم کیں اور اس طرح غیر منظم انداز سے ہونے والی درس و تدریس نے تنظیم کے تحت
کام کرنا شروع کر دیا گھروں میں قائم ہونے والی تعلیم گاہوں کے بارے میں یہ بات درست
مان لی جائے تب بھی اسے واحد سبب قرار نہیں دیا جا سکتا۔ یقیناً اس عہد کے بہت سے
مسلمانوں نے یہ قدم کسی خوف یا دباؤ کے تحت نہیں بلکہ اسلام سے عقیدت اور اس کی تعلیمات
سے فیض یاب ہونے کے لیے کیا تھا۔

باقاعدہ تعلیمی ادارے کا قیام

مسلمانوں کے پہلے باقاعدہ تعلیمی ادارے کا قیام مسجد نبوی کی تعمیر سے ہوا۔ یہ مسجد حضور
صلی اللہ علیہ وسلم کی نگرانی میں سن ہجری کے آغاز میں تعمیر ہوئی تھی اور آج بھی مدینے میں موجود
ہے۔ اس مسجد سے ملحق چبوترے (صفہ) کو بہت زیادہ شہرت حاصل ہوئی کیونکہ تعلیمی اعتبار سے
مسجد نبویؐ کو پہلی باقاعدہ درسگاہ اور اصحاب صفہ پر مشتمل طالبان علم صحابہ کرام کو مسلمان طلبا کی پہلی
جماعت تصور کیا جاتا ہے۔ ابتدا میں اصحاب صفہ کی تعداد کا تعین نہیں کیا جا سکتا ہوتا یوں تھا کہ
جن لوگوں کو وقت ملتا یا جو لوگ کچھ جاننا چاہتے تھے وہ وہاں سیکھنے کے لیے جمع ہو جاتے تھے۔ اکثر

---

[۱] ایضاً

لوگ وہاں ایک مجمع کی شکل اختیار کر لیتے تھے جن کی تعداد بعض اوقات سو تک پہنچ جاتی تھی[1] مسجد نبوی کے صحن میں قائم ہونے والی اس اولین درسگاہ کے سب سے بڑے معلم آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم خود تھے یہاں لوگوں کو اسلامی تعلیمات کے علاوہ دوسرے علوم و فنون کی تعلیم بھی دی جاتی تھی۔ اکثر و بیشتر دور دراز مقامات سے آنے والے افراد یہیں قیام کرتے اور مختلف مسائل کے بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور دوسرے اساتذہ سے معلومات حاصل کرتے تھے مسجد نبوی کے اساتذہ میں ایک معتبر نام حضرت عبداللہ بن سعیدؓ بن العاص کا تھا جو طالب علموں کو لکھنا اور پڑھنا سکھاتے تھے۔ آپ کا اصل نام الحکم تھا اور عبداللہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تجویز کیا تھا[2] ان کے علاوہ مسجد نبوی میں حضرت عبادہ بن الصامتؓ بھی درس دیتے تھے۔ آپ کو خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مقرر فرمایا تھا اور آپ لوگوں کو قرآن کی تعلیم کے ساتھ ساتھ لکھنے کی تربیت بھی دیتے تھے[3] ان دو اساتذہ کے علاوہ مسجد نبوی میں درس دینے کا اعزاز حضرت جابر بن عبد اللہؓ اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ کو بھی حاصل رہا۔ یہ دونوں اساتذہ مختلف علوم و فنون کی الگ الگ تعلیم دیتے تھے[4] مسجد نبوی کی اس پہلی باقاعدہ درسگاہ سے وابستہ اساتذہ میں حضرت ابن مکتومؓ کا نام بھی شامل ہے۔ آپ نابینا تھے اور مدینہ ہجرت کرنے کے بعد مسجد نبوی میں لوگوں کو قرآت سکھایا کرتے تھے آپ نے زندگی میں تیرہ بار حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نیابت کے فرائض سر انجام دیئے جن میں مسجد نبویؐ میں امامت کا فریضہ بھی شامل ہے آپ نے قرآن پاک حفظ کر لیا تھا اور بحیثیت معلم آپ کے لیے یہ بہت بڑا اعزاز تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نیابت سے سرفراز ہوئے مدینہ میں حضور کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت سعید بن العاصؓ کو بھی تدریسی فرائض سونپے تھے یہ بہت بڑے خوشنویس تھے اس لیے ان کے ذمہ یہ کام لگایا گیا کہ وہ لوگوں کو لکھنے پڑھنے کی تعلیم دیں[5]

---

[1] سید سلیمان ندوی؛ سیرۃ النبیؐ۔ جلد چہارم۔ قرآن لمیٹڈ۔ لاہور، ۱۳۹۵ھ ص ۳۰۵

[2] حبیب الرحمٰن شیروانی؛ علمائے سلف و نابینا علماء (تعلیقات و حواشی، مفتی انتظام اللہ شہابی) اکیڈمی آف ہسٹوریکل ریسرچ۔ طبع اول۔ کراچی۔ ۱۹۶۱ء صفحہ ۲۰

[3] محمد حمید اللہ؛ عہد نبوی کا نظام حکمرانی (جلد اول) مکتبہ ابراہیمیہ حیدرآباد دکن۔ بار دوم ۱۹۳۹ء صفحہ ۲۰۲

[4] حبیب الرحمٰن شیروانی۔ علمائے سلف و نابینا علما

[5] محمد حمید اللہ۔ عہد نبوی کا نظام حکمرانی صفحہ ۲۶

مسجد نبوی کے کئی مقتدر اساتذہ کرام کے اسماءِ گرامی اور ان مضامین کے سرسری تذکرہ سے جو وہ پڑھایا کرتے تھے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی یہ پہلی درسگاہ ایک باقاعدہ تعلیمی ادارے کی حیثیت رکھتی تھی۔ اس تعلیمی ادارے میں عام لوگوں کو قرآن اور قرآنی تعلیمات کے ساتھ فقہ اور فن تجوید کی تعلیم بھی دی جاتی تھی۔ یہاں لوگوں کو پڑھنے اور لکھنے Reading and writing کی تعلیم بھی دی جاتی تھی۔ مختلف مضامین کی تدریس کے لیے مختلف ماہر افراد کو بحیثیت اساتذہ مقرر کیا گیا تھا اور ان سب کی سرپرستی اور نگرانی حضور صلی اللہ علیہ وسلم خود کرتے تھے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو صدر مدرس کی حیثیت حاصل تھی اور جب کبھی ضروری ہوتا اساتذہ اور طالب علم حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے رجوع کرتے تھے۔ مسجد نبوی ؐ میں کام کرنے والے اس تعلیمی ادارے میں اکثر طالب علم حصول علم کے لیے دور دراز علاقوں سے آتے تھے اور معلومات حاصل کرنے کے بعد اپنے علاقوں کو واپس چلے جاتے تھے انہیں وقتی طالب علم casual students کی حیثیت حاصل تھی۔ نادار طلبہ کے لیے مسجد نبوی ؐ کو اقامتی تعلیمی ادارے Residential Educational Institution کی حیثیت بھی حاصل رہی اس میں دور دراز کے بہت سے لوگ رہا کرتے تھے اور انہیں رہائش کی سہولت کے ساتھ ساتھ کھانا بھی فراہم کیا جاتا تھا۔ اکثر و بیشتر صفہ سے وابستہ ایسے طلباء کے لیے شام کے کھانے کا انتظام حضرت سعد بن عبادہ رضؓ اپنے پاس سے کیا کرتے تھے۔ آپ کے اس عمل سے عام لوگوں کی طرف سے تعلیمی اداروں کی سرپرستی خصوصاً نادار طلبہ کے لیے سہولتوں کی فراہمی کی تصدیق ہوتی ہے [1]

مسلمانوں کی اس اولین درسگاہ کے نظام کا مختصر جائزہ بھی یہ بات ثابت کرنے کے لیے کافی ہے کہ اس ادارہ کو جدید تعلیمی اداروں کے لیے رہنما ادارے کی حیثیت حاصل تھی۔ اس کے بعد مسلمانوں نے تعلیمی اداروں کی تعداد میں اضافہ کرنا شروع کیا ان نئے اداروں کے تعلیمی نظام میں بھی انہی تمام خصوصیات کو مرکز بنایا گیا جو مسجد نبوی کا طرہ امتیاز تھیں۔

---

[1] حبیب الرحمن شیروانی:۔ علمائے سلف و نابینا علما (تعلیقات و حواشی۔ مفتی انتظام اللہ شہابی۔ اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ۔ طبع اول۔ کراچی۔ ۱۹۶۱ء صفحہ ۲۱

نو مساجد میں درس و تدریس

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں جتنے تعلیمی ادارے قائم ہوئے وہ سب مختلف مساجد سے متصل تھے۔ بلکہ مساجد ہی کو تعلیمی ادارے کی حیثیت دے دی گئی تھی۔ مسجد نبوی میں درس و تدریس کا سلسلہ شروع ہونے کے بعد رفتہ رفتہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کئی اور مقامات پر ایسے ادارے قائم کرنے شروع کیے۔ مختلف حوالوں سے ایسی نو مساجد کی تصدیق ہوتی ہے جنہیں تعلیمی مقاصد کے لیے استعمال کیا جاتا تھا[1] یہ مساجد ایک دوسرے سے تھوڑے فاصلے پر قائم تھیں اس طرح ہر مسجد کے گرد و نواح میں رہنے والوں کے لیے اسلامی تعلیمات اور درس و تدریس کی ضروریات انہی سے پوری ہوتی تھیں۔ ابتدائی دور میں قائم ہونے والی ان مساجد کے نام یہ ہیں۔[2]

۱۔ مسجد بنی عمرو بن مبذول	۲۔ مسجد بنی ساعدۃ
۳۔ مسجد بنی عبید	۴۔ مسجد بنی سلمۃ
۵۔ مسجد بنی زریق	۶۔ مسجد غفار
۷۔ مسجد اسلم	۸۔ مسجد جھینۃ اور
۹۔ مسجد بنی رائج بن عبد الاشھل	

جیسا کہ ان مساجد کے ناموں سے عیاں ہے ان کا تعلق مختلف عرب خاندانوں اور ان کے علاقوں سے تھا اس طرح کم و بیش تمام ہی لوگوں کے لیے ان میں تعلیم حاصل کرنے کے مواقع فراہم کر دیئے گئے تھے۔ یہ سلسلہ روز افزوں بڑھتا گیا اور کئی ایسے مدرسے بھی قائم ہوئے جنہیں انصار مدینہ نے تعمیر کیا۔ ان اداروں میں درس و تدریس کے فرائض بھی انصار ہی سرانجام دیتے تھے[3] بدقسمتی سے ان اداروں کے ناموں کا پتہ نہیں چلتا اس لیے یہی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ یہ ادارے بھی مختلف مساجد میں قائم کیے گئے ہوں گے۔ کیونکہ مسلمانوں نے ابتدا ہی سے مساجد اور درسگاہ میں تفریق نہیں رکھی تھی۔ اس لیے عبادت اور تعلیم دونوں میں قریبی تعلق ابتدا ہی سے مضبوط ہوتا چلا گیا۔ اس تعلق

---

[1] محمد حمید اللہ: عہد نبوی کا نظام حکمرانی (جلد اول) مکتبہ ابراہیمیہ حیدر آباد دکن۔ بار دوم ۱۹۴۶ء صفحات ۲۱۶ - ۲۱۵

[2] ابو داؤد کتاب المرسل۔ عینی شرح بخاری جلد دوم

[3] مولانا سعید انصاری: سیر الانصار۔ (حصہ اول و دوم) دار المصنفین اعظم گڑھ طبع دوم ۱۹۴۸ء صفحہ ۲۱۱

کی وجہ سے مسلمانوں میں تعلیمی اداروں کی کمی کا مسئلہ سامنے نہیں آیا اور تعلیم کو عام کرنے کا عمل بھی اسی رفتار سے جاری رہا۔

مسجد بحیثیت درسگاہ

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں لاتعداد شواہد ملتے ہیں کہ مساجد کو تعلیمی مقاصد کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ مسجد نبویؐ سے لے کر نو اہم مساجد تک کے حوالوں سے اس بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ آنحضورؐ نے تعلیمی اداروں اور مذہبی اداروں کو ایک دوسرے سے الگ نہیں ہونے دیا۔ مساجد کو درسگاہ کا درجہ دینے سے مسلمانوں کے ابتدائی عہد میں ایک تو تعلیم کی تقدیس اور اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے دوسرے اس امر کی نشاندہی بھی ہوتی ہے کہ تعلیم کو عام کرنے اور اس میں اضافے کے لیے تعلیمی اداروں کی کمی کا مسئلہ بھی حل ہو جاتا ہے۔ مساجد بیک وقت دو مقاصد پورے کرتی تھیں وہ اسلامی عبادات کے مراکز بھی تھیں اور ان سے تعلیم کی توسیع Extension کا کام بھی لیا جاتا تھا۔

مدینے میں مسجد نبویؐ اور اس کے نواح میں دیگر نو مساجد کی تعمیر اور وہاں درس و تدریس کے علاوہ کئی مساجد اور بھی قائم کی گئی تھیں ان میں سے ایک مسجد اس وقت قائم ہوئی تھی جب حضرت مصعب بن زبیرؓ کو مکے سے مدینے روانہ کیا گیا تھا۔ آپ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اس غرض سے مدینے بھیجا کہ وہاں جا کر لوگوں کو اسلام کی تعلیم دیں۔ ان کے ایما پر مدینے کے لوگوں نے قبیلہ بیندت کی نشیبی زمین پر ایک مسجد تعمیر کی تھی[۱]۔ مدینے کی مسجد بنی زریق کے بارے میں مشہور ہے کہ یہ وہاں کی سب سے پہلی مسجد تھی جہاں قرآن پڑھا گیا۔ مدینے میں ایک اور درسگاہ کے قیام کا ثبوت ملتا ہے۔ بلاذری کے مطابق یہ درسگاہ دارالقرّیٰ کے نام سے مشہور ہوئی اور اس کا قیام سنہ ۲ ہجری میں ہوا۔ ابتدائی دور کی ان مساجد کے علاوہ صرف تبوک اور مدینے کے درمیانی علاقے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں ہی سترہ مساجد قائم ہو چکی تھیں۔ اس دور کی روایت کے مطابق ان مساجد میں روزمرہ عبادات کے ساتھ ساتھ لوگوں کو تعلیم دینے کا سلسلہ بھی جاری ہوا۔ ان سترہ مساجد کی تفصیل کچھ اس طرح ہے[۲]

---

[۱] ایضاً صفحہ ۸۴

[۲] محمد بن ہشام (سیرۃ ابن ہشام) مترجم شیخ محمد اسماعیل۔ مقبول اکیڈمی لاہور۔ سنہ ۱۹۶۱ صفحہ ۵۴۲

۱۔ مسجد تبوک	۲۔ مسجد ثنیۃ مداران	۳۔ ذات الذراب
۴۔ مقام اخضر	۵۔ ذات الخطمی	۶۔ مقام بالا
۷۔ بتراء	۸۔ شق تارا	۹۔ ذی الجیفہ
۱۰۔ حجر	۱۱۔ صدر حوضی	۱۲۔ صعید
۱۳۔ وادی القریٰ	۱۴۔ مقام رقعہ	۱۵۔ ذی مروہ
۱۶۔ فیفا	۱۷۔ ذی خشب	

مندرجہ بالا سترہ مساجد بہت ہی معروف مساجد تھیں اور جیسا کہ پہلے بتایا گیا ہے۔ یہ سب مدینے اور تبوک کے درمیان قائم تھیں۔ یقیناً دوسری سمتوں میں اسی نوعیت کی مساجد تعمیر کی گئی ہوں گی جن کی تفصیلات دستیاب نہیں ہیں۔ اندازہ ہے کہ عہد نبویؐ ہی میں مساجد اور ان سے وابستہ تعلیمی اداروں کی تعداد میں اچھا خاصا اضافہ ہو چکا تھا ان اداروں کا قیام وہاں کے رہنے والوں کی کوششوں کا نتیجہ تھا اور ان میں تعلیم و تدریس کی نگرانی آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم بذات خود فرماتے تھے۔ غرض ایک دو نہیں بلکہ سینکڑوں حوالے ملتے ہیں جن سے یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچتی ہے کہ مسلمانوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد ہی سے مساجد کو درسگاہ کی حیثیت سے استعمال کرنا شروع کیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں ایسی مساجد بڑی تعداد میں قائم کی جا چکی تھیں۔

باب ۴

حضور صلی اللہ علیہ وسلم بحیثیت معلم

وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۚ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ۚ (الحشر پ - ۲۸) (۵۹-۷)

اور رسولِ کریم جو تمہیں عطا فرماویں وہ لے لو اور جس سے تمہیں روکیں تو رک جاؤ۔

انبیاء کرام کی بعثت کا مقصد

اللہ تعالیٰ نے ہر دور میں انسانوں کی تعلیم و تربیت کے لیے انبیا ء کرام مبعوث کیے تھے دنیا کا کوئی علاقہ یا قوم ایسی نہیں جہاں رہنے والوں کی فلاح و بہبود کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول نہ بھیجے ہوں۔ ان سب نے مختلف ادوار اور مختلف علاقوں میں لوگوں کو حق کا راستہ دکھایا اور ان تمام باتوں اور احکامات سے باخبر کیا جو اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے لیے لازمی قرار دیئے تھے۔ بالفاظ دیگر تمام انبیا کرام انسانوں کو اس نصاب کے مطابق درس دیتے رہے جو انفرادی اور اجتماعی زندگی گزارنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے مقرر کیا تھا۔ انبیاء کرام کو اس خصوصی ذمہ داری کی وجہ سے عام لوگوں پر برتری حاصل تھی کیونکہ انہی کے ذریعہ مختلف ادوار میں انسانی فلاح و بہبود کا درس رائج ہوا تھا۔ خداوند تعالیٰ نے کسی بھی دور میں کسی بھی خطے کے لوگوں یا قوموں کو اس نعمت سے محروم نہیں رکھا تھا (جسے علم کہا جاتا ہے) یہ دولت جن برگزیدہ ہستیوں کے ذریعے عام کی گئی وہی رسول اور پیغمبر قرار دیئے گئے۔

کائنات میں انسانوں کو دوسری تمام مخلوق میں افضل قرار دینا بھی اسلام ہی کی تعلیمات کا نتیجہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو افضل قرار دینے کے لیے اسے دولت علم عطا کی اور اس طرح اسے دوسری تمام مخلوقات سے منفرد مقام عطا کیا۔ دنیا کے سب سے پہلے انسان حضرت آدمؑ بھی اسی علم کی بدولت دنیا کی ساری مخلوق سے محترم قرار دیئے گئے۔

وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا   اور اللہ نے سکھا دیئے آدم کو تمام اشیاء کے نام

حضرت آدمؑ کے بعد بھی علم کا یہ سلسلہ جاری رہا اور مختلف انبیاء کرام کو ان کے عہد اور علاقے کی مناسبت سے مختلف اشیاء کا علم عطا کیا گیا۔ حضرت خضرؑ فراست میں یکتا تھے۔ حضرت داؤدؑ صنعت و حرفت کے بہت بڑے ماہر تھے حضرت یوسفؑ کو تعبیر خواب کے علم سے نوازا گیا تھا اسی طرح تمام انبیاء کرام کو علم کے معاملے میں تمام انسانوں سے برتر بنا دیا گیا۔ انہیں اشرف المخلوقات میں مزید شرف اور مرتبہ اسی لیے دیا گیا کہ ان کے ذریعہ عام لوگوں کی تعلیم و تربیت کا عمل پایہ تکمیل تک پہنچایا جائے۔ اس طرح تمام مخلوقات میں انسان اور تمام انسانوں میں انبیاء کرام سب سے افضل قرار دیئے گئے۔ نبی آخر الزماں حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم تمام انبیاء کرام میں منفرد اور ممتاز حیثیت کے حامل تھے اس کا ایک سبب تو یہی تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی اور نبی کو مبعوث کرنے کا سلسلہ بند کر دیا گیا اسی لیے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو علم و حکمت کے ضمن میں بھی دوسرے انبیاء کرام سے زیادہ عطا کیا گیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے وہ تمام باتیں سکھائیں جن کی ضرورت پڑ سکتی تھی اور جو آپؐ نہیں جانتے تھے۔ اس طرح علم کے حوالے سے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو سب سے زیادہ افضل مقام حاصل ہوا۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو تمام علم کی معلومات اور تمام پہلوؤں پر دسترس دینے کا بنیادی سبب یہی تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہر اعتبار سے مکمل بنا دیا جائے تاکہ عام لوگوں کے سکھانے اور سمجھانے کے عمل میں کسی قسم کی کمی باقی نہ رہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس طرح دنیا کی افضل ترین شخصیت قرار پائے، جنہوں نے اپنے عمل سے یہ ثابت کر دیا کہ ان فرائض کی ادائیگی جو اللہ تعالیٰ نے آپؐ کے ذمہ کیئے تھے اس سے زیادہ بہتر انداز سے نہیں کی جا سکتی تھی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو کس طرح تعلیم دی اس کی تفصیلات تو آئندہ صفحات میں زیر بحث لائی جائیں گی لیکن اس مرحلے پر یہ بات قابل غور ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسرے انبیاء کرام کی طرح عام لوگوں کو ان کے فرائض اور اختیارات سے باخبر کیا اور چونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تمام انبیاء کرام میں سب سے زیادہ منفرد اور ممتاز حیثیت رکھتے تھے اس لیے آنحضورؐ نے یہ فریضہ بھی اسی انفرادیت اور امتیازی حیثیت سے سرانجام دیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے فریضۂ منصبی کی وضاحت کرتے ہوئے خود بھی ارشاد فرمایا کہ (حدیث)

انما بعثت معلما۔ بے شک میں معلم مبعوث کیا گیا ہوں۔

Perfect

لوگوں کو علم دینا ہی وہ فریضہ تھا جس کے لیے تمام انبیا اکرام مبعوث کیے گئے تھے ان تمام معلمین میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو مثالی معلم کی حیثیت حاصل تھی۔ معلم کی سب سے بڑی شناخت اس کا علم ہی ہوتا ہے جسے وہ دوسروں تک بحسن وخوبی منتقل کرتا ہے۔ اسی کے ذریعہ وہ دوسروں کو احکام خداوندی پر عمل کرنے کی ترغیب دیتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ اس کی مدد سے وہ انسانوں کو اپنے مسائل حل کرنے کی صلاحیت فراہم کرتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی علم ہی کو اپنی سب سے بڑی شناخت کہا کرتے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک موقع پر واضح طور پر ارشاد فرمایا کہ

العلم سلاحی   علم میرا ہتھیار ہے (حدیث)

عربوں جیسے زور آور قبائل میں جہاں معمولی بات پر زور آزمائی اور جنگوں کا سلسلہ صدیوں تک جاری رہتا تھا جہاں ابتدا ہی سے شمشیر زنی اور نیزہ بازی کو مرد تو مرد عورتیں بھی اس لیے سیکھتی تھیں کہ دوسرے قبائل کو مرعوب کیا جا سکے۔ ایسے معاشرے میں جہاں دولت اور طاقت ہی کو سرمایہ افتخار سمجھا جاتا تھا وہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام باتوں کو نظر انداز کر کے علم کو اپنا ہتھیار کہا اور اس طرح علم کو ان تمام دنیاوی اوصاف سے بالا اور برتر ظاہر کیا جن پر اہل عرب فخر کیا کرتے تھے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو جو علم عطا ہوا تھا، آپؐ نے اسے دوسروں تک بھی منتقل کیا اور اس طرح نہ صرف اللہ تعالیٰ کے احکامات کی حرف بہ حرف پیروی کی بلکہ جہالت سے نجات حاصل کرنے میں لوگوں کی معاونت فرمائی

آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے براہ راست ہزاروں افراد نے علم حاصل کیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے قول وفعل خصوصاً اعلیٰ اور جامع انداز تدریس سے لوگوں کے لیے حصول علم کو آسان بنا دیا۔ اس طرح لوگوں کے لیے ایک مثال قائم کر دی۔ صحابہ کی بڑی تعداد ایسی تھی جس نے براہ راست حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کسب فیض کیا اور پھر دنیا کے عظیم معلم کے ان شاگردوں نے بھی اپنا [illegible] دوسروں تک منتقل کیا، ایک ممتاز ماہر تعلیم صحابی حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے ستر

سورتیں خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سیکھیں لے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ ابن ابو طالب کو بھی براہ راست تعلیم دی۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے تعلیم حاصل کرنے والوں میں صحابہ کرام کی ایک بڑی تعداد شامل تھی۔ ان سب نے آپؐ کی تقلید میں خود بھی حصول علم کے بعد اشاعت علم کا عمل جاری رکھا۔ یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی تربیت کا اثر تھا کہ ان مسلمانوں نے تبلیغ و اشاعت کے ایسے مثالی طریقے رائج کئے جنہیں موجودہ دور کے طریقہ ہائے تدریس میں نمایاں مقام حاصل ہے۔

غزوۂ بدر کے قیدی

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اشاعت علم کا فریضہ جس خوش اسلوبی سے سرانجام دیا اس نے مسلمانوں میں تبلیغ اسلام کے ساتھ ساتھ علم و فن کے مختلف شعبوں میں مہارت پیدا کی۔ آنحضور حصول علم اور اشاعت علم پر خود بھی کاربند رہے اور دوسروں کو بھی اسی کام کی ترغیب دی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے علم کے فروغ کے لیے جو اقدامات فرمائے ان میں ایک اہم واقعہ ان قیدیوں کا ہے جو کفر و اسلام کے پہلے معرکہ بدر میں مسلمانوں کی قید میں آگئے۔ اس دور کی عرب روایت کے مطابق ان لوگوں کو جو قید ہو جائیں قتل کر دیا جاتا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سلسلہ میں ان قیدیوں کے لیے جو پڑھنا لکھنا جانتے تھے ایک منفرد فیصلہ فرمایا۔ ایسے قیدی جو صاحب حیثیت تھے انہیں چار ہزار درھم کے تاوان کی ادائیگی پر رہائی دے دی گئی اور وہ نادار قیدی جو اپنے اپنے قبیلوں کے ساتھ مسلمانوں کو صفحہ ہستی سے مٹانے کے لیے غزوہ بدر میں لڑنے آئے تھے ان میں سے پڑھے لکھے قیدیوں کو الگ کر لیا گیا۔ ان کے بارے میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ وہ مسلمانوں کے بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھائیں اور اس کام کے معاوضہ میں ان کی جان بخش دی جائے گی۔ رحمت العالمین حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فیصلہ صلہ رحمی کے ساتھ ساتھ علم اور اشاعت علم کی ایک منفرد مثال بھی ہے کہ مسلمانوں کو لکھنا پڑھنا سکھانے کے لیے ان لوگوں سے بھی مدد لی گئی جو اسلام کے بدترین دشمن تھے۔ یہ حصول علم اور اکتساب علم کا وہ عظیم نمونہ تھا جس کی بنیاد خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے رکھی۔ اسیران بدر سے سیکھنے والوں

لے امیر الہدیٰ: مسلمانوں کے علمی و ثقافتی کارنامے۔ قمر کتاب گھر۔ کراچی صفحہ ۲۰

میں کئی مقتدر صحابہ کرام بھی شامل تھے۔ خود حضرت زید بن حارث ؓ نے لکھنا پڑھنا انہی لوگوں سے سیکھا۔[1] بعض مورخین کے مطابق ایک قیدی کی تحویل میں دس طالب علم اور بعض کی تحقیق کے مطابق بارہ طالب علم دیئے گئے۔[2] خوشنویسی کی اس تربیت کے دوران کفار مکہ نے مسلمانوں کو جو خط لکھنا سکھایا وہ خط کوفی کے نام سے موسوم تھا۔ بعد میں مسلمانوں نے اس خط میں خود بھی کئی نئی اختراعات کیں اور ان لوگوں میں ابوالاسود دوئلی اور ان کے تلامذہ نے گراں قدر کام کیے۔ ابوالاسود دوئلی کا انتقال ۶۹ھ کو ہوا۔[3]

غیر مسلموں سے علم حاصل کرنے کی یہ ایک واضح مثال تھی۔ حصول علم میں معاونت کرنے والی ان دو بنیادی مہارتوں Reading and writing کی اس مثال سے یہ غلط فہمی پیدا نہیں ہونی چاہیے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں بدر کے قیدیوں نے مسلمانوں کو دیگر مضامین کی تعلیم بھی دی تھی۔ لکھنے کے دوران آیات قرآنی کو بطور عبارت نہیں لکھا جاتا تھا بلکہ زبان کے عام الفاظ اور جملوں کو لکھنے کی مشق کرائی جاتی تھی۔ بدر کے ان قیدیوں کے علاوہ کئی ذمی بھی اس کام پہ مامور تھے۔ لیکن ان میں سے کسی نے بھی مسلمانوں کو مذہبی یا اخلاقی مضامین کی تعلیم نہیں دی۔ تدریس کا یہ کام بھی ان سے اس لیے لیا گیا تھا کہ یہ اس وقت کے مسلمانوں کی اشد ضرورت تھی۔ مذہبی تعلیم کے لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام کو مامور کیا تھا یا خود اس کام کی نگرانی فرماتے تھے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ابتدائی دور میں جہاں غیر مسلموں سے اکتساب علم کی تصدیق ہوتی ہے وہیں اس امر کا ثبوت بھی ملتا ہے کہ تعلیم میں مختلف مضامین کی تخصیص موجود تھی اور اسی مناسبت سے مضامین کے لئے الگ الگ صلاحیتیں رکھنے والے افراد کو بحیثیت اساتذہ مامور کیا جاتا تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دور کی ان مثالوں سے اس بات کی سند ملتی ہے کہ حصول علم کے لیے دوسروں سے استفادہ کیا جا سکتا ہے لیکن ایسے مضامین جن کا تعلق مذہب سے ہو ان کے لیے خالصتاً اسی مذہب

---

[1] محمد حسین خان زبیری: مشاہیر کے تعلیمی نظریئے طبع ثانی۔ آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کراچی۔ صفحہ ۲۱

[2] Kames Hasting : Encyclopedia of Religion and Ethics : Vol: V Second Edition - London - 1937 - P - 198

[3] عبدالرزاق کانپوری: علم الکتابت یا ابجد کی تاریخ۔ مطبوعہ سلور جوبلی نمبر ماہنامہ زمانہ کانپور بھارت صفحہ ۲۵

[4] ڈاکٹر احمد شلبی: تاریخ تعلیم و تربیت اسلامیہ، مترجم محمد حسین خان زبیری۔ ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور ۱۹۶۳ء

کو ماننے والے معلم کا تقرر ہونا چاہیے۔

کتابت اور خوشخطی

پڑھنے لکھنے کی صلاحیت ہر دور میں حصول علم کی سب سے بنیادی شرط رہی ہے جدید تعلیم میں گنتی Counting کو شامل کر کے انہی تین مہارتوں کو تعلیم کی بنیادی مہارتیں یا 3R Reading Writing Arithmetic کہا جاتا ہے

مسلمانوں نے حساب کی تعلیم کو بھی بنیادی اہمیت دی تھی جس کا تذکرہ آئندہ صفحات میں آئے گا لیکن فی الحال پہلی دو بنیادی مہارتوں کی اہمیت اور افادیت کا جائزہ لے لیا جائے۔ کتابت اور انشا پردازی پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حد تک توجہ دی کہ اس کے لیے غیر مسلموں (بدر کے قیدیوں اور ذمیوں) سے بھی استفادہ کیا گیا۔ ان دو بنیادی مہارتوں کو۔ قرآن کریم میں بھی اہمیت دی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قلم اور اس سے لکھے ہوئے الفاظ اور حروف کو اس درجہ محترم قرار دیا ہے کہ خود ان کی قسم کھائی ہے۔ (القرآن)

نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُوْنَ (ن) قسم ہے قلم کی اور جو کچھ وہ لکھتے ہیں۔

قلم کے بغیر علم کا تصور بے معنی ہو جاتا ہے۔ اسی حرمت اور تقدس کے پیش نظر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں مسلمانوں نے اس سے استفادہ شروع کیا کئی صحابہ نے اسی لیے کتابت اور خوشنویسی میں مہارت حاصل کی اس مہارت کی وجہ سے کئی صحابہ کاتب وحی کے منصب پر فائز ہوئے انہیں وہ سب کچھ لکھنے کی ذمہ داری دی گئی جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ پر نازل ہوا کرتا تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں فروغ پانے والی اس مہارت سے مسلمانوں کو بعد میں بھی بہت سے فوائد حاصل ہوئے، بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ اس مہارت کی بدولت قرآن اور احادیث کی اشاعت کو بڑا فروغ حاصل ہوا تو بے جا نہ ہوگا کتابت اور خوشنویسی پر اس عہد میں اتنے گہرے اثرات مرتب ہوئے کہ اسے خصوصیت سے ایک الگ فن کی حیثیت حاصل ہو گئی۔ کتابت کے فن میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد کے مسلمانوں نے کئی اضافے بھی کیے۔ کتابت شدہ تحریر کے آخر میں کاتب کا نام لکھنے کی روایت حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے دور میں پڑی اس روایت کے بانی ایک صحابی حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ تھے انہیں مدینے میں کاتب وحی کی حیثیت سے کام کرنے کا اعزاز بھی حاصل

ہوا تھا[1] آپ کی اس روایت پر اسی دور کے دوسرے خوشنویسوں نے بھی عمل کرنا شروع کر دیا تھا۔
عقبہ بن عامرؓ (سن وفات ۵۸ھ) نے ترتیب عثمانی سے مختلف ایک قرآن مرتب کیا تھا آپ کا
مرتب کردہ یہ نسخہ نویں صدی ہجری تک مصر میں موجود رہا اس کے آخر میں آپ نے خود لکھا تھا کہ
یہ قرآن عقبہ بن عامر نے اپنے ہاتھوں سے لکھا ہے[2] کتابت کے ساتھ ساتھ عقبہ بن عامر کو قرآن
حدیث، فقہ، فرائض اور شاعری جیسے علوم میں امتیازی حیثیت حاصل تھی کتابت کے آخر میں نام
لکھنے کی ان دو مثالوں سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اس دور میں لکھنے کے لیے خاصا اہتمام کیا جاتا
تھا۔ لکھنا چونکہ حصول علم کی اولین شرط ہے اس لیے اس کی ادائیگی کے دوران اہتمام اور تیاری
کو تعلیمی لحاظ سے انتہائی مستحسن عمل کہا جا سکتا ہے۔

خوش خطی کے اصول

خوش خطی دراصل لکھنے کی مہارت کا دوسرا نام ہے اب بہت کم اساتذہ ایسے ہیں جو طلبا
کو خوش خط لکھنے کی تربیت دیتے ہیں جبکہ یہ فن ابتدا ہی سے حضور کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سند
قبولیت حاصل کر چکا ہے۔ آپ نے عظیم مثالی معلم کی طرح طالب علموں کے لیے لکھنے اور خوشخط لکھنے کی
ضرورت پر زور دیا تاکہ طالب علموں میں الفاظ سے وابستگی اور حصول علم کے لیے یکسوئی اور توجہ کی صلاحیت
فروغ پائے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں پیشہ ور خوشنویس
Professional Calligraphers بھی موجود تھے اور اس فن میں آپؐ کی ذات سے
بھی کچھ ایسی روایات وابستہ ہیں جن سے اس کے فروغ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ کار
سامنے آتا ہے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں چونکہ لکھنے کے لیے کاغذ دستیاب نہیں
تھا اس لیے لکھنا اور بھی مشکل کام تھا۔ لکھنے کے لیے اس دور میں کاغذ کے بدلے درختوں کی
چھال، چمڑہ یا بہت موٹے گتے استعمال کیے جاتے تھے۔ اور ان پر لکھنے کے لیے سیاہی استعمال کی
جاتی تھی۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خوشخطی کے لیے ایسی ہدایات جاری فرمائیں جن سے نہ صرف
خوشخطی کا حسن دوبالا ہوتا ہے بلکہ اس فن کے انتہائی باریک پہلوؤں سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم
کی مکمل واقفیت کا اندازہ بھی ہوتا ہے مثلاً آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کاغذ کو موڑنے
سے پہلے اس کی سیاہی کو ریگ میں ڈال کر خشک کر لیا کرو (کتانی ۱/۱۲۹) سیاہی کو ریگ میں

---

[1] مولانا سعید انصاری: سیر انصار (حصہ اول و دوم) دار المصنفین اعظم گڑھ طبع دوم ۱۹۴۸ء صفحہ ۱۷۴
[2] شاہ معین الدین احمد ندوی: مہاجرین (حصہ دوم) دار المصنفین اعظم گڑھ طبع دوم ۱۹۵۵ء صفحہ ۲۳۶

ڈالنے کا مقصد یہی ہے کہ اسے تھوڑی دیر خشک ہونے دیا جائے اس دوران اس کاغذ کو ترتیب دے لیا جائے جس پر لکھنا مقصود ہے۔ اگر ایسا نہ کیا جائے اور فوراً ہی لکھنا شروع کر دیا جائے تو کاغذ پر سیاہی کے پھیلنے کے امکانات ہوتے ہیں جس سے خط بھدا اور بدنما ہو جاتا ہے اور پڑھنے والے اس عبارت کو واضح طور پر نہیں پڑھ سکتے (جن لوگوں نے لکھنے کے لیے قلم اور دوات کا استعمال کیا ہے وہ بہتر طور پر جانتے ہیں کہ پہلے سے تیار کردہ سیاہی کے برعکس تازہ سیاہی سے الفاظ میں نکھار پیدا نہیں ہوتا) آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف حروف کی تراش خراش کو ذہن میں رکھتے ہوئے انتہائی ماہرانہ مشورے دیئے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "س" کا حرف لکھتے وقت اس کے تینوں شوشے برابر کر دیا کرو اسے بغیر شوشوں کے نہ لکھا کرو (کتانی $\frac{1}{125}$) بظاہر اس ایک حرف کو ان دو مختلف انداز سے لکھنے میں کوئی بڑا فرق نظر نہیں آتا لیکن جب اسے شوشے دے کر لکھا جائے تو ہاتھ رک رک کر چلتا ہے اور اس میں انہماک کی ضرورت پڑتی ہے۔ اس کے برعکس بغیر شوشوں کے ہاتھ بہت تیزی سے چلتا ہے اور اس میں کسی انہماک یا توجہ کی ضرورت نہیں پڑتی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس انتہائی باریک نکتے کو سمجھانے کے لیے یہ نصیحت فرمائی تاکہ لکھتے وقت عجلت نہ کی جائے اور الفاظ اور ان کی نشست پر زیادہ توجہ دی جائے۔

لکھنے کے دوران باتیں کرتے رہنا معیوب تصور کیا جاتا ہے اس طرح ایک تو توجہ اصل الفاظ سے ہٹ جاتی ہے اور دوسرے خیالات بھی منتشر ہو جاتے ہیں۔ تحریر کے اس اصول کی نشاندہی آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی فرمائی تھی۔ آپ کی ہدایت تھی کہ لکھتے ہوئے رکنا ہو تو کاتب قلم کو کان پر رکھ لے تاکہ لکھوانے والے کی یاد دہانی ہو جائے اس دوران کاتب خود کچھ نہ بولے اس لیے کہ بولنے سے ذہن منتشر ہو جاتا ہے (کتانی $\frac{1}{125}$) خوشخطی اور کتابت کا یہ زریں اصول تعلیم و تدریس میں فن تحریر کے جدید اصولوں کا ماخذ ہے۔ اس دور میں جب قلم اور سیاہی سے لکھا جاتا تھا اگر وقفہ کے دوران قلم کو ویسے ہی لکھنے والی پوزیشن میں تھاما جائے تو اس سے سیاہی ٹپکنے یا سیاہی خشک ہو جانے کے امکانات زیادہ ہوتے ہیں اس کے برعکس قلم کو کان تک لے جانے سے ہاتھ اور قلم دونوں کی پوزیشن تبدیل ہو جاتی ہے اور سیاہی فوراً خشک

---

۵ محمد حمید اللہ: عہد نبوی کا نظام حکمرانی (جلد اول) مکتبہ ابراہیمیہ حیدر آباد دکن۔ بار دوم سنہ ۱۹۲۹ء۔ صفحہ ۲۲۰

نہیں ہوتی بلکہ کافی دیر تک موجود رہتی ہے ۔ کاتب کو خاموش رہنے کی ہدایت اس لیے کی گئی ہے کہ لکھنے اور لکھوانے والے دونوں کا انہماک برقرار رہے اور خیالات کے علاوہ دوسری باتیں ان کے لیے رکاوٹ نہ بنیں ۔

ابتدائی تعلیمی اداروں Primary Schools کے اساتذہ کے لیے خوشخطی سکھانا لازمی سمجھا جاتا ہے اس سے طالب علموں میں نہ صرف لکھنے کی صلاحیت فروغ پاتی ہے بلکہ وہ حصول علم کے لیے لازمی چہار رتوں میں سے ایک بنیادی مہارت Basic Skill بھی حاصل کر لیتے ہیں فن تحریر اور خوشخطی پر موجودہ دور میں توجہ کم ہوتی جا رہی ہے اور تعلیم و تدریس کے پست معیار کے اسباب تلاش کیے جائیں تو اسے بھی ایک بنیادی سبب کہا جا سکتا ہے ۔ حضور انور نے تعلیم کے اس بنیادی مسئلے کے ازالے کے لیے جو اقدامات تجویز فرمائے اس نے مسلمانوں میں علم سے لگاؤ اور وابستگی کو اس درجہ فروغ دیا کہ علم و فن کے میدان میں صدیوں ان کی حکمرانی قائم رہی ۔

خطبات میں وقفہ

بہت سے ماہرین کا یہ خیال ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ اور ارشادات سے اساتذہ کے لیے کئی راہنما اصول اخذ کیے جا سکتے ہیں لیکن تحقیق سے ثابت ہوتا ہے کہ درس و تدریس سے متعلق بے شمار اصول تو ایسے ہیں جن پر براہ راست آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بھی عمل فرمایا اور اس طرح مثالی معلم کا وہ کردار ادا کیا جو اساتذہ کے لیے قابل عمل بھی ہے اور قابل تقلید بھی ۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زندگی میں عام لوگوں کی تعلیم و تربیت کو بہت اہمیت دی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک مثالی مدرس ہونے کی وجہ سے لوگوں کے فطری اور نفسیاتی تقاضوں سے مکمل واقفیت حاصل تھی اسی لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دوران تدریس ان تقاضوں کا لحاظ رکھا ۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جب لوگوں کو اسلام کی تبلیغ کی اور انہیں اللہ تعالیٰ کے پیغام سے آگاہ کیا تب بھی اپنے طریقہ تبلیغ کو انہی تقاضوں سے ہم آہنگ کیا انسانی فطرت کو پیش نظر رکھتے ہوئے حضور پر نور صلی اللہ علیہ وسلم نے مختصر خطبات دیئے ۔ آپ کے خطبات Lectures میں سے شاید ہی کوئی خطبہ ایسا ہو جسے طویل کہا جا سکے ۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مختلف

---

[۲] امیر الہدیٰ ، مسلمانوں کے علمی و ثقافتی کارنامے ۔ قمر کتاب گھر ۔ کراچی ۔ صفحہ ۲۰

خطبات کے درمیان وقفہ بھی ہوتا تھا اور کبھی کبھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پند ونصائح کو مسلسل جاری نہیں رکھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو فصاحت و بلاغت میں کمال حاصل تھا۔ لیکن پھر بھی آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے لیکچر کو مختصر بنا کر لوگوں میں اکتاہٹ اور بوریت پیدا نہ ہونے دی۔ لیکچر زیادہ طویل ہو جائیں تو اب بھی طالب علموں کو سمجھنے اور یاد کرنے میں بڑی مشکلات پیش آتی ہیں۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل سے اساتذہ کے لیے یہ تعلیمی پہلو سامنے آتا ہے کہ وہ زیر تدریس سبق کو زیادہ سے زیادہ جامع اور مختصر بنائیں۔ غیر ضروری طوالت سے گریز کیا جائے۔ اور اگر ان ہدایات پر عمل نہ کیا جائے تو درس کے مثبت اثرات برآمد نہیں ہوتے تمام لیکچرس صدا بصحرا ثابت ہوتے ہیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خطابت کے بارے میں جن خصوصیات کا تذکرہ کیا جاتا ہے وہ تمام خصوصیات وہی ہیں جو ایک مثالی معلم میں ہونی چاہیئں۔ ان کے بغیر نہ اس کی تدریس موثر ہوتی ہے اور نہ ہی وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو سکتا ہے۔ معلم کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ طالب علموں کی سابقہ معلومات کا خیال رکھے اس نفسیاتی تدبیر سے وہ اپنے سبق کو زیادہ مُوثر بنا سکتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے خطبات بلکہ عام بول چال میں بھی نفسیات کے ان جامع اصولوں کو رائج کیا اس طرح تعلیمی نفسیات کی اصل سمت کا تعین کر دیا۔ آپ کے خطبات اور عام گفتگو لوگوں کے مزاج کے مطابق ہوتی تھی۔ اس میں سامعین کے تقاضوں اور معلومات کا لحاظ رکھا جاتا تھا۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا انداز خطابت اساتذہ کے لیے ایک نمونہ ہے جس سے کلاس روم اور کلاس روم سے باہر کے ماحول میں اساتذہ کی رہنمائی ہو سکتی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام کی خصوصیات کے بارے میں ایک بار جب حضرت عائشہ رضؓ سے پوچھا گیا تو ام المومنین رضؓ نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تم لوگوں کی طرح بے توقف۔ تیز اور جلد جلد کلام نہیں فرماتے تھے بلکہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم جب کلام فرماتے تو وہ اتنا واضح ہوتا کہ اس کے الفاظ اس طرح الگ الگ ہوتے اور اس میں اس قدر ٹھہراؤ ہوتا کہ ہر شخص جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھا ہوتا وہ اسے پوری طرح اپنے حافظہ میں محفوظ کر لیتا [۱] آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام کی یہ خصوصیات بھی آپ صلعم کو

---

[۱] علامہ شمس بریلوی: سرورِ کونین کی فصاحت۔ مدینہ پبلشنگ کمپنی کراچی۔ سنہ ۱۹۸۵ء صفحہ ۲۱۴

مثالی معلم کی خصوصیات کا حامل قرار دیتی ہیں۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حسن کلام سے تو معلمین کے لیے نئے تصورات اور طریقے منظر عام پر آئے جس طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام سامعین کے لیے اتنا سہل اور دلچسپ ہوتا کہ اسے سمجھنے اور سننے میں کوئی دقت نہیں ہوتی تھی بالکل اسی انداز پر اساتذہ کا انداز کلام بھی ہونا چاہیے اساتذہ میں یہ خصوصیت ہونی چاہیے کہ ان کے لہجے میں دھیما پن ہو الفاظ کی ادائیگی اس طرح ہو کہ ایک ایک لفظ واضح طور پر ادا کیا جائے اور اتنا ہی واضح سنا جا سکے۔ دوران تدریس اساتذہ کا کلام اور اسٹائل اتنا مؤثر اور جامع ہو کہ سامعین بھی اس سے مثبت اثرات قبول کریں اس طرح وہ اسے سننے کے بعد یاد رکھ سکیں گے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم میں یہ تمام خوبیاں بدرجہ کمال موجود تھیں اور اسی لیے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تبلیغ کے انتہائی موثر اور دیرپا اثرات مرتب ہوئے۔ دوران تدریس اسباق اور نفس مضمون کو موثر اور دیرپا بنانے کے لیے اساتذہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اسی انداز کو رہنما بنا سکتے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنی شیریں بیانی اور مؤثر طریقہ تدریس سے باتوں کو اتنا سہل اور قابل قبول بنا دیتے تھے کہ ظہور اسلام کے وقت کفار مکہ نے اس خدشہ کی بنا پر کہ لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لہجے سے متاثر ہو کر آپ کی باتیں قبول نہ کر لیں لوگوں کو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے دور رہنے کا مشورہ دیا تھا۔ غرض اساتذہ کے لیے دوران تدریس الفاظ کے انتخاب ان کی ادائیگی اور لب و لہجے کو بڑا دخل ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شعبہ میں موثر مثال قائم فرمائی تھی۔

پوچھنے کی اجازت

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم میں فصاحت و بلاغت کے ساتھ ساتھ یہ خوبی بھی موجود تھی کہ متعلمین کے لازمی استفسار یا وضاحت کا برا نہ مانتے تھے بعض مواقع پر تو ایسا بھی ہوتا تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سامعین کا خیال رکھتے ہوئے ایک بات کو تین مرتبہ زبان سے ادا فرماتے تھے۔ حضرت انس رضؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب کوئی بات کہتے تو تین مرتبہ[۱] اعادہ فرماتے (تین بار کہتے)۔ یہاں تک کہ لوگ اس کو اچھی طرح سمجھ لیتے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم جب کسی جماعت کے قریب سے گزرتے اور اس جماعت کو سلام کرنے کا ارادہ فرماتے تو تین مرتبہ اسکو سلام کرتے (بخاری) [۱] جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کسی بات کو اس لیے تین بار دہراتے

---

[۱] مشکوٰۃ شریف مترجم جلد اول۔ کتاب العلم صفحات ۹۶ - ۹۵

کر سننے میں کسی غلط فہمی کا احتمال نہ رہے بالکل اسی طرح اساتذہ کے لیے بھی طالب علموں کی سہولت کے لیے سبق یا لیکچر کو دہرانا مستحسن تعلیمی فعل قرار دیا جاتا ہے اس فعل کی تعلیمی افادیت بھی بہت زیادہ ہے۔ آموزش میں تکرار اور اعادہ کو اہم عناصر کی حیثیت سے موجودہ تعلیمی نفسیات نے غالباً اسی صدی میں شامل کیا ہے لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم چودہ سو سال پہلے ہی اس اصول کو رائج فرما چکے تھے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دہرانے کے اس عمل سے طالب علموں کا یہ استحقاق بھی ثابت ہوتا ہے کہ وہ کوئی بات نہ سن سکیں یا واضح طور پر نہ سمجھ سکیں تو اساتذہ سے وہ بات دہرانے کی درخواست کر سکتے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ اساتذہ کا یہ فرض بھی سامنے آتا ہے کہ وہ طالب علموں کے لیے اہم نکات یا مسائل (ضروری ہو تو) دو تین بار دہرائیں۔ بعض تعلیمی ماہرین کے خیال میں تین بار دہرانے میں یہ مصلحت کارفرما ہے کہ متعلمین اگر پہلی بار نہ سن سکے ہوں تو دوسری بار سن لیں اور دوسری بار نہ سن سکے ہوں تو تیسری بار سن لیں۔ اس میں یہ چیز بھی نظر آتی ہے اگر پہلی یا دوسری بار کوئی بات واضح طور پر سمجھ میں نہ آئی ہو تو اس بار بار کی تکرار سے ممکنہ غلطیوں کی اصلاح بھی کی جا سکتی ہے۔

غرض آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل سے اساتذہ کے لیے سبق کا اعادہ کرنا اور طالب علموں کے لیے تشنگی محسوس ہو تو اساتذہ سے وضاحت طلب کرنا یا استفسار کرنا دونوں ہی ثابت ہوتے ہیں۔ طالب علموں کے لیے جس قدر حصول علم ضروری ہے اسی قدر بات سمجھ میں نہ آئے تو اس کے لیے مزید جستجو کرنا بھی ضروری ہے نہ اساتذہ جو ایسے مواقع پر طالب علموں کے استفسارات اور سوالات کو بداخلاقی یا گستاخی تصور کرتے ہیں انہیں یہ جاننا چاہیے کہ جاننے کے لیے معلوم کرنے سے زیادہ سہل اور کوئی طریقہ نہیں ہے پوچھنے کی اجازت تو خود اللہ تعالیٰ نے مرحمت فرمائی ہے بلکہ خود پوچھنے کی ترغیب بھی دی ہے۔ ارشاد خداوندی ہے کہ (القرآن)

فَسْـَٔلُوٓا۟ أَهْلَ ٱلذِّكْرِ إِن كُنتُمْ لَا تَعْلَمُونَ ﴿۴۳﴾ (۱۶ - ۴۳) النحل - پ - ۱۴

پس دریافت کر لو اہل علم سے اگر تم خود نہیں جانتے

اہل علم اور اساتذہ سے پوچھنے کی قطعی ممانعت نہیں بلکہ یہ تو متعلمین کا حق بنتا ہے کہ وہ نہ سمجھ میں آنے والے اسباق اور مسائل کے لیے اساتذہ سے رجوع کریں۔ اساتذہ کا یہ فرض ہے کہ وہ طالب علموں کی تسلی و تشفی کے لیے وہ امور دہرائیں۔ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا عمل فرمایا تھا اور یقیناً متعلمین اور معلمین کے باہمی تعلق خصوصاً تدریس کے معاملے میں اس سے زیادہ بہتر دوسری مثال نہیں ملتی۔

مختصرات Notes کی اجازت

دوران تدریس لکھنے یا نوٹس لینے (مختصرات) کا تصور بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کے درس و تدریس کے طویل سلسلہ سے ثابت ہوتا ہے۔ جہاں تک لکھنے کی صلاحیت کا تعلق ہے اس موضوع کا کتابت کی تعلیم کے تحت مختصر اً جائزہ لیا جا چکا ہے اب صرف لکھنے اور دوران تدریس نوٹس لینے کے معاملے تک بحث کو محدود رکھا جائے گا۔ اس ضمن میں سب سے زیادہ مستند آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارک ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول تھا کہ جب بھی کوئی آیت نازل ہوتی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کسی پڑھے لکھے صحابی کو بلواتے اور انہیں وہ آیت لکھوا دیتے۔ اسی ذمہ داری کے حوالے سے کئی صحابہ کرام کو کاتبان وحی کی حیثیت حاصل ہوئی۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں کاغذ موجودہ شکل میں دستیاب نہیں تھا بلکہ لکھنے کے لیے مختلف اشیاء استعمال کی جاتی تھیں۔ کئی مورخین اس امر پر متفق ہیں کہ اس دور کے آغاز میں مندرجہ ذیل پانچ اشیاء کو کاغذ کے بدلے لکھنے کی غرض سے استعمال کیا جاتا تھا۔[۱]

۱۔ عسیب :۔ کھجور کی شاخ جس سے پتے الگ کر دیئے جاتے تھے۔ یہ درخت عرب میں کثرت سے پائے جاتے ہیں۔

۲۔ لخف :۔ پتھر کی پتلی پتلی تختیاں یا ٹکڑے یا ٹھیکرے۔

۳۔ کتف :۔ اونٹ یا بکری کی چوڑی ہڈیاں (واضح رہے کہ اونٹ اور بکری دونوں جانور حلال ہیں ممکن ہے اسی مناسبت سے دوسرے حلال جانوروں کی ہڈیوں کو بھی لکھنے کی غرض سے استعمال کیا گیا ہو۔ مسلمانوں نے یقیناً حرام جانوروں کی ہڈیاں استعمال نہیں کی تھیں)۔

۴۔ ادیم :۔ چمڑا

۵۔ قتب :۔ پالانا کی لکڑی۔

لکھنے کے لیے استعمال میں آنے والی مندرجہ بالا اقسام سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس دور میں لکھنا کتنا مشکل اور توجہ طلب کام تھا۔ لیکن اس شعبے میں پورے عرب میں مسلمان ہی سرفہرست رہے۔ جہاں تک دوران تبلیغ یا تدریس لکھنے کا تعلق ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی

---

[۱] محمد ابو زہرہ: آثار امام شافعی، مترجم رئیس احمد جعفری، شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور سنہ ۱۹۶۱ء صفحہ ۳۰۔

صحبت میں علم حاصل کرنے والے صحابہ کرام سے اس کی تصدیق ہوتی ہے ایک مقتدر صحابی حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص جن کا انتقال ۶۵ھ میں ہوا دربار نبوت میں حاضر رہتے تھے اور جو کچھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے وہ لکھ لیا کرتے تھے۔ احادیث کے حوالے سے ایک اور معتبر صحابی حضرت ابوہریرہؓ کا کہنا تھا کہ انہیں جو حدیثیں یاد تھیں ان کی تعداد حضرت عبداللہؓ بن عمرو کو یاد ہو جانے والی احادیث سے کم تھی اس لیے کہ وہ لکھ لیا کرتے تھے اور میں (ابوہریرہؓ) نہیں لکھتا تھا[1] چند محققین کا اس امر پر اتفاق ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی باتیں سن کر انہیں لکھ لینے کی زیادہ تائید نہیں کی گئی لیکن وہ ساتھ ہی ساتھ اس امر کی صراحت بھی کرتے ہیں کہ اس نوعیت کی پابندی کا بنیادی مقصد یہی تھا کہ آیات ربانی اور ارشادات رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا احترام برقرار رہے اور ان کی بے حرمتی نہ ہو۔ عام روایات اور علوم کو سمجھنے اور یاد کرنے کے لیے انہیں لکھنے کی کبھی ممانعت نہیں کی گئی۔ بیشتر محققین لکھنے اور مختصرات لینے کے حق میں شواہد پیش کرتے ہیں اور اسے اشاعت علم کا ایک موثر ذریعہ قرار دیتے ہیں۔

طالب علموں سے محبت اور شفقت

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا کے تمام انسانوں سے محبت اور شفقت کا درس دیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ سے اس بات کی تصدیق ملتی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیشہ نرمی اور محبت سے گفتگو کی کبھی بھی کسی سے سخت لہجے میں مخاطب نہیں ہوئے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ خصوصیت اتنی نمایاں تھی کہ آپ کے بدترین دشمن بھی آپؐ کے حسن سلوک کا اعتراف کرتے تھے اس عہد کے معاشرہ اور وہاں کے حالات کو دیکھا جائے تو دراصل یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اعلیٰ اخلاق ہی تھے جن کی بدولت عرب جیسے غیر وحشی اور غیر متمدن لوگوں نے آپؐ کے پیغام کو قبول کیا اور ان کے ذہن سے وہ تمام باطل تصورات اور خیالات نکل گئے جو ان میں نسل در نسل منتقل ہوتے چلے آ رہے تھے انسانوں سے محبت اور شفقت میں آپؐ نے کسی کو کسی پر ترجیح نہیں دی بلکہ ان کافروں کے ساتھ بھی حسن سلوک روا رکھا جنہوں نے آپؐ کو اذیتیں دیں اور آپ کو جھٹلانے کی کوششیں کیں۔ آپؐ کا یہ رویہ مصلحتوں پر مبنی نہیں تھا بلکہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم فطرتاً نرم دل واقع ہوئے تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو تمام انسانوں سے بےحد ہمدردی تھی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم بچوں سے خصوصی محبت سے پیش آتے تھے۔ اگر کسی راستے سے گزر رہے ہوتے تو بچوں کو دیکھ کر رک جاتے اور ان سے

---

[1] حاجی معین الدین ندوی، مہاجرین (حصہ اول، دوم)، دار المصنفین، اعظم گڑھ، ۱۹۵۱ء، صفحات ۳۴ - ۴۰۳

باتیں کرتے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس عمل نے بچوں کو اعتماد بخشا اور اس طرح آپؐ کے اور بچوں کے مابین انس میں اور زیادہ اضافہ ہوا۔ آپؐ کا یہ برتاؤ بچوں کی نفسیات کے عین مطابق تھا بچے اسی سے زیادہ مانوس ہوتے ہیں جو ان سے خصوصی برتاؤ کرے اور توجہ سے ان کے معاملات میں دلچسپی لے۔ بچوں سے حسن سلوک کی یہی خصوصیت جدید دور کی تعلیمی نفسیات کے مطابق اساتذہ کی ایک لازمی خصوصیت بھی ہے۔

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عام لوگوں کے ساتھ ساتھ طالبان علم سے خصوصی محبت اور شفقت کا برتاؤ روا رکھا۔ تاکہ انہیں کسی بھی مرحلہ پر نظر انداز کیئے جانے کی وجہ سے حصول علم میں کوئی رکاوٹ پیدا نہ ہو۔ حضرت انسؓ کی یہ روایت کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایک بات کو تین بار دہراتے تھے اس امر کی نشاندہی کرتی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سامعین کی تالیف قلب کے لیے ایسا کرتے تھے اس طرح سننے والوں کو پوچھنے کی شرمندگی سے نجات مل جاتی تھی اور ان کے کام کی تمام باتیں بڑی آسانی سے ان تک پہنچ جاتی تھیں[1] آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے طالب علموں سے ناراضگی کا اظہار نہیں کیا اور نہ ہی کبھی انہیں ایک دوسرے پر فوقیت دی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سب کے ساتھ یکساں برتاؤ کیا۔ ایک بار حضرت ابن مکتومؓ جو نابینا تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی علمی معاملے میں کچھ پوچھنے کے لیے حاضر ہوئے۔ اسی دوران کسی اور نے آپؐ سے گفتگو شروع کردی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی توجہ ابن مکتومؓ سے ہٹ گئی اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو سب پر یکساں توجہ دینے کی طرف متوجہ کیا۔

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو علم اور طالبان علم دونوں ہی بہت عزیز تھے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے یہ پیغام عام کیا کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے پسندیدہ عمل حصول علم ہے اور سب سے پسندیدہ قول علم میں اضافہ کی دعا ہے (القرآن)

وَقُلْ رَّبِّ زِدْنِيْ عِلْمًا ۝ (۲۰ - ۱۱۴) طٰہٰ - پ ۱۶ -)

یہ دعا بھی طالب علموں کو علمی موشگافیوں اور تحقیق و جستجو کے کٹھن مراحل طے کرنے میں معاونت کے لیے تجویز کی گئی تھی۔ غرض ہر معاملہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے طالب علموں کو خصوصی شفقت سے نوازا حصول علم میں ان کی بیحد مدد کی یہاں تک آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا حسن سلوک پوری دنیا کے لیے ایک روشن مثال بن گیا۔

---

[1] علامہ شمس بریلوی، سرور کونین کی فصاحت۔ مدینہ پبلشنگ کمپنی، کراچی ۱۹۸۵ء صفحہ ۲۱۳

خواتین کی تعلیم

ابتدائی دور میں خواتین کو اسلامی تعلیمات سے فیضیاب ہونے کے مواقع مردوں کے مقابلے پر کم میسر آئے اس کا ایک سبب تو اس دور کی معاشرتی روایات تھیں جن کے مطابق خواتین کو مردوں کے مقابلے پر آزادانہ میل جول اور گھر سے باہر نکلنے کے مواقع بہت کم دستیاب تھے۔ اس سے پہلے تو خواتین کو دورِ جاہلیت کے عرب معاشرے میں کافی حد تک نظر انداز کر دیا گیا تھا اسلام کے اوائل دور میں خواتین کی علم وفن کے شعبوں میں معمولی کارکردگی کا یہ سبب نہیں تھا کہ انہیں خواتین ہونے کی وجہ سے علم سے دور رکھا گیا ہو۔ اس کا یہ سبب بھی نہیں تھا کہ انہیں مردوں کے مقابلے میں جسمانی اعتبار سے کمزور ہونے کی وجہ سے ذہنی اعتبار سے بھی کمزور سمجھا جاتا تھا بلکہ ان کی کارکردگی صرف اس لیے کم تھی کہ انہیں اس کے اظہار کے مواقع حاصل نہیں تھے ورنہ ان پر حصول علم کے لیے کسی نوعیت کی کوئی پابندی عائد نہیں کی گئی تھی۔

عرب کی چند خواتین ظہورِ اسلام سے پہلے بھی خواندہ تھیں ان خواتین کے نام قریش کے پڑھے لکھے افراد کی فہرست کے ساتھ پہلے ہی بیان کیے جا چکے ہیں۔ پہلی وحی کے نازل ہونے کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے سب سے پہلے آیات ربانی سننے کا اعزاز بھی دنیا میں ایک خاتون ہی کو حاصل ہوا۔ بلکہ ام المومنین حضرت خدیجہؓ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو حوصلہ دلایا اور ہر اعتبار سے آپؐ کی معاونت کی۔ ان خاتون ہی کی وجہ سے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یکسوئی سے اسلامی تعلیمات کا مشن شروع کیا۔ امہات المومنینؓ نے اس شعبہ میں آپؐ کے شانہ بشانہ کام کیا اور اس طرح خواتین میں تعلیم عام کرنے میں بڑی مدد کی (اس کی مزید تفصیلات آئندہ ابواب میں خواتین اساتذہ اور خواتین کی تعلیم کے تحت شامل کی گئی ہیں)

آپ صلی اللہ علیہ وسلم خواتین کی تعلیم کے حق میں تھے۔ اسی لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حصول علم کو ہر مسلمان مرد اور عورت کے لیے فرض قرار دیا (حدیث)

طلب العلم فریضۃ علیٰ کل مسلم و مسلمۃ

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بھی خواتین کو تعلیم دی۔ چونکہ امہات المومنینؓ کو دوسری خواتین کے مقابلے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے براہ راست اکتساب کرنے کے زیادہ مواقع میسر تھے اس لیے ان میں سے کئی ایک نے علمی اعتبار سے نمایاں کارکردگی کا مظاہرہ کیا۔

حضرت حفصہ رضؓ بنت عمر اور حضرت عائشہ بنت رضؓ ابو بکر اس عہد کی مسلمان خواتین میں علمی اعتبار سے سر فہرست تھیں مسلمان مردوں میں تعلیم کا سلسلہ عام ہونے کے بعد خواتین نے بھی علم کی ضرورت کو محسوس کیا۔ انہوں نے اپنی اس محرومی کا مختلف انداز سے اظہار بھی کیا۔ ایک صحابیہؓ نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنی گزارشات پیش کیں، ان کا اصرار تھا کہ آپؐ کی بتائی ہوئی باتیں مردوں نے خوب حاصل کر لی ہیں جبکہ خواتین ان سے محروم رہی جاتی ہیں۔ اس لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کوئی ایک دن ایسا بھی مقرر کر دیں جس میں خواتین حصول علم کے لیے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو جایا کریں حضرت ابو سعیدؓ کی اس روایت کے مطابق آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خواتین کے لیے بدھ کا دن مختص کر دیا۔ اس دور میں لوگ جوق درجوق قبول اسلام کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے اور مسجد نبوی میں ان کا ایک مجمع لگا رہتا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خواتین کی سہولت کے لیے مسجد نبوی کا ایک دروازہ بھی مخصوص کر دیا کہ وہ اسی دروازے سے داخل ہوں اور آپؐ صلی اللہ علیہ وسلم کے درس کے بعد اسی دروازے واپس چلی جایا کریں۔ حصول علم کے لیے مسجد نبوی میں خواتین کی آمد اور روانگی کے حوالے سے یہ دروازہ باب النساء کے نام سے مشہور ہو گیا اور آج بھی اس کا یہی نام ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے چونکہ بذات خود خواتین کی تعلیم کے لیے احکامات جاری فرمائے تھے بلکہ خود ہی خواتین کو تعلیم بھی دی تھی اس لیے اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں رہتا کہ عہد نبویؐ میں خواتین کے لیے حصول علم کے دروازے کھلے ہوئے تھے۔ جہاں تک اس امر کا تعلق ہے کہ اس دور میں خواتین کے لیے صرف قرآن اور احادیث یا ان کے علاوہ بھی کچھ اور مضامین کی تعلیم رائج کی گئی تھی اس سلسلہ میں تفصیلی بحث خواتین اساتذہ اور خواتین کی تعلیم کے تحت کی گئی ہے)

کھیلوں میں شرکت

کھیل اور تفریح Recreation دونوں جسمانی اور ذہنی صحت کے لیے ضروری ہوتے ہیں۔ ان میں شرکت سے کام کے بوجھ کا احساس کم ہو جاتا ہے اور فرد نئے سرے سے تازہ دم ہو کر مصروف عمل ہوتا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں عربوں میں بھی کھیل رائج تھے لیکن ان کھیلوں میں بے مقصدیت نہیں تھی۔ ان میں جوانمردی اور شجاعت کا اظہار کیا جاتا تھا اور جسمانی صحت اور تنومندی کے ساتھ ساتھ ان کھیلوں کو دادِ شجاعت اور جنگی مہارت کے

نقطہ نظر سے فروغ دیا جاتا تھا۔ گھوڑ سواری اور نیزہ بازی گو بہت اہم مہارتیں تھیں لیکن عربوں نے انہیں بطور کھیل بچپن ہی سے اختیار کر رکھا تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس نوعیت کے کھیلوں پر پابندی عائد نہیں کی بلکہ صرف ایام جاہلیت کی قمار بازی اور شعبدہ بازی جیسی مذموم سرگرمیوں کی ممانعت کی۔ ان چیزوں کو موجودہ دور کے مہذب معاشرے بھی کھیل کے بجائے تضیع اوقات اور اخلاقی پستی کا مظاہرہ تصور کرتے ہیں۔ غرض حصول علم کی طرح جسمانی اور ذہنی صحت کی سرگرمیوں کو تحفظ دے کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تعلیم و تربیت کا ایک مثالی نظام تشکیل دیا تھا اس پورے نظام کی سب سے ہمہ گیر شخصیت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی تھی جس سے بعد میں آنے والوں مسلمانوں اور دوسرے مذاہب کے لوگوں نے بھی رہنمائی حاصل کی۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات ہی میں مسلمانوں پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم و تربیت کے اثرات نمایاں ہونے لگے تھے اسلام کی تبلیغ کے نتیجے میں لاتعداد لوگ مسلمان ہو رہے تھے اور صرف مذہبی اعتبار ہی سے نہیں بلکہ مسلمانوں میں علم کے حوالے سے بھی اضافہ ہو رہا تھا جس معاشرہ میں گنتی کے چند افراد لکھنا پڑھنا جانتے تھے وہاں خواندگی کی شرح میں روز افزوں اضافہ ہو رہا تھا۔ صحیح بخاری کے مطابق ابتدائے ہجرت میں مدینہ شہر کی مسلم شماری کرائی گئی تو پندرہ سو اندراجات ملے[1] اس سے مسلمانوں میں اضافے کے رجحان کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ بعد میں جب مسلمانوں نے یہودیوں کی سازشوں اور کفار مکہ سے کسی حد تک چھٹکارا حاصل کر لیا تو یکسوئی سے علوم و فنون کی طرف توجہ دی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کی روشنی میں لوگوں نے خواندگی کے حصول کی کوششیں تیز کر دیں۔ حتمی تعداد کا اندازہ تو نہیں کیا جاسکتا البتہ اضافہ کی شرح کو محسوس ضرور کیا جاسکتا ہے۔ ہجرت کے بعد خواندگی میں اضافہ ہی اس ہدایت کا محرک تھا کہ مسلمان آئندہ تجارتی معاہدے بھی تحریری طور پر کیا کریں اس کا مطلب یہ بھی لیا جاتا ہے کہ اس سے پہلے دیگر معاہدے تحریری ہوا کرتے تھے اور بعد میں ان کا دائرہ تجارتی امور تک بڑھا دیا گیا۔ اس کے بعد تمام معاہدوں نے تحریری کی شکل اختیار کر لی جو یقیناً مسلمانوں میں خواندگی کے اضافہ کی علامت تھی۔

معاہدوں کے ضمن میں ہجرت کے بعد مسلمانوں نے سیاسی معاہدات بھی تحریری شکل میں کیے

مختلف نوعیت کی سرکاری خط و کتابت official correspondence

---

[1] محمد حمید اللہ: عہد نبوی کا نظام حکمرانی (جلد اول) مکتبہ ابراہیمیہ حیدر آباد دکن بار دوم ۱۹۴۹ء صفحہ ۲۱۹

بھی ہونے لگی مختلف مہمات پر جانے والے مجاہدین کی فہرستیں بھی تحریری صورت میں مرتب کی گئیں۔
ان تمام شواہد سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کے نتیجے میں جہاں اسلام قبول کرنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا تھا وہیں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے موثر طریقہ تبلیغ سے علم حاصل کرنے والوں کی تعداد بھی بڑھتی جا رہی تھی۔ یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے عظیم ماہر تعلیم ہونے کا بین ثبوت تھا۔ کئی غیر مسلم محققین نے بھی وسیع النظری سے کام لیتے ہوئے تعلیمی میدان میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اعلیٰ مہارت کا اعتراف کیا ہے۔ انسائیکلو پیڈیا آف ایجوکیشن میں عرب تعلیم کا جو مختصر تذکرہ ملتا ہے اس پر ایک دوسرے مغربی مصنف نے خود اعتراض کرتے ہوئے لکھا ہے کہ منرو کے اس انسائیکلو پیڈیا میں محمدؐ یا اسلام پر کچھ بھی نہیں لکھا گیا البتہ عرب تعلیم پر محدود سی معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ منرو کا یہ عمل اس امر کے مترادف ہے کہ کسی ایک پودے یا درخت کے وجود کو تسلیم کر لیا جائے اور اس کا تذکرہ کیا جائے جب کہ پورے باغ کو قطعی نظر انداز کر دیا جائے۔[۵]

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قول و فعل کے حوالے سے دیکھا جائے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم میں مثالی معلم کی تمام خصوصیات نظر آتی ہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے درس و تدریس سے لے کر تعلیمی انتظام تک جو طریقے رائج فرمائے انہیں جدید تعلیمی نظام میں بھی رہنما حیثیت حاصل ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تعلیم کو مسلمانوں کی اہم مذہبی ذمہ داری بنا دیا اور اسی انداز سے اس کے فروغ کے لیے ذاتی محنت کی۔ آپؐ نے جو بھی اقدامات کیے وہ اتنے مؤثر اور کار آمد ثابت ہوئے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد بھی صدیوں تک مسلمان علم و فن کے معاملے میں دوسری قوموں کی رہنمائی کرتے رہے۔

❖ ❖ ❖

۵۔ Robert Gulick — Robert Gullick : Mohammad the Educator: Islamic Culture — Lahore — P – 4

باب ۵

اساتذہ۔ تقرر اور مشاہرے

تَعَلَّمُوا الْعِلْمَ وَعَلِّمُوهُ النَّاسَ (بیہقی)

علم سیکھو اور لوگوں کو سکھاؤ

علم کی اشاعت کا فرض

دین اسلام اس اعتبار سے دنیا میں منفرد حیثیت رکھتا ہے کہ یہ لوگوں کو بھلائی کی طرف بلاتا ہے اور وہ جو بھلائی کی طرف آجائیں انہیں مزید ترغیب دیتا ہے کہ وہ دوسروں کو بھی بھلائی کا راستہ دکھائیں۔ اسلام کی اس انفرادی خصوصیت کا اظہار اس عہد سے بھی ہوتا ہے جس کا اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب حکمت میں تذکرہ فرمایا ہے۔ (القرآن)

(آل عمران ۳۔ ۱۸۷)

وَإِذْ أَخَذَ اللَّهُ مِيثَاقَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ لَتُبَيِّنُنَّهُ لِلنَّاسِ وَلَا تَكْتُمُونَهُ (پ ۔۴)

اور یاد کرو جب لیا اللہ تعالیٰ نے پختہ وعدہ ان لوگوں سے جنھیں کتاب دی گئی۔ کہ تم ضرور کھول کر بیان کرنا اسے لوگوں سے اور نہ چھپانا۔

اس عہد کی رو سے وہ لوگ جو نہ جانتے ہوں جاننے لگیں تو ان پر خود بخود یہ فرض عائد ہو جاتا ہے کہ وہ دوسروں کو بھی (اگر وہ نہیں جانتے ہیں تو) اس سے آگاہ کریں اشاعت علم اسی لیے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک سب سے مستحسن عمل ہے اور یہ ذمہ داری تمام مسلمان مردوں اور عورتوں پر عائد ہوتی ہے۔ انبیاء کرام کی بعثت کا مقصد بھی یہی تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم بھی زندگی بھر لوگوں کو تعلیم دیتے رہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کرتے ہوئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے زیر تربیت صحابہ کرام نے بھی علم کی اشاعت اور فروغ کے اس فریضے کی ادائیگی کے لیے بھرپور جدوجہد کی۔ اسلام کی تعلیم صرف نظری یا رسمی علوم وفنون تک محدود نہیں تھی بلکہ اسلام نے لوگوں کو دنیا کی تمام اشیاء اور پوشیدہ اسرار سے واقفیت فراہم کی اور انہیں ترغیب دی کہ وہ ان اشیاء اور علوم کو انسانی فلاح کے لیے استعمال کریں۔ ان سب کو حاصل کریں اور اپنے تصرف میں لائیں تاکہ خود ان کے لیے بھی زیادہ سے زیادہ آسانیاں

پیدا ہوں۔ اسلام نے مختلف پیشوں سے وابستگی کی نفی نہیں کی بلکہ اس ضمن میں کئی نئی راہیں اور شعبے تجویز کیے۔ ارشاد خداوندی ہے کہ (القرآن)

إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِي تَجْرِي فِي الْبَحْرِ بِمَا يَنفَعُ النَّاسَ وَمَا أَنزَلَ اللَّهُ مِنَ السَّمَاءِ مِن مَّاءٍ فَأَحْيَا بِهِ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِيهَا مِن كُلِّ دَابَّةٍ وَتَصْرِيفِ الرِّيَاحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَعْقِلُونَ ﴿١٦٤﴾

بقرہ - ۲ - ۱۶۴ (پ - ۲)

بے شک آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے میں اور رات اور دن کی گردش میں اور جہازوں میں جو چلتے ہیں سمندروں میں وہ چیزیں اٹھائے جو نفع پہنچاتی ہیں لوگوں کو اور جو اتارا اللہ تعالیٰ نے بادلوں سے پانی پھر زندہ کیا اس کے ساتھ زمین کو اس کے مردہ ہونے کے بعد اور پھیلا دیئے اس میں ہر قسم کے جانور اور ہواؤں کے بدلتے رہنے میں۔ اور بادل میں جو حکم کا پابند ہو کر آسمان اور زمین کے درمیان (لٹکتا) رہتا ہے (ان سب میں) نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو عقل رکھتے ہیں۔

قرآن کریم نے کائنات کو قدرت کی نشانیوں سے مزین قرار دیا اور عقل و دانش رکھنے والوں کو یہ خوشخبری دی کہ وہ اس سے واقف ہو سکتے ہیں۔ پوری کائنات اور اس سے وابستہ افراد، موسم اور ماحول سب ہی انسان کے لیے بنائے گئے ہیں اور انسان کو اس کی تسخیر کی علانیہ دعوت دی گئی ہے۔ اس طرح زندگی کے مختلف شعبوں اور کائنات کے مختلف اسرار کو سمجھنے اور مختلف علم و ہنر اختیار کرنے کے لیے اسلام خود سب سے بڑا محرک ہے۔ جہاں تک حصول علم اور اشاعت علم کے فریضہ کا تعلق ہے قرآن کریم میں اس ضمن میں واضح احکامات موجود ہیں۔ سورہ توبہ میں ارشاد خداوندی ہے کہ (القرآن)

وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُونَ لِيَنفِرُوا كَافَّةً ۚ فَلَوْلَا نَفَرَ مِن كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَائِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّينِ وَلِيُنذِرُوا قَوْمَهُمْ إِذَا رَجَعُوا إِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُونَ (۹-۱۲۲) توبہ (پ - ۱۱)

اور یہ تو ہو نہیں سکتا کہ مومن نکل کھڑے ہوں سارے کے سارے تو کیوں نہ نکلے ہر قبیلے سے چند آدمی تاکہ تفقہ حاصل کریں دین میں اور ڈرائیں اپنی قوم کو جب لوٹ کر آئیں ان کی طرف تاکہ وہ (نافرمانیوں سے) بچیں گروہ در گروہ لوگوں کو جدو جہد کرنے کی تلقین کی گئی کہ وہ خود سیکھیں اور دوسروں کو سکھائیں اس طرح ایک سے دوسرے اور دوسرے سے تیسرے یہاں تک کہ رفتہ رفتہ سب تک علم کا سلسلہ دراز کیا جا سکتا ہے اسلام نے عام لوگوں کے لیے پہلے خود سمجھنا اور پھر اپنے قبیلہ اور قوم کو سمجھانا لازمی قرار دیا ہے۔ حصول علم کے ساتھ اشاعت علم کا فریضہ وابستہ کر دینے سے مسلمانوں میں ایک

جانب تو اساتذہ کی موجودگی اور ان کے کام کی توثیق ہوتی ہے، دوسری جانب ایک ایسا تعلیمی نظام بھی تشکیل ہو جاتا ہے جس میں ہر فرد کو تعلیم حاصل کرنے کے مواقع مل جاتے ہیں۔ دوسروں تک علم پہنچانے والوں (اساتذہ یا معلمین) کی معاشرتی حیثیت کا تعین حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بھی فرمایا ہے (حدیث مشکوٰۃ)

هل تدرون من أجود جوداً قالوا الله ورسوله اعلم

قال الله أجود جوداً ثم انا اجود بني آدم واجودهم من بعدي رجل

علم علماً فنشره يأتي يوم القيمة امیراً وحده او قال امة واحدة

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ فرمایا رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ کیا تم جانتے ہو سب سے زیادہ سخی کون ہے صحابہ نے عرض کیا اللہ اور اس کا رسول واقف تر ہے پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ عزوجل سب سے زیادہ سخی ہے اور اس کے بعد جملہ بنی آدم میں میں (حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم) سب سے زیادہ سخی ہوں اور میرے بعد وہ شخص سب سے زیادہ سخی ہے جو علم حاصل کرتا ہے اور اس کو پھیلا دیتا ہے وہ قیامت کے دن بمنزلہ ایک امیر کے آئے گا یا اس طرح فرمایا کہ مانند ایک گروہ کے۔ (ترجمہ)

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے علم حاصل کرنے والے (متعلم) اور علم کو دوسروں تک پھیلانے والے (معلم) کو سخی کا مرتبہ عطا کیا ہے یہ وہ اعزاز ہے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق اللہ تعالیٰ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل ہے۔ علم سے وابستہ افراد وہ معلم ہوں یا متعلم انہیں روز قیامت بھی عزت و احترام کی خوشخبری دی گئی ہے اس طرح تعلیمی عمل کو خداوند تعالیٰ اور آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر اعتبار سے محترم اور مقدس کام قرار دیا ہے۔ اشاعت علم کے فریضے کی ادائیگی کے دوران متعلمین کی تعداد اور حیثیت سے معلمین کے مرتبے اور حیثیت پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔ حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ تیری وجہ سے ایک آدمی کو بھی ہدایت فرما دے تو یہ بات تیرے لیے سرخ اونٹوں سے بہتر ہے (سرخ اونٹ کا مالک ہونا اس دور کے عرب معاشرے میں صاحب ثروت ہونے کی علامت تھی) جس طرح متعلمین کی کثرت اور قلت کے باوجود تعلیم دینا متبرک عمل ہے اسی طرح نصاب اور زیر تدریس اسباق اور موضوعات کی کثرت اور قلت بھی اس فریضے کی فضیلت میں رکاوٹ نہیں بنتے۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

نے کہ پہنچاؤ میری طرف سے اگرچہ ہو ایک ہی آیت (یعنی میری نہایت ہی مفید حدیثیں لوگوں تک پہنچاؤ اگرچہ وہ تھوڑی ہی ہوں) اور بنی اسرائیل سے جو قصے سنو ان کو لوگوں کے سامنے بیان کرو اس میں کوئی گناہ نہیں اور جو شخص جان بوجھ کر میری طرف سے جھوٹی باتیں منسوب کرے گا وہ اپنا ٹھکانہ دوزخ میں تلاش کرے (بخاری)[1]

اشاعت علم کے بارے میں مندرجہ بالا احکامات خداوندی اور ارشادات نبوی سے اندازہ ہوتا ہے کہ مسلمانوں نے اس فریضہ کو وسیع پیمانے پر سرانجام دیا تھا۔ اس کے ثمرات بہت ہی مختصر عرصے میں نمایاں ہونا شروع ہو گئے اور وہ قوم جس کے بارے میں یہ روایت عام تھی کہ اس میں پڑھے لکھوں کی تعداد صرف سترہ تھی علمی اعتبار سے اس منصب تک پہنچی کہ کم و بیش ڈیڑھ ہزار سے زائد صحابہ تو ایسے تھے جن سے احادیث کی روایات ملتی ہیں[2] یہ سارا تعلیمی انقلاب آنے میں کوئی زیادہ طویل عرصہ نہیں لگا۔ بلکہ بمشکل تمام پچیس سال سے بھی کم وقت میں مسلمانوں میں یہ نمایاں تبدیلی محسوس کی جانے لگی ایسا لگتا ہے جیسے حضورؐ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں تعلیم کو سب سے زیادہ ترجیح Priority دی گئی معلمی کے کام میں مصروف افراد کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسروں پر ترجیح بھی دی مختلف انتظامی عہدے دیتے وقت بھی ان اساتذہ کو فوقیت دی گئی۔ ان سب لوگوں کا اس حد تک خیال رکھا گیا کہ معاشرہ میں انہیں انتہائی باوقار مقام حاصل ہو گیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے درس و تدریس سے وابستہ افراد کے لیے نت نئی ترغیبات Incentives رائج کیں۔ حکومت اور امامت کے منصب یا لشکر کی سرداری کے لیے بھی علم کو معیار بنایا گیا بعض صحابہ کو یہ منصب صرف اس لیے عطا کیے گئے کہ وہ قرآن پاک کی تعلیم سے آگاہ تھے یا انہیں قرآن پاک حفظ تھا۔ ایک صحابی حضرت عبداللہ بن جعفرؓ کو ایک بار لشکر کی سرداری کے لیے منتخب کیا گیا۔ آپ کے انتخاب کی واحد وجہ آپ کا علم تھا اور باقی لوگوں کے مقابلے پر آپ کو سورہ بقر یاد ہونے کی وجہ سے یہ منصب ملا[3] تعلیم یافتہ صحابہ کو مختلف انتظامی عہدوں پر فائز کرتے وقت دو مقاصد سامنے رکھے جاتے تھے

---

[1] مشکوٰۃ شریف مترجم جلد اول کتاب العلم صفحہ ۹۴

[2] شبلی نعمانی؛ مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم۔ قومی پریس لکھنؤ ۱۸۸۷ء صفحہ ۵

[3] امیر الہدیٰ؛ مسلمانوں کے علمی و ثقافتی کارنامے۔ قمر کتاب گھر۔ کراچی صفحہ ۲۰

اول یہ کہ وہ عام لوگوں کے مسائل کو بہتر طور پر سمجھ سکتے ہوں دوسرے وہ تعلیم و تربیت کے معاملے میں دوسروں کی رہنمائی بھی کرتے رہیں۔

اساتذہ کی تعداد میں اضافہ

جیسے جیسے اسلام کی دعوت عام ہوتی گئی جاننے والوں کی تعداد میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سیکھنے والے صحابہ کرام نے مختلف علاقوں میں جا کر لوگوں کو اسلام کی تعلیم دی اور جہاں تک ممکن ہوسکا دوسروں کو بھی ایسا ہی کرنے کی ترغیب دی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ لوگوں کو تعلیم دینے کے لیے اساتذہ کی تعداد میں اضافہ ہونے لگا۔ بعض قبائل خود آتے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے گزارش کرتے کہ انہیں کسی معلم کی ضرورت ہے جبکہ کئی مقامات پر ضرورت محسوس کرتے ہوئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم تعلیم دینے کے لیے خود ہی اساتذہ کے وفود روانہ فرماتے تھے۔ اندازہ ہوتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے افراد کا جو پڑھانے کی صلاحیت رکھتے تھے اور معلم بننے کے معیار پر پورے اترتے تھے کوئی پول Pool قائم کر رکھا تھا۔ حسب ضرورت اسی پول سے اساتذہ کو مختلف مقامات اور قبائل کی طرف روانہ کیا جاتا تھا اس کا اندازہ بہت سے واقعات سے ہوتا ہے۔ مثلاً نبوت کے بارھویں سال مدینے کے بارہ افراد مکے آئے اور جب واپس جانے لگے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت مصعب بن عمیرؓ کو ان کے ہمراہ کر دیا تاکہ وہاں لوگوں کو مزید تعلیم دیں۔ حضرت مصعب بن عمیرؓ جب مدینے پہنچے تو انہوں نے اسعد بن زرارہ کے گھر قیام کیا۔ آپ کی تبلیغ اور تعلیم کے نتیجے میں وہاں اگلے ہی برس تقریباً پچھتر افراد نے اسلام قبول کر لیا۔[1] حضرت مصعب بن عمیرؓ کو روانہ کرتے وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے ذمہ یہ تین فرائض لگائے تھے (۱) لوگوں کو قرآن پڑھائیں۔ (۲) اسلام کی تعلیم دیں اور (۳) مسجد میں امامت کے فرائض ادا کریں۔ آپ اشاعت علم میں حد درجہ مخلص تھے اسی لیے حُبَر (نیک عالم اور علامہ) کے نام سے مشہور ہوئے اہل مدینہ آپ کے کام کی مناسبت سے آپ کو المقرئی (پڑھانے والا استاد) کہا کرتے تھے۔ یہ عظیم ماہر علم و فن غزوہ احد میں شہید ہوئے (آپ ہی تھے جن کی تدفین کے لیے دھاری دار چادر

---

[1] سلمان منصور پوری: رحمت اللعالمین (جلد اول) صفحات ۹۹ - ۹۷

کا کفن ڈالا گیا عسرت کا یہ عالم تھا کہ چادر چھوٹی تھی سر ڈھانکتے تو پیر کھل جاتے اور پیر ڈھانکتے تو سر کھل جاتا آخر سر کو چادر سے ڈھانکا گیا اور پیروں کو گھاس سے چھپا دیا گیا)۔

غزوہ احد کے بعد کچھ آدمی بہانہ بنا کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور تعلیم و تربیت کے لیے چند صحابہ کرام کو ساتھ کرنے کی درخواست کی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دس معلمین کو روانہ کر دیا ان کا قائد حضرت عاصم بن ثابتؓ کو مقرر کیا گیا کفار نے دھوکے سے ان تمام معلمین کو شہید کر دیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے باوجود اشاعت اسلام کا سلسلہ جاری رکھا سن چار ہجری میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ستر یا چالیس بہترین مسلمان معلمین کا انتخاب فرمایا اور انہیں نجد روانہ کیا حضرت منذر بن عمروؓ کو اس وفد کا سربراہ مقرر کیا گیا۔ طبری کی تحقیق کے مطابق معلمین کے اس وفد کی حفاظت کی ذمہ داری ایک غیر مسلم ابو براء نے لی تھی اور اسی کی ضمانت کی وجہ سے یہ وفد روانہ کیا گیا تھا۔[1] ان دو واقعات سے اندازہ ہوتا ہے کہ مسلمانوں میں اشاعت علم کا سلسلہ فروغ پا رہا تھا اور ان میں معلمین اور اساتذہ کی تعداد روز بروز بڑھتی جا رہی تھی۔
چوتھی صدی ہجری میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ستر معلمین کا ایک وفد روانہ فرمایا تھا اس کے بیشتر معلمین کو دھوکے سے شہید کر دیا گیا۔ ان میں سے چند صحابہ کرام زندہ بچ گئے تھے[2] شہید ہونے والے تقریباً تمام ہی صحابہ قرا تھے اور انہیں ناظرہ قرآن کی تعلیم دینے کے لیے بھیجا گیا تھا۔[3] مختلف علاقوں میں بھیجے جانے والے ان معلمین میں اپنے فرض سے والہانہ لگاؤ تھا اور وہ دوسروں کی ہلاکت اور نقصان کی خبریں سننے کے باوجود اسلامی تعلیمات عام کرنے کے لیے پیش پیش تھے۔ اساتذہ کی ثابت قدمی اور اپنے کام سے وابستگی Firm Commitment کی ایک مثال غزوہ احد کے فوراً بعد رونما ہونے والے ایک واقعہ سے ملتی ہے۔ خالد ہذلی نامی ایک کافر مسلمانوں پر حملے کی تیاریوں میں مشغول تھا کہ ایک مسلمان حضرت عبداللہ بن انس کے ہاتھوں مارا گیا اس کے قبیلے کے لوگوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے آ کر کہا کہ ہم مسلمان ہو گئے ہیں ہمارے ساتھ کچھ افراد کر دیں تاکہ وہ ہمیں قرآن اور دینی مسائل کی تعلیم دیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے

---

[1] ابن جریر طبری، تاریخ طبری حصہ اول (سیرۃ النبیؐ) مترجم سید محمد ابراہیم۔ نفیس اکیڈمی ۱۹۶۰ء صفحہ ۲۶۱

[2] سلمان منصور پوری: رحمت اللعالمین۔ جلد اول۔

[3] شاہ معین الدین احمد ندوی: تاریخ اسلام غضنفر اکیڈمی کراچی ۱۹۷۵ء صفحہ ۱۹۶۔

چھ معلمین ان کے ہمراہ کر دیئے۔ جب سب لوگ مقام رجیع تک پہنچے تو سازش کے مطابق قبیلے ہذیل کے لوگوں نے مسلمانوں کو حراست میں لے لیا، مسلمانوں نے مقابلہ کیا اور تین مسلمان شہید ہو گئے باقی تین کو گرفتار کر لیا گیا۔ انہیں مکے لیجانے لگے تو راستے میں عبداللہ بن طارقؓ نے خود کو آزاد کر لیا اور تلوار اٹھالی کافروں نے تیروں سے آپ کو چھلنی کر دیا۔ باقی دو معلمین مکے میں فروخت کر دیئے گئے، ان میں سے ایک حضرت زید بن وثنہؓ تھے جنہیں صفوان بن امیہ نے خریدا تاکہ اپنے باپ امیہ بن خلف کے بدلے میں انہیں قتل کر دے صفوان کے غلام نے آپ کو شہید کر دیا۔ تیسرے معلم حضرت خبیبؓ کافی دن کفار مکہ کی قید میں رہے اس کے بعد انہیں بھی قتل کر دیا گیا۔ انہوں نے آخری خواہش کے طور پر دو رکعت نماز ادا کی، اس وقت آپ نے کہا کہ خدا کی قسم اگر مجھے یہ خیال نہ ہوتا کہ تم لوگ سوچو گے کہ میں موت کے ڈر سے نماز کو طول دے رہا ہوں تو میں کچھ دیر اور نماز پڑھتا۔[1] یہ واقعہ اشاعت علم سے مسلمانوں کی گہری وابستگی کی انتہائی درخشاں مثال ہے، کہ انہوں نے انتہائی مشکل حالات میں بھی فرض سے وابستگی قائم رکھی۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف علاقوں میں ایسے لوگوں کا تقرر بھی کیا جو اپنے اپنے علاقوں کے تعلیمی اور مذہبی امور کے نگران بنائے گئے ابتدا ہی میں مدینے کے ایسے بارہ افراد کو خاصی شہرت حاصل ہوئی۔ ان لوگوں کو اسلام قبول کرنے کے بعد اپنی اپنی قوموں کا کفیل اور اشاعت اسلام کا نقیب مقرر کیا گیا ان لوگوں میں اسعد بن زرارہ (جو ابو امامہ کے نام سے مشہور ہوئے) رافع بن مالک، عبادہ بن صامت، سعد بن ربیع، منذر بن عمرو، عبداللہ بن رواحہ، براء بن معرور، عبداللہ بن عمرو بن حرام، سعد بن عبادہ، اسید بن حضیر، سعد بن خیثمہ اور ابو الہیثم بن تیہان شامل تھے۔[2] بعض مورخین کے خیال میں ان بارہ نقیبوں میں ابو الہیثم بن تیہان نہیں بلکہ رفاعہ بن عبدالمنذر شامل تھے۔[3] تعلیم و تدریس کے اس حد تک ہمہ گیر انتظامات اور بحیثیت معلم سینکڑوں صحابہ کرام کی روانگی سے اس امر کا اندازہ لگانا بہت آسان ہو جاتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے مشن کو آگے بڑھانے کے لیے درس و تدریس کو بہت اہمیت دی تھی۔

---

[1] ڈاکٹر محمد حسین ہیکل، سیرۃ الرسولؐ (حیاۃ محمدؐ) مترجم مولانا محمد وارث کامل مرحوم، مکتبہ کارواں لاہور ۱۹۶۴ء، صفحات ۲۸۱-۲۸۳

[2] سلمان منصور پوری، رحمت اللعالمین، جلد اول صفحہ ۱۰۱۔

[3] محمد بن ہشام، سیرۃ (ابن ہشام) مترجم شیخ محمد اسماعیل مقبول اکیڈمی لاہور ۱۹۸۷ء

اساتذہ کا باقاعدہ تقرر

اسلام کی تبلیغ کے ساتھ ساتھ لوگوں کو تعلیم دینے کے لیے معلمین کی باقاعدہ تقرری کا سلسلہ بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ہی میں شروع ہو چکا تھا مسجد نبوی میں تعلیم دینے والے ایک معلم حضرت عبادہ بن صامت رض کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہی اس کام پر مامور کیا تھا۔ آپ ابتدائی عہد کے ان پانچ مسلمانوں میں شامل تھے جنھوں نے قرآن پاک حفظ کر لیا تھا۔ آپ کی یہی خصوصیت آپ کے معلم بننے کا سبب بنی [۱] ایک روایت کے مطابق حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بنی الحارث بن کعب کے وفد کی واپسی کے بعد بنی نجار کے عمرو بن حزم انصاری رض کو یمن کا والی مقرر کیا۔ یہ منصب عطا کرتے وقت آپ کے تقرر نامہ کے طور پر جو فرمان جاری کیا گیا تھا وہ تحریری شکل میں تھا۔ اس فرمان میں یہ صراحت تھی کہ آپ لوگوں کو قرآن کی تعلیم دیں اور ارکان اسلام سمجھائیں [۲] آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دس ہجری میں حضرت ابی بن کعب رض کو بھی ایک وفد کے ساتھ روانہ کیا تھا انہیں روانہ کرتے وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تحریر میں یہ ہدایت کی تھی کہ آپ وہاں کے لوگوں کو شرائع اسلام یاد کرائیں۔ جاتے وقت احتیاطاً آپ کو شرائع اسلام لکھ کر بھی دیئے گئے تاکہ آپ اسی کے مطابق تعلیم دیں [۳] دس ہجری سے تھوڑا پہلے قبیلہ تجیب کے کچھ لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے وہ لوگ زکوٰۃ لے کر حاضر ہوئے تھے اور یہ چاہتے تھے کہ انہیں قرآن اور سنت کی تعلیم دی جائے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کام کے لیے حضرت بلال رض کو متعین فرمایا [۴] حضرت بلال رض کی طرح مشہور و معروف سپہ سالار حضرت خالد بن ولید کو بھی یہ فرض سونپا گیا تھا۔ انہیں فتح مکہ کے بعد سلیم بن منصور اور مولج بن مرہ کے قبائل کے افراد کے ساتھ مختلف عرب قبائل کی طرف روانہ کیا گیا تھا۔ اس مشن کی تکمیل کے دوران کسی بات پر بنی حذیمہ کے علاقے میں قتل و جدال بھی ہو گیا تھا [۵]

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دربار سے معلمین کی باقاعدہ تقرری کی ایک اور شہادت حضرت

---

[۱] سید شبلی نعمانی: الفاروق صفحہ ۵۴

[۲] ابن جریر طبری: تاریخ طبری (حصہ اول سیرۃ النبی ص) مترجم سید محمد ابراہیم نفیس اکیڈمی ۱۹۶۷ء صفحہ ۴۶۲

[۳] سلمان منصور پوری: رحمت اللعالمین: جلد اول صفحہ ۲۳۰ [۴] ایضاً

[۵] محمد بن ہشام سیرۃ ابن ہشام مترجم شیخ محمد اسماعیل مقبول اکیڈمی لاہور ۱۹۶۷ء صفحہ ۵۰۵

معاذ بن جبلؓ اور حضرت ابو موسیٰ اشعری کا تقرر ہے انہیں نومسلموں کو قرآن کی تعلیم دینے کے لیے یمن میں متعین کیا گیا تھا۔[1] حضرت معاذ بن جبلؓ کا انتقال ۱۸ھ میں ہوا آپ کو خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یمن میں بیک وقت معلم اور قاضی کے دو عہدوں پر مقرر کیا تھا۔ آپ ابتدائی دور کے انتہائی عظیم ماہرین تعلیم میں شمار ہوتے تھے۔ جن کے بارے میں حضرت عمرؓ کا مشہور قول ہے کہ عورتیں معاذؓ جیسا انسان پیدا کرنے سے عاجز ہیں۔ کئی بار علمی معاملات میں حضرت عمرؓ نے آپ سے رجوع کیا تھا۔ آپ کہا کرتے تھے کہ اگر معاذؓ نہ ہوتے تو عمرؓ کی ہلاکت یقینی تھی۔ اساتذہ کے تقرر کی ایک اور شہادت یمن ہی سے ملتی ہے۔ یہاں تین ہجری میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمرو بن حزمؓ کو عامل مقرر کیا تھا ان کے فرائض منصبی میں تعلیم کی اشاعت کا فریضہ بھی شامل تھا

مندرجہ بالا حوالوں سے یہ بات پایہ تصدیق کو پہنچ جاتی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اساتذہ کے باقاعدہ تقرر کا سسٹم رائج فرمایا اور جیسا کہ پہلے ہی بیان کیا جا چکا ہے ایک پول قائم کیا جہاں سے ضرورت پڑنے پر اساتذہ کو دوسری جگہوں پر متعین کیا جاتا تھا۔ آپ نے بیشتر اساتذہ کو نہ صرف تحریری تقرر نامے Appointment letters دیئے بلکہ ان تقرر ناموں میں ان کے فرائض منصبی اور ان امور کا تذکرہ بھی کیا جن کی تعلیم دینے کے لیے انہیں مقرر کیا گیا تھا۔ یہ طریقہ کار اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ تعلیمی شعبہ میں اساتذہ کے انتخاب ان کے تقرر اور ان کی ذمہ داریوں اور فرائض کے بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کئی اصول مقرر فرمائے تھے

شرائط تقرری

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں اساتذہ اور مبلغین کے باقاعدہ تقرر کے ساتھ ساتھ اس امر کے شواہد بھی ملتے ہیں کہ جن افراد کا اس حیثیت سے تقرر کیا جاتا تھا ان کے لیے علمی قابلیت کی کچھ خصوصیات اور حدود کا تعین کر لیا گیا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں اساتذہ صرف قرآن اور اسلامی تعلیمات ہی کے لیے مقرر نہیں کیے گئے تھے بلکہ انہیں ان کے علاوہ دوسرے مضامین کی تدریس کی ذمہ داریاں بھی دی گئی تھیں۔ متعلقہ مضمون کے استاد کی تقرری کے لیے اس مضمون میں ایک خاص سطح تک مہارت لازمی تھی۔ جیسے صفہ کے اساتذہ میں سے حضرت عبادہ بن صامت کا تقرر

---

[1] حاجی معین الدین ندوی: مہاجرین (حصہ اول) دارالمصنفین اعظم گڑھ۔ طبع ثانی ۱۹۵۱ء

قرآن پڑھانے کے لیے کیا گیا تھا۔ کیونکہ آپ قرآن حفظ کر چکے تھے[1] ایک اور معلم حضرت معاذ بن جبل نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے علم حاصل کیا تھا وہ کافی عرصہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں رہے تھے پھر بھی ان کی تقرری کے موقع پر ان کا باقاعدہ امتحان لیا گیا۔ یہ امتحان زبانی Oral تھا اور اسے انٹرویو کہا جا سکتا ہے۔ آپ کو یمن بھیجنے سے پہلے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ سے پوچھا کہ وہاں فیصلے کیسے کرو گے۔ انہوں نے جواب دیا کہ کتاب اللہ سے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسرا سوال کیا کہ اگر اس میں نہ پاؤ تو انہوں نے جواب دیا کہ سنت رسول سے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تیسرا سوال کیا کہ اس میں بھی نہ پاؤ تو انہوں نے عرض کیا کہ اجتہاد سے۔ بحیثیت معلم تقرری کے لیے ہونے والا یہ انٹرویو یہیں پر ختم ہو گیا اور آپ کے تسلی بخش جوابات کے نتیجے میں آپ کا انتخاب Selection عمل میں آیا۔ حضرت معاذ بن جبلؓ کے ان جوابات سے مسلمانوں کو فقہ کے اصول متعین کرنے میں بڑی رہنمائی ملی[2] آپ صلی اللہ علیہ وسلم عام حکمرانوں کی طرح صرف منتظم اعلیٰ ہی نہیں تھے بلکہ علم و فضل میں بھی سب سے ممتاز حیثیت رکھتے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جن لوگوں کی بحیثیت معلم تقرریاں کیں انہیں دوسروں کے مقابلے پر علمی اعتبار سے یقیناً امتیازی حیثیت حاصل تھی اسی لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم جیسے ماہر تعلیم نے ان کا انتخاب کیا۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے معلمین کے انتخاب کے لیے فضیلت Merit کا تعین کرتے وقت صرف علمی قابلیت جیسی اکتسابی خصوصیات ہی کو نہیں بلکہ انکساری اور خلوص جیسی فطری خصوصیات کو بھی بنیاد بنایا تھا۔ تدریس کے کام سے لگاؤ اور فرائض کو دیانتداری سے ادا کرنا چند ایسی بنیادی شرائط تھیں جو اساتذہ کے لیے لازمی تھیں۔ چونکہ بیشتر صحابہ کرام نے براہ راست آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہی تعلیم حاصل کی تھی اس لیے دوران تعلیم جن اصحاب کی کارکردگی اطمینان بخش رہی آپؐ نے انہی کو تعلیم و تدریس کے شعبے میں متعین کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اساتذہ کا تقرر کرتے وقت مضمون اور مہارت کی اہمیت کو بھی پیش نظر رکھا یہی وجہ ہے کہ بالکل ابتدائی دور میں تعلیم عام کرنے کے لیے بدر کے ان قیدیوں سے یہ کام لیا گیا جو کافر تھے[3]

---

[1] سید شبلی نعمانی: الفاروق صفحہ ۵

[2] مولانا سعید انصاری: سیر انصار (حصہ دوم) دار المصنفین اعظم گڑھ طبع دوم ۱۹۴۸ء صفحہ ۱۱۲

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں اساتذہ کے تقرر کے لیے قابلیت اور خصوصیات کی طرح عمر کے واضح تعین کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ بہت ممکن ہے ابتدائی دور میں تعلیم عام کرنے کے عظیم مقصد کے پیش نظر کچھ شرائط کو نرم رکھا گیا ہو۔ اس دور میں سن رسیدہ لوگوں کے ساتھ نوعمر لوگوں کے تقرر کی شہادتیں بھی ملتی ہیں۔ مثلاً سن تین ہجری میں جب عمرو بن حزمؓ کو یمن کی حکومت کے ساتھ ساتھ وہاں کی تعلیمی نگرانی بھی سونپی گئی تھی اس وقت ان کی عمر سترہ سال تھی۔ ایک دوسرے نوعمر صحابی حضرت عثمان بن ابی العاصؓ تھے۔ انہیں علم دین اور علم قرآن حاصل کرنے کا بہت شوق تھا۔ انہوں نے اپنے تئیں اس شعبے میں کسی حد تک مہارت بھی حاصل کر لی تھی۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے یہ ذوق وشوق دیکھتے ہوئے ان کے لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سفارش کی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا انتخاب کر لیا۔[1] غرض کئی شہادتیں ملتی ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ تقرر کے لیے عمر کی کوئی قید مقرر نہیں تھی اساتذہ نوعمر بھی تھے اور بوڑھے بھی۔ ہر صورت میں علمیت اور مہارت ہی کو معیار قرار دیا گیا تھا۔ اس معیار کا تعین آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے بھی ہوتا ہے جو مکحول سے روایت ہے۔ کہ بوڑھا آدمی جوان سے علم حاصل کرنے میں نہ شرمائے۔ یہ اصول اسی لیے رائج کیا گیا کہ تعلیم کو زیادہ سے زیادہ وسعت دی جائے۔ اساتذہ کے انتخاب میں عمر کی طرح کسی خاص علاقے یا قوم یا قبیلے سے تعلق رکھنے کی بھی کوئی شرط نہیں تھی۔ صرف صلاحیت کو سب سے بڑا معیار قرار دیا گیا تھا۔ صلاحیت اور قابلیت ہی کی بات تھی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عم زاد حضرت عبداللہ بن عباسؓ جو خود بہت بڑے مفسر اور عالم تھے مزید معلومات کے لیے غلاموں سے بھی رجوع کرتے تھے۔ حالانکہ انہیں کئی علوم میں مہارت کی وجہ سے بحر العلوم کا خطاب مل چکا تھا۔ پھر بھی حصول علم کے معاملے میں پوچھنے اور سیکھنے میں قطعی ہچکچاہٹ محسوس نہ کرتے۔ اکثر ایسا ہوتا کہ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے غلام حضرت اسلمؓ کی خدمت میں مع کاتب کے حاضر ہو جاتے اور معلوم کرتے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فلاں دن فلاں وقت کیا ارشاد فرمایا تھا۔ حضرت اسلمؓ (جو ابورافع کے نام سے مشہور تھے اور جنہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے آزاد فرما دیا تھا) بیان کرتے جاتے اور کاتب قلمبند کرتے جاتے تھے۔[2]

---

[1] محمد بن ہشام: سیرۃ (ابن ہشام) مترجم شیخ محمد اسماعیل۔ مقبول اکیڈمی۔ لاہور ۱۹۶۱ء صفحات ۵۵۱ – ۵۴۸

[2] شاہ معین الدین احمد ندوی: مہاجرینؓ (حصہ دوم) دار المصنفین اعظم گڑھ۔ طبع دوم ۱۹۵۲ء صفحہ ۲۴۸

مضمون میں مہارت

عہد رسالت مآب ہی میں مختلف مضامین کی تدریس کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا معلمین کے لیے متعلقہ مضمون میں مہارت لازمی تصور کی جاتی تھی۔ بہت سے معلمین نے تو اپنے مضمون کے حوالے سے بڑی شہرت حاصل کی مسلمان علما میں مضمون میں مہارت کی یہ خصوصیت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے چند ہی سال بعد یعنی حضرت عمرؓ کے عہد میں عروج پر پہنچ گئی تھی اور یہ باتیں مشہور تھیں کہ کسی کو فقہ کا علم حاصل کرنا ہے تو فلاں صحابی سے رجوع کرے اور کسی کو تر کے کا علم حاصل کرنا ہے تو فلاں معلم سے رجوع کرے۔ مختلف معلمین کو مختلف مضامین میں سند Authority سمجھا جانے لگا تھا۔ اس خصوصیت کا آغاز آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات ہی میں ہو چکا تھا کئی معلمین ایسے تھے جنہیں بیک وقت کئی مضامین پر عبور حاصل تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے عم زاد حضرت عبداللہ بن عباسؓ بھی ایسے معلمین میں شامل تھے (وہ آپؐ سے عمر میں تین برس چھوٹے تھے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بچپن ہی میں ان کے منہ میں اپنا لعاب دہن لگایا تھا اور دعا فرمائی تھی کہ اے اللہ اسے دین کی سمجھ عطا فرما اور تاویل کا علم سکھا اے اللہ اس کے علم میں برکت دے اور اس کے علم کو پھیلا) حضرت عبداللہ بن عباسؓ کو قرآن کا حقیقی ترجمان سمجھا جاتا تھا۔ اپنے عہد میں آپ ہی اس شعبے کے سب سے بڑے ماہر تھے۔ آپ کے بارے میں مشہور ہے کہ آپ شعر و شاعری۔ صرف و نحو، تاریخ اور ریاضی کا درس بھی دیتے تھے[1] ابتدائی دور کے معلمین میں حضرت معاذؓ بن جبل نے بھی فقہ کے علم میں بہت شہرت حاصل کی اسی طرح فتاویٰ کے علم میں بھی کئی صاحب کمال صحابی موجود تھے۔ اس شعبے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں بھی ایک سو اکتیس صحابہ ایسے تھے جنہیں فتاویٰ میں عبور حاصل تھا۔

ان میں کئی خواتین بھی شامل تھیں۔ ان لوگوں میں سے حضرت عمرؓ حضرت علیؓ، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، حضرت زید بن ثابتؓ، حضرت عبداللہ بن عباسؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ اور حضرت عائشہؓ اس علم میں بہت نمایاں مقام رکھتے تھے[2]

---

[1] سید امیر علی، اسپرٹ آف اسلام، مترجم محمد ہادی حسین۔ ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور، طبع سوم ۱۹۸۳ء صفحہ ۵۳۵۔

[2] ڈاکٹر حسن ابراہیم حسن، النظم الاسلامیہ مترجم مولوی علیم اللہ، مسلمانوں کا نظم مملکت۔ ندوۃ المصنفین دہلی طبع دوم ۱۹۵۹ء صفحہ ۳۰۳

حضور کے عہد میں مختلف علوم وفنون میں مہارت Specialisation حاصل کرنے والوں میں حضرت عثمان غنی رض کا اسم مبارک بھی شامل ہے۔ آپ نے فقہ میں کمال حاصل کیا۔ فقہ کے علاوہ آپ کو علم الفرائض اور کے حساب میں بھی مہارت حاصل تھی۔ علم الفرائض (علم ترکہ) میں آپ کے علاوہ حضرت زید بن ثابت رض کو بھی مہارت حاصل تھی۔ یہ تمام مضامین ایسے تھے جن کی تدریس کی اس دور میں ضرورت محسوس کی جاتی تھی۔ یہ کمال اور مہارتیں حاصل کرنے کے لیے اس دور میں معلمین کو تحقیق وجستجو کے لیے طویل مدت صرف کرنی پڑی تھی۔

حضرت عبداللہ بن عمر رض کے بارے میں مشہور ہے کہ انہوں نے بڑی فکر وتدبر سے علم حاصل کیا تھا۔ سورۃ بقرہ پر آپ نے چودہ برس تک تحقیق کی۔ چونکہ آپ نے اپنی زندگی کے ابتدائی پندرہ سال حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں گزارے تھے اسی لیے عین عالم شباب میں قرآن فہمی میں کمال حاصل کر چکے تھے۔ آپ مذہبی علوم خصوصاً قرآن، حدیث، فقہ اور تفسیر میں بحر بیکراں تھے۔ مختلف مواقع پر آپ کو اعلیٰ انتظامی عہدوں کی پیش کش بھی ہوئی لیکن تدریس سے آپ کے پیشہ دارانہ لگاؤ Professional devotion کا یہ عالم تھا کہ آپ نے کوئی اور عہدہ قبول نہیں کیا۔ آپ کا مستقل حلقہ درس مدینے میں قائم تھا اور زندگی بھر وہیں درس دیتے رہے۔ اس طرح پوری زندگی درس وتدریس میں گزار دی۔[1] قرآن کی تعلیم وتدریس میں مہارت رکھنے والے ایک صحابی رسول صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابو درداء رض تھے آپ نے قرآن کریم حفظ کر لیا تھا اور آپ قرآن کی تدریس پر مامور تھے۔ انہیں حضرت عمر رض کے عہد میں شام بھیجا گیا تھا جہاں یہ دمشق کی جامع مسجد میں درس قرآن دیا کرتے تھے۔ آپ کی وجہ سے اس ادارہ کو قرآن کی تدریس کے مدرسہ اعظم کی حیثیت حاصل ہوگئی۔ اس مدرسہ میں آپ کے ماتحت کئی اور اساتذہ بھی درس وتدریس کے فرائض سرانجام دیتے تھے جن میں آپ کی زوجہ محترمہ بھی شامل تھیں۔ اکثر وبیشتر ایسا ہوتا تھا کہ یہاں کے اساتذہ کے لیے جب کوئی مشکل ہوتی یا طالب علموں کے سوالات کے جوابات نہ دے پاتے تو وہ اپنی مدد کے لیے آپ (ابوالدرداء رض) سے رجوع کرتے تھے۔[2]

اس دور کے چند ماہرین علم وفن سے اندازہ ہوتا ہے کہ عہد رسالت میں ہی مسلمانوں میں مختلف

---

[1] شاہ معین الدین احمد ندوی: مہاجرین (حصہ دوم) دار المصنفین اعظم گڑھ طبع دوم ۱۹۵۲ء صفحات ۱۸۔۱۳

[2] مولانا سعید انصاری: سیر انصار (حصہ اول ودوم) دار المصنفین اعظم گڑھ طبع دوم ۱۹۴۸ء صفحہ ۱۵۵۔

مضامین کی تدریس کا آغاز ہو چکا تھا۔ یہ مضامین پڑھانے کیلئے انہی افراد کا تقرر کیا جاتا تھا جو ان میں خصوصی مہارت رکھتے تھے۔ چند محققین کے مطابق آپؐ ہی کے دور میں مسلمانوں میں یک فنی ذوق کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ بعض غیر مصدقہ احادیث کے مطابق حضرت عمرؓ کے عہد میں نہیں بلکہ عہد نبوی ہی میں یہ روایت مستحکم ہونے لگی تھی۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم خود فرماتے تھے کہ جسے قرآن سیکھنا ہو فلاں صحابی کے پاس جائے اور جسے تجوید یا تقسیم ترکہ کا حساب سیکھنا ہو فلاں کے پاس جائے (واللہ اعلم)[1]

علما اور امراء کا تعلق

اساتذہ کو قناعت اور صبر سے زندگی گزارنے اور دولت اور اقتدار سے دور رہنے کی تلقین کی گئی تھی۔ آپ نے خود بھی علما کو امرا اور صاحب ثروت لوگوں سے دور رہنے کے لیے کہا تاکہ اساتذہ کی عزت نفس کا تحفظ ہو اور علم کی قدر و منزلت اور احترام بھی برقرار رہے۔ امرا کی پر تعیش زندگی علما اور اساتذہ کو اس جانب مائل کرنے کا سبب بن سکتی تھی۔ اسی لیے ترغیبات کا یہ سلسلہ ہی بند کر دینے کی ہدایت کی گئی۔ اسی تربیت کا نتیجہ تھا کہ اساتذہ انتہائی تنگدستی کے باوجود خلوص اور دیانتداری سے حصول علم اور اشاعت علم میں مصروف رہے۔ انہوں نے نہ اعلیٰ عہدوں اور جاہ و منصب کی نہ خود تمنا کی اور نہ ہی ایسے افراد سے مرعوب ہوئے۔ عہد نبوی میں ہی علما میں ایسی بے شمار مثالیں ملتی ہیں جن سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے کہ وہ علم ہی کو سب سے بڑا سرمایہ اور منصب سمجھا کرتے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی کثیر علم اور قلیل دولت کی وجہ سے کسی کو کمتر نہیں سمجھا بلکہ قلیل علم اور کثیر دولت کو غیر مناسب سمجھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دولت اور اقتدار کی ہوس سے اساتذہ کو دور رکھنے کے لیے انہیں اللہ کے غضب سے ڈرایا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد تھا کہ حکام کے پاس دوڑنے والا فتنے کا نشانہ بن جاتا ہے۔ امرا اور صاحبان اقتدار سے دور رہنے کی ایک روایت حضرت انسؓ سے ملتی ہے اس روایت کے مطابق آپؐ نے فرمایا کہ علما انبیا کے امین ہیں لیکن بادشاہوں سے ربط رکھیں گے تو گویا انبیا سے خیانت کریں گے۔

اللہ کے غضب اور دین میں خیانت ، جیسے قبیح افعال کی مثالیں دے کر علماء اور اساتذہ کو دراصل اس لالچ اور حرص سے روکنا مقصود تھا جو امراء اور صاحب اقتدار لوگوں کی قربت کی وجہ سے پیدا ہو سکتا تھا۔ اس کا مطلب قطعی طور پر یہ نہیں تھا کہ ان لوگوں کے مابین

---

[1] محمد حمید اللہ: عہد نبوی کا نظام حکمرانی، جلد اول، مکتبہ ابراہیمیہ، حیدرآباد دکن بار دوم ۱۹۴۹ء

معاشرتی تعلقات بھی استوار نہ ہوں بنیادی اصول صرف یہی تھا کہ علما کی حق پرستی اور اپنے منصب سے عقیدت اور وابستگی کو دوسرے غیر ضروری عوامل متزلزل نہ کر سکیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے امراء کے لیے یہ بات کہی کہ وہ علما کی خدمت کے لیے پہل کریں۔ بعض مورخین کے مطابق ان امرا کو اچھا کہا گیا جو علماء کی خدمت کرتے ہیں۔ اس طرح علما اور امرا کے تعلقات کا یہ اصول طے کر کے ان کے معاشرتی مرتبے کا تعین بھی کر دیا گیا۔ آپ کے عہد میں یہ اصول پختہ ہو گیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک اور سارے معاشرے میں علم ہی سب سے بڑی دولت ہے اور وہ لوگ جن کے پاس علم ہے وہ دنیاوی دولت اور خزانے رکھنے والوں سے کہیں آگے ہیں۔

اساتذہ کے لیے مشاہرے کی ضرورت

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں تعلیمی اداروں کے قیام اور ان میں اساتذہ کی تقرری کے بے شمار شواہد موجود ہیں۔ ان اداروں میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے اصحاب نے خود بھی تدریس کے فرائض سرانجام دیئے۔ اساتذہ کے تقرر میں قابلیت اور صلاحیت کا تذکرہ بھی کیا جا چکا ہے اب ایک اور اہم معاملہ باقی رہ جاتا ہے اور وہ یہ ہے کہ اس دور کے اساتذہ کو درس و تدریس کے عوض کوئی معاوضہ ملتا تھا یا نہیں؟ اور کیا اس دور کی مثال کو سامنے رکھتے ہوئے موجودہ دور میں اساتذہ کا مشاہرہ مقرر کرنا یا انہیں تنخواہیں دینا درست عمل ہے یا نہیں؟

اساتذہ کو معاوضہ دینے سے انکار کی کوئی واضح علامت نہیں ملتی البتہ انہیں معاوضہ دینے کی کچھ شہادتیں ضرور ملتی ہیں۔ اس نوعیت کی سب سے پہلی شہادت تو بدر کے وہ غیر مسلم قیدی تھے جنہیں دس یا بارہ بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھانے کے بعد رہائی جیسی نعمت سے سرفراز کیا گیا۔ درس و تدریس اور تبلیغ اسلام سے وابستہ مسلمانوں کے لیے بھی مشاہرہ کی شہادتیں ملتی ہیں البتہ حتمی طور پر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ انہیں معاوضہ کے طور پر نقد رقومات دی جاتی تھیں (اس کا ایک سبب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس دور میں سکے کی دستیابی اور ادائیگی کا موجودہ طریقہ کار اتنا عام نہیں تھا) مثلاً ابتدائی دور میں جب شام کے کچھ لوگ قرآن سیکھنے کے لیے مدینے آئے تو واپسی میں قرآن لکھنے والوں (کاتبوں) کو بھی اپنے ساتھ شام لے گئے۔ یہ لوگ ان کے ساتھ معاوضہ پر گئے تھے اور شامی معاوضتاً انہیں اپنے ساتھ کھانا کھلایا کرتے

تھے ۔ یا الفاظ دیگر قرآن لکھ کر دینے والوں کی کھانے پینے کی ضروریات کی تکمیل ان سے خدمت لینے والوں نے اپنے ذمہ لے لی تھی ۔ ان اصحاب میں سے حضرت ابی بن کعب ؓ واحد شخص تھے جنہوں نے اس معاوضہ کو قبول نہیں کیا وہ اپنے کھانے کا انتظام اپنے طور پر کرتے رہے [1] ان دو مختلف واقعات سے معاوضے یا مشاہرے کی تصدیق تو ہوتی ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ اس امر کی نشان دہی بھی ہو جاتی ہے کہ مشاہرہ یا معاوضہ کے طور پر طالب علموں سے کچھ لینے کی روایت نہیں تھی بعض اصحاب نے تو معاوضہ کے طور پر ان کے پاس کھانا کھانے سے بھی گریز کیا ۔ اس دور کے اساتذہ کے متعلق تفصیلات معلوم کی جائیں تو دو قسم کے افراد سامنے آتے ہیں ۔ کچھ اساتذہ ایسے تھے جو درس و تدریس کے ساتھ اپنے روزگار کے لیے الگ سے کوشش کرتے تھے اور انہوں نے کوئی رقم یا سہولت معاوضہ کے طور پر قبول نہیں کی ۔ ان کے علاوہ کچھ اساتذہ ایسے بھی تھے جو درس و تدریس میں ہمہ وقت مصروف رہتے تھے یہاں تک کہ انہیں اپنے اور اپنے خاندان کی کفالت کے لیے کام کرنے کا موقع بھی نہیں ملتا تھا دوسری قسم کے ان اساتذہ کی کفالت کی ذمہ داری مسلمانوں نے اپنے ذمے لے رکھی تھی اس لیے کہ ان اساتذہ کو اہم قومی اور مذہبی فرائض پر مامور کیا گیا تھا ۔

ایسے علما اور اساتذہ جو محدود وسائل رکھتے ہوں اور جن کے پاس کوئی اور ذریعہ آمدنی نہ ہو ان کی معاشی کفالت کرنا یا ان کے لیے مشاہرہ مقرر کرنا کسی بھی اعتبار سے غیر اسلامی نہیں ہے ۔ اللہ تعالیٰ نے ایسے لوگوں کی کفالت کے لیے ارشاد فرمایا ہے کہ (القرآن)

لِلْفُقَرَآءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ضَرْبًا فِي الْاَرْضِ يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِيَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ تَعْرِفُهُمْ بِسِيْمٰهُمْ لَا يَسْـَٔلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ۝ (البقرہ ۔ ۲ ۔ ۲۷۳) (پ ۔ ۳)

(خیرات) ان فقیروں کے لیے ہے جو روکے گئے ہیں اللہ کی راہ میں نہیں فرصت ملتی انہیں (روزی کمانے کے لیے) چلنے پھرنے کی زمین میں (خیال کرتا ہے انہیں ناواقف (کہ یہ) مال دار (ہیں) بوجہ ان کے سوال نہ کرنے کے ۔ (اے حبیب) آپ پہچانتے ہیں انہیں ان کی صورت سے یہ نہیں مانگا کرتے لوگوں سے لپٹ کر اور جو کچھ تم خرچ کرو گے (اپنے) مال سے بس یقیناً اللہ اسے خوب جاننے والا ہے ۔

---

[1] مولانا سعید انصاری : سیر انصار (حصہ اول و دوم) دار المصنفین اعظم گڑھ طبع دوم ۱۳۴۷ء صفحہ ۱۰۰

ایسے علما اور اساتذہ جو استطاعت نہ رکھتے ہوں ان کی خبر گیری رکھنا اور ان کی معاشی کفالت کے لیے کوئی باعزت طریقہ اختیار کرنا دراصل ان اساتذہ پر احسان نہیں بلکہ معاشرہ کے ذمہ دار اور صاحب حیثیت لوگوں پر ان کا یہ حق ہے کہ ان کی مالی معاونت کی جائے۔ ایسے اساتذہ کے لیے اپنی مالی مجبوریوں کے لیے گڑگڑانا یا مدد طلب کرنا کسی بھی اعتبار سے مناسب نہیں سمجھا جاتا۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں چونکہ مملکت کی انتظامی تشکیل کا عمل شروع کیا گیا تھا اس لیے محکمہ تعلیم کا الگ سے وجود ثابت نہیں ہوتا۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ اس امر کی تصدیق بھی نہیں ملتی کہ اس دور کے اساتذہ کے لیے باقاعدہ مشاہرہ مقرر کر دیا گیا تھا کہ نہیں بعض مورخین کا اندازہ ہے کہ نقد رقومات کے بجائے اصل ضروریات کی تکمیل ہی کو معاوضہ تصور کیا جاتا تھا۔ اساتذہ کی تمام معاشی ضروریات کی کفالت کی ذمہ داری لے لی جائے تو وہ زیادہ یکسوئی سے تعلیم و تدریس کی طرف متوجہ ہو سکتے ہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں گو انتظامی مشینری بہت زیادہ جدید خطوط پر استوار نہیں کی جا سکی تھی پھر بھی اگر تعلیم سے متعلق افراد کے مشاہرے کا یہ اصول تسلیم کر لیا جائے تو ایک مثالی تعلیمی نظام کا خاکہ سامنے آتا ہے جس میں اساتذہ کو پریشانیوں اور مشکلات کا سامنا نہیں کرنا پڑتا تھا اس زمانے میں متعلمین کو مالی معاوضہ دیا جاتا تھا یا نہیں البتہ یہ تصدیق ضرور ہوتی ہے کہ متعلمین کو اس قسم کی امداد دی جاتی تھی غالباً یہ امداد ان میں تعلیم حاصل کرنے کے لیے ترغیب اور محرک کے طور پر دی گئی تھی۔ ان کی مدد کرنا حکومت اور صاحب استطاعت لوگوں کا فرض تھا کیونکہ اس نظام میں اساتذہ کے معاوضہ کے لیے طالب علموں سے فیس لینے کی کوئی سند نہیں ملتی (طالب علموں سے فیسوں کی وصولیابی کے برعکس تمام تعلیمی سہولتوں کی مفت اور بلا معاوضہ فراہمی کے بارے میں آئندہ ابواب میں الگ سے بحث کی گئی ہے)۔

طالب علموں سے تحائف لینے کی ممانعت

متعلمین کی تدریس کے لیے ان سے کوئی معاوضہ نہیں لیا جاتا تھا اور نہ ہی کوئی ایسی رقم مقرر کی گئی تھی جو مخصوص مدت میں ان سے وصول کی جاتی ہو۔ اس کے برعکس مسلمانوں کے ابتدائی عہد کے تعلیمی نظام میں متعلمین کو تمام تعلیمی سہولتیں فراہم کرنا ان لوگوں کی ذمہ داری تھی جو تعلیم و تدریس کے نگراں یا منتظم اعلیٰ تھے۔ یہ عہدہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں آپؐ کے پاس ہی تھا اس لیے متعلمین کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے زیر نگرانی تمام

کم قیمت اشیا بھی طالب علموں سے نہ لینے کی ہدایت فرمائی۔ خواہ طالب علم خود ہی کیوں نہ دینا
چاہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس حکم سے ایک جانب تو طلبا کو مالی یا اخلاقی طور پر زیر بار
کرنے سے بچانا تھا تاکہ وہ تمام طالب علموں کے ساتھ یکساں سلوک روا رکھیں اور تحائف یا خوشامد
کی وجہ سے طالب علموں میں سے کچھ سے خصوصی تعلق اختیار نہ کریں۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور کی ان واضح مثالوں سے یہ بات بھی عیاں ہو جاتی ہے کہ
آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سربراہ مملکت کی حیثیت سے ایسے تعلیمی نظام کی بنیاد رکھی تھی جس میں
تعلیم سب کے لیے مفت اور عام تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تعلیم کو سب کے لیے لازمی قرار
دیا تھا چونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کو دینی اعتبار سے بھی بڑی اہمیت حاصل تھی اسلیے
آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ابتدائی عہد ہی میں تعلیم کو مفت عام اور لازمی Free
Universal and Compulsory جیسی خصوصیات کا حامل بنا دیا گیا تھا۔ موجودہ
دور کے متمدن اور متمول معاشروں میں نظام تعلیم کی انہی تین خصوصیات پر زیادہ زور دیا جاتا
ہے۔ ترقی پسند اور جمہوری معاشرے بھی تعلیم کے انہی تین اوصاف کے مطابق تعلیم کو ہر
فرد کا بنیادی حق گردانتے ہیں جو دراصل آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات اور زندگی کے اصول
کے عین مطابق ہے۔



باب ۶

اساتذہ کے فرائض اور ذمہ داریاں

اخلاق اور سادگی

سادگی اور خلق دونوں ہی اللہ تعالیٰ کو بے حد پسند ہیں اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی تو سادگی اور حسن اخلاق کا سب سے بڑا مرقع ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے حسن سلوک اور بلند اخلاق سے کفار عرب کے دلوں کو مسخر کر لیا تھا یہاں تک کہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی باتیں اس درجہ قبول کرنے لگے کہ اپنی صدیوں پرانی روایات اور طور طریقوں سے کنارہ کر لیا۔ گفتگو میں نرمی اختیار کی جائے تو دوسروں کو اپنی بات آسانی سے سمجھائی جا سکتی ہے۔ آپ نے عام لوگوں سے تعلقات میں یہی طریقہ کار اختیار کیا۔ عام لوگوں سے تعلقات Public dealing کے لیے اسی اصول کو اللہ تعالیٰ نے تمام انبیاء کرام کے لیے پسند فرمایا تھا کیونکہ ان سب کو تعلیم و تدریس کے ضمن میں لوگوں سے واسطہ پڑتا تھا۔ قرآن کریم میں حضرت موسیٰ ؑ اور حضرت ہارون ؑ کو گفتگو کا طریقہ کار بتاتے ہوئے اسی اصول کی نشاندہی کی گئی ہے[1] فرعون سے گفتگو کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ (القرآن)

اِذْهَبَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ۚ فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى ۝ طٰہٰ۔ پ ۱۶ (۲۰: ۴۳-۴۴)

آپ دونوں جائیں فرعون کے پاس وہ سرکش بنا بیٹھا ہے اور گفتگو کریں اس سے نرم انداز میں شاید کہ وہ نصیحت قبول کرے، یا (میرے غضب سے) ڈرنے لگے۔

اللہ تعالیٰ نے مختلف انبیاء کرام کو جو اوصاف عطا کیے تھے ان میں سب سے اہم وصف حسن اخلاق ہی تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم میں یہ خوبی بدرجہ اتم موجود تھی اور آپ دوسروں کو بھی اس کی تلقین فرماتے تھے اساتذہ کرام کے لیے تو یہ خصوصی ہدایت تھی کہ وہ دل سے

---

[1] سید سلیمان ندوی: سیرۃ النبی جلد چہارم۔ قرآن لمیٹڈ لاہور۔ ۱۴۰۵ھ۔ صفحہ ۳۴۰

حسن سلوک سے پیش آئیں۔ اس سلسلے میں ایک موقع پر ارشاد فرمایا کہ (حدیث)

"لوگ ہمارے پاس دور دراز ملکوں سے علم دین سیکھنے آئیں گے ان کے بارے میں میری وصیت ہے کہ بھلائی سے پیش آنا"

حسن سلوک اور خوش اخلاقی کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے زندگی میں اس درجہ اہمیت دی کہ عرب کے وحشی اور غیر متمدن لوگ بھی اس کے عادی ہونے لگے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے احباب نے بھی انتہائی خوش اخلاقی کا مظاہرہ کیا جس کی وجہ سے اسلامی تعلیمات بہت جلدی لوگوں کے دلوں میں گھر کر گئیں۔ وہ تمام صحابہ کرام جو مختلف علاقوں میں معلم بنا کر بھیجے گئے تھے ان کے ذاتی اخلاق کی بہت سی ایسی مثالیں موجود ہیں کہ لوگوں کے سخت اور ناروا سلوک کے باوجود انہوں نے اخلاق اور محبت ہی کا برتاؤ کیا اس کی ایک مثال حضرت مصعب بن عمیرؓ کی زندگی سے ملتی ہے یہ وہی مصعب بن عمیرؓ ہیں جو غزوۂ احد میں شہید ہوئے تھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وقت جب آپؐ مکے میں مقیم تھے انہیں مدینے کے لوگوں کو تعلیم دینے کے لیے روانہ کیا تھا۔ یہ وہاں جا کر ابو امامہ (اسعد بن زراہؓ) کے گھر مقیم ہوئے اور وہیں لوگوں کو درس دیتے تھے۔ درس و تدریس کے لیے اپنا گھر دینے پر وہاں کے لوگ ابو امامہ کو بہت دعائیں دیا کرتے تھے۔ ابن اسحاق سے روایت ہے کہ ایک دن حضرت مصعب بن عمیرؓ اور حضرت ابو امامہ مدینے کے ایک باغ میں کنویں کے پاس بیٹھے لوگوں کو سمجھا رہے تھے کہ اسید بن حضیر وہاں پہنچے اور ان دونوں کو وہاں سے چلے جانے کو کہا۔ ان کے ہاتھ میں برہنہ شمشیر تھی اور انہوں نے سختی سے ڈانٹ کر کہا کہ تم دونوں یہاں جاہلوں کو گمراہ کرنے آئے ہو اس لیے یہاں سے فوراً بھاگ جاؤ۔ مصعب بن عمیرؓ نے ان کی بات کا برا نہ مانا اور کہا کہ تم یہاں بیٹھو میں تم سے ایک بات کہتا ہوں اچھی ہو تو قبول کرنا ورنہ جو جی میں آئے اس پر عمل کرنا اسید بیٹھ گئے۔ آپ نے انہیں اسلام کے بارے میں بتایا جسے سن کر وہ بہت متاثر ہوئے اور اسلام قبول کر لیا۔ ان کے بعد ابو امامہ کے خالہ زاد بھائی سعد بن معاذ بھی انتہائی غصے کے عالم میں وہاں پہنچے لیکن وہ بھی وہاں آ کر حضرت مصعب بن عمیرؓ کے حسن سلوک سے متاثر ہوئے اور جیسے ہی انہوں نے اسلام کی تعلیمات سنیں انہوں نے اسلام قبول کر لیا ان دونوں کے اسلام قبول کرنے میں حضرت مصعب بن عمیرؓ جیسے معلم کا بڑا ہاتھ تھا جنہوں نے خوش اخلاقی اور نرم گفتگو سے انہیں اسلامی تعلیمات کی طرف مائل کیا۔[1]

---

[1] [illegible]

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے معلمین کو خصوصیت سے یہ تاکید فرمائی تھی کہ وہ لوگوں سے سختی نہ برتیں بلکہ نرمی سے پیش آئیں۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ تاکید معلمین کے لیے ایک ضابطہ اخلاق Code of Ethics مرتب کرنے میں رہنمائی فراہم کرتی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول تھا کہ جب بھی کسی علاقے یا قوم کی جانب معلم روانہ کرتے انہیں کچھ خاص ہدایات دیا کرتے تھے۔ مثلاً ۹ سنہ ہجری میں دور دراز سے بڑی تعداد میں لوگ آئے اور انہوں نے اسلام قبول کیا (اکثر ایسا ہوتا تھا کہ قافلے مدینے آتے تھے اور مختلف صحابہ کے پاس مہمان ہوتے تھے صحابہ ان لوگوں کو واپسی میں زادِ راہ بھی دے دیا کرتے تھے اور ساتھ ہی ساتھ ان کی ضرورت کا خیال بھی رکھتے تھے اسلامی تاریخ میں اس سال کو اسی لیے سن الوفود بھی کہا جاتا ہے) یہ نومسلم قبائل جب اپنے گھروں کو واپس جانے لگے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کے ساتھ کئی معلمین بھی روانہ کیے تاکہ تعلیم کا سلسلہ منقطع نہ ہو۔ ایک بار ایسے موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے معلمین کے ایک گروہ کو ہدایت فرمائی کہ لوگوں کے ساتھ نرمی سے پیش آئیں سختی سے گریز کریں۔ اور ان کے (سیکھنے والوں یا متعلمین کے) دل بڑھائیں اور انہیں حقارت سے نہ دیکھیں۔ مزید فرمایا کہ تمہیں اہل کتاب میں سے بہت سے ایسے ملیں گے جو تم سے یہ دریافت کریں گے کہ بہشت کی کلید کیا ہے تم انہیں بتانا کہ بہشت کی کلید اللہ کی صداقت کو تسلیم کرنا اور نیک کام کرنا ہے[1] معلمین کے مختلف وفود کو وقتاً فوقتاً دی جانے والی ہدایات کی روشنی میں معلمین کے لیے ایک پیشہ ورانہ ضابطہ اخلاق Professional code of Ethics ترتیب دیا جا سکتا ہے۔ جس میں مندرجہ ذیل باتیں شامل ہوں گی۔

۱۔ اساتذہ طالب علموں سے سختی سے پیش نہ آئیں۔ کیونکہ اس طرح طالب علم حصول علم پر صحیح طریقے سے متوجہ نہیں ہوں گے۔ اساتذہ کو چاہیے کہ طالب علموں سے نرمی سے گفتگو کریں اور ان سے شفقت کا برتاؤ کریں۔

۲۔ اساتذہ علم کی وجہ سے خود کو بڑا نہ سمجھیں اور نہ ہی تکبر اور نخوت کا مظاہرہ کریں۔ وہ کم علمی کی وجہ سے طالب علموں کو بھی حقیر نہ سمجھیں بلکہ ان کی عزت نفس کا خیال رکھیں۔

---

[1] سید امیر علی: اسپرٹ آف اسلام، مترجم محمد ہادی حسین۔ ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور، طبع سوم ۱۹۸۴ء صفحات ۳۰۴-۳۰۵

۳۔ اساتذہ اپنے حسن سلوک اور شیریں بیانی سے طالب علموں کی حوصلہ افزائی کریں تاکہ وہ مزید جاننے کے لیے سرگرم عمل ہوں اس طرح ان میں ذوق و شوق کی تحریک دی جائے۔

۴۔ حقارت، سخت گیری اور عدم توجہی طالب علموں کو تعلیم سے برگشتہ کر دیتی ہے۔ اساتذہ اس سلسلے میں محتاط رہیں اور دوسروں کو علم دینے کے بجائے انہیں علم سے بیزار کرنے کا سبب نہ بنیں۔ معلمین کے لیے خوش اخلاقی کے ساتھ ساتھ سادگی اور قناعت جیسے اوصاف بھی لازمی ہیں۔ ان کا تعین خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا اور آپ کے صحابہ کرام نے ان پر پابندی سے عمل کیا تھا۔ اس کی ایک روشن مثال حضرت عتاب بن اسیدؓ تھے۔ آپ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے بعد مکے کا حاکم مقرر کیا تھا اور خود باقی اصحاب کے ساتھ طائف اور حنین کی جانب روانہ ہو گئے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عدم موجودگی میں مکے کے حکمراں حضرت عتاب بن اسیدؓ کا باقاعدہ مشاہرہ مقرر کیا گیا جو ایک درہم روزانہ تھا انہوں نے والی مکہ ہونے کے باوجود اسی معمولی مشاہرے پر قناعت کی۔ ایک بار اپنے خطبے میں انہوں نے خود بھی یہ تذکرہ کیا اور کہا کہ اے لوگو جسے ایک درہم روز ملے وہ پھر بھی بھوکا رہے تو اس کا پیٹ کبھی نہیں بھر سکتا۔ گویا ایک درہم کوئی بہت بڑی دولت تھی۔ آپ کا یہ رویہ قناعت اور سادگی کی ایک بڑی مثال ہے[۱] آپؐ کی صحبت میں رہ کر اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا بغور مشاہدہ کرنے کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب نے وہ تمام خصوصیات اور اوصاف اختیار کر لیے تھے جو ایک مثالی معلم کے لیے ضروری ہوتے ہیں۔

مضمون پر عبور

اخلاق اور سادگی جیسی فطری خصوصیات کے ساتھ ساتھ اساتذہ کے لیے چند اکتسابی خصوصیات بھی لازمی قرار دی گئی تھیں ان میں سرفہرست یہ خصوصیت تھی کہ اساتذہ جو مضمون پڑھا رہے ہیں انہیں اس پر مکمل عبور حاصل ہو۔ مضامین میں مہارت کا سلسلہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد ہی میں شروع ہو چکا تھا بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تو معلمین کے تقرر میں زیادہ تر انہی اصحاب کو فوقیت دی جو متعلقہ مضمون پر عبور رکھتے تھے۔ اساتذہ کو اس امر

---

[۱] ابن ہشام، سیرۃ ابن ہشام، مترجم شیخ محمد اسماعیل، مقبول اکیڈمی لاہور، ۱۹۹۰ء صفحہ ۵۳۰۔

کی اجازت تھی کہ وہ مزید تحقیق اور جستجو کے ذریعے اپنی اس مہارت میں اور اضافہ کریں۔ اس اجازت سے تحقیق اور جستجو کی حوصلہ افزائی ہوئی اور اساتذہ نے اپنے مضمون میں نئی معلومات اور نئے پہلو تلاش کیے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے تربیت یافتہ ایک صحابی حضرت ابی بن کعبؓ کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ قرآن بہت اچھی طرح پڑھتے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کی قرات کو پسند فرماتے تھے اور اکثر خود بھی سنا کرتے تھے۔ دمشق کے لوگوں نے بعد میں جس قرات کو اختیار کیا وہ انہی حضرت ابی بن کعبؓ کا اسٹائل تھا۔ یہ اسٹائل اتنا مقبول ہوا کہ دوسرے علاقے کے لوگوں نے بھی اسے اختیار کرنا شروع کیا۔[۵] آپ جس ادارہ سے وابستہ رہے وہ قرات کی تدریس میں مرکزی حیثیت رکھتا تھا۔ آپ نے قرات کی رسمی تدریس ہی نہیں کی بلکہ اس ضمن میں اپنی کوششوں اور جستجو سے اس کے نئے انداز اور طرز ادائیگی کو فروغ دیا۔

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں مختلف مضامین کی تدریس کے لیے مختلف اساتذہ نے خاصی شہرت حاصل کر لی تھی۔ ابتدا میں قرآن کی تدریس کے لیے الگ اساتذہ مقرر کیے گئے۔ بعد میں مختلف ہنروں کی طرح خوشنویسی کے لیے بھی الگ استاد مقرر کیے گئے۔ خوشنویسی کی مہارت سکھاتے وقت لکھنے کے لیے قرآنی آیات استعمال نہ کی جاتی تھیں بلکہ تحریر کی مشق کے لیے زبان کی مختلف عبارتوں سے کام لیا جاتا تھا۔ اس شعبہ میں تعلیم دینے کے لیے کئی غیر مسلم افراد کی خدمات بھی حاصل کی گئی تھیں۔ آپؐ کے عہد میں مسلمانوں میں پیشہ ورانہ مہارت کا سلسلہ اس حد تک فروغ پا گیا تھا کہ مختلف مضامین کی تدریس کے لیے مختلف اساتذہ سے رجوع کرنے کا مشورہ دیا جاتا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم خود متعلمین کو مشورہ دیتے کہ فلاں فلاں اصحاب سے علم حاصل کیا جائے صحابہ کرام میں سے حضرت ابی بن کعبؓ نے فن قرات میں اور حضرت زید بن ثابتؓ نے وراثت کے اصول (علم الفرائض) میں بڑی شہرت حاصل کی تھی۔[۶]

---

[۵] مولانا سعید انصاری: سیر انصارؓ (جلد اول و دوم)۔ دار المصنفین اعظم گڑھ طبع دوم ۱۹۴۸ء صفحہ ۱۶۲

[۶] محمد طفیل: نقوش، رسول نمبر: جلد چہارم ادارہ فروغ اردو۔ لاہور ۱۹۸۳ء صفحہ ۱۳۵

مختلف زبانوں پر عبور

اساتذہ کی اکتسابی خصوصیات میں مختلف مضامین پر عبور کے ساتھ ساتھ مختلف زبانوں میں اظہار خیال کی صلاحیت بھی ضروری ہے۔ اس کی ضرورت اس لیے پڑتی ہے کہ اساتذہ مختلف زبانیں بولنے والے طالب علموں کو پڑھاتے ہیں اور ان لوگوں کو اسی وقت بہتر طور پر سمجھا سکتے ہیں جب ان سے ان کی زبان میں آزادی اور روانی سے بات چیت کر سکیں۔ مختلف زبانوں کے حوالے سے یہ بات ضروری سمجھی جاتی ہے کہ معلم کم از کم اس زبان پر عبور ضرور رکھتا ہو جو اس کے طالب علموں کی مادری زبان ہے۔ طالب علموں کو متاثر کرنے اور انہیں سمجھانے کے لیے اس صلاحیت کا ہونا ضروری ہوتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم میں یہ خوبی بدرجہ کمال موجود تھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم جن لوگوں سے خطاب فرماتے انہی کی زبان میں خطاب فرماتے تھے موجودہ دنیا کے کثیر اللسانی ممالک کی طرح اس دور کے عرب میں بھی مختلف قبیلوں کی زبانیں ایک دوسرے سے مختلف تھیں خود عربی بولنے والے مختلف قبائل بھی مختلف لہجہ میں عربی بولتے تھے یہاں تک کہ ان کی اصطلاحات اور الفاظ بھی کسی حد تک ایک دوسرے سے مختلف مفہوم کی نشاندہی کرتے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم مختلف زبانوں کی ان تمام باریکیوں اور خصوصیات سے پوری طرح واقف تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ مہارت اسلام کی تبلیغ اور اشاعت میں آپؐ کی معاون رہی اور اسی کی وجہ سے اسلامی تعلیمات بہت جلدی بہت لوگوں تک آسانی سے پہنچا دی گئیں۔ مختلف عرب قبائل سے گفتگو کرتے وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم اتنی فصاحت و بلاغت سے مخاطب کی زبان میں گفتگو فرماتے کہ خود ان کے ماہر لسانیات حیران رہ جاتے تھے۔ کئی قبائل کے سرکردہ افراد نے اس امر کا اعتراف بھی کیا کہ فصاحت و بلاغت میں ان کی زبان کے فصحا اور بلغا حضور صلی اللہ علیہ وسلم جیسا کلام کرنے سے محروم تھے معلم اعظم کے اعزاز کی طرح اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ اعزاز بھی عطا کیا تھا کہ پورے عرب کے ہر قبیلہ اور قوم کی زبان، لب و لہجہ اور اس کے اسلوب پر پوری قدرت رکھتے تھے [1]

---

[1] علامہ شمس بریلوی: سرور کونین کی فصاحت: مدینہ پبلشنگ کمپنی کراچی ۱۹۸۵ء، صفحہ ۲۰۹

مختلف زبانوں اور ایک ہی زبان کے مختلف اسلوب پر عبور کی وجہ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا تبلیغی مشن بہت جلد کامیابی سے ہمکنار ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ وصف اسی لیے عطا کیا تھا کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم عام لوگوں کو ان کی زبان میں آسانی سے اپنی باتیں سمجھا سکیں۔ آپؐ کے اس عمل سے اساتذہ کے لیے یہ اہم نکتہ واضح ہو جاتا ہے کہ انہیں بھی وہ تمام زبانیں اور اسلوب آنے چاہئیں جن کا تعلق ان کے متعلمین سے ہے۔ مختلف زبانوں کی مہارت اساتذہ کے لیے خود سمجھنے اور دوسروں کو سمجھانے میں بھی معاون ثابت ہوتی ہے اساتذہ اس صلاحیت سے محروم ہوں تو درس وتدریس کے عمل میں انہیں زیادہ کامیابی حاصل نہیں ہوتی۔ مختلف زبانوں پر عبور کے سلسلے میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اس خصوصیت کی نشاندہی کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ اس دور کے معلمین کی تقرری کے لیے بھی اسے شرط بنایا گیا ہوگا۔ اس لیے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر مرحلہ پر اساتذہ کو یہ ہدایت کی تھی کہ وہ سیکھنے والوں کے لیے زیادہ سے زیادہ آسانیاں پیدا کریں۔ آسانیاں پیدا کرنے کے عمل میں سب سے پہلا کام تو یہی ہے کہ طالب علم کو اس کی زبان میں پڑھایا جائے۔ زبانوں سے متعلق اس اصول کی تعلیمی اور نفسیاتی افادیت بھی مسلّم ہے اس خصوصیت کے حصول سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تقلید بھی ہوتی ہے اور طالب علموں سے خوشگوار تعلقات بھی استوار ہوتے ہیں دنیا کے جس علاقے میں اس اصول پر عمل کیا جائے گا وہاں یقیناً مختلف علاقوں میں قائم ہونے والے تعلیمی اداروں میں انہی علاقوں یا ان علاقوں کی زبان میں مہارت رکھنے والے اساتذہ کا تقرر کیا جائے گا۔ اس طرح نہ صرف تعلیم وتدریس میں وسعت پیدا ہوگی بلکہ ہر علاقے کے لوگوں کو روزگار بھی مل سکے گا۔

صاحبان اقتدار سے دوری

اسلام افراد کے مختلف گروہوں کے مابین بہتر معاشرتی تعلقات قائم کرنے پر زور دیتا ہے اس طرح لوگ ایک دوسرے سے میل جول اور تعاون کرتے ہیں اور انفرادی اور اجتماعی مسائل حل کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ علما اور اساتذہ کو بھی اس نوعیت کے معاشرتی تعلقات اور مختلف گروہوں سے میل جول کی اجازت ہے لیکن ان لوگوں سے جو مسند اقتدار پر فائز ہوں اور دولت اور اقتدار سے لوگوں کو مرعوب کرتے ہوں اساتذہ کو دور رہنے کی ہدایت کی گئی ہے۔ ایسے اساتذہ جو اپنی بڑائی یا ذاتی مفادات کے لیے صاحب ثروت افراد

اور صاحبان اقتدار سے ملتے ہیں انہیں اللہ تعالیٰ کے غضب سے ڈرایا گیا ہے۔ یہ پابندی اس نقطہ نظر سے عائد کی گئی تھی کہ اساتذہ دوسروں کو دیکھ کر دولت اور جاہ و جلال کے لالچ میں گرفتار نہ ہو جائیں بلکہ سادگی اور قناعت سے اپنے مقام پر مضبوطی سے جمے رہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بذات خود عاجزی اور انکساری کی کئی مثالیں قائم کیں جن کے اثرات صحابہ کرام پر بھی پڑے اور ایسے کئی معلمین منظر عام پر آئے جو اعتماد اور حوصلہ کی زندہ مثال تھے۔ انہوں نے اپنی ذاتی ضروریات کی تکمیل کے لیے کبھی حکومت یا دوسرے اداروں کی طرف نہیں دیکھا بلکہ یکسوئی سے اشاعت علم میں مصروف رہے۔ ایسے ہی ایک معلم حضرت حرام بن ملحان رضی اللہ عنہ (ماکم) تھے جو رات کے وقت درس دیا کرتے تھے۔ آپ دن میں مسجد نبوی میں پانی بھر کر رکھا کرتے تھے اور باقی وقت میں جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر لاتے اور انہیں فروخت کرتے تھے۔ اس قدر محنت و مشقت سے حاصل ہونے والی معمولی سی آمدنی سے آپ اپنی ذاتی ضروریات پوری کرتے تھے اور جو کچھ باقی بچ جاتا تھا اسے اللہ کی راہ میں خرچ کر دیا کرتے تھے۔ بہت سی روایات ملتی ہیں جن سے اس بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ آپ اپنی قلیل آمدنی میں سے کچھ نہ کچھ پس انداز کر کے اصحاب صفہ اور دوسرے محتاجوں کی غذائی ضروریات پوری کرتے تھے[1] آپ نے نہ صرف یہ کہ خود کبھی کسی کے آگے دست سوال دراز نہیں کیا بلکہ جہاں تک ہو سکا دوسروں کی مدد بھی کی۔ اس مثال سے اساتذہ اور علم کی فضیلت کا احساس ہوتا ہے۔ اگر اس کے برعکس عمل کیا جائے تو نہ صرف یہ کہ علما کی عزت نفس مجروح ہوتی ہے بلکہ عام لوگوں میں ان کا وقار اور احترام بھی باقی نہیں رہتا۔ اہل ثروت کی محفلوں میں ان کی عسرت اور معمولی معاشی حیثیت کی وجہ سے ان کی جو سبکی ہوتی ہے وہ الگ ہے۔

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کے برعکس اگر معلمین صاحبان اقتدار کے دربار میں حاضر ہوں گے تو ان کی شان و شوکت سے مرعوب ہو جائیں گے۔ اس طرح ان کی شخصیت میں کمزوریاں آنا شروع ہو جائیں گی امرا سے مرعوب ہو کر اساتذہ انہیں تعلیمی اداروں کے تدریسی اور انتظامی امور میں مداخلت کا موقع دیں گے تاکہ صاحبان اقتدار کی زیادہ سے زیادہ خوشنودی حاصل کر سکیں اس کیفیت میں تعلیمی ادارں اور معلمین دونوں کی آزادی بری طرح متاثر ہوگی اور وہ آزادانہ اور غیر جانبدارانہ کردار ادا کرنے میں ناکام رہیں گے۔

---

[1] مولانا سعید احمد انصاری: سیر انصار رضی اللہ عنہم (حصہ اول دوم) دار المصنفین اعظم گڑھ، طبع دوم ۱۹۴۸ء صفحہ ۳۱۹

پیشہ ورانہ ضابطہ کی تشکیل

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم و تربیت اور حیات طیبہ کو مثال بنایا جائے تو اساتذہ کے لیے اپنے پیشے Profession میں مہارت اور دسترس کے نئے راستے متعین ہوتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تقلید میں آپ ہی کی زیر نگرانی صحابہ کرام نے درس و تدریس کے شعبے میں جو گراں قدر خدمات سرانجام دیں ان سے بھی اساتذہ کو پیشہ ورانہ رہنمائی ملتی ہے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے باقاعدہ کسی ضابطہ کا اعلان تو نہیں کیا تھا البتہ مختلف مواقع پر جو ہدایات جاری فرماتے تھے انہیں یکجا کر لیا جائے تو ایسے راہنما اصول سامنے آتے ہیں جن پر عمل کر کے اساتذہ پیشہ ورانہ امور میں مہارت حاصل کر سکتے ہیں۔ ایسی تمام ہدایات کو جن پر صحابہ کرام نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رہنمائی میں عمل کیا تھا انتہائی جدید تعلیمی نظام میں بھی ایک مثالی پیشہ ورانہ ضابطہ کہا جا سکتا ہے۔ اس ضابطہ کی اہم ترین باتیں مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ غلط بیانی سے گریز

اساتذہ کے لیے یہ لازمی ہے کہ وہ کبھی غلط بیانی سے کام نہ لیں بلکہ اساتذہ کے لیے سب سے زیادہ معیوب بات یہ ہے کہ وہ دروغ گوئی اور جھوٹ کا سہارا لیں۔ جھوٹ بولنے اور دوسروں کو گمراہ کرنے سے بہتر ہے کہ اساتذہ اپنی کم علمی کو دور کرنے کی کوشش کریں۔ اس طرح دوسروں کو بھی نقصان سے بچایا جا سکتا ہے اور خود بھی جھوٹ سے محفوظ رہا جا سکتا ہے۔ جان بوجھ کر جھوٹ بولنا ویسے بھی انتہائی نامناسب فعل ہے جہاں تک علم کا تعلق ہے اس کے تقدس اور احترام کے پیش نظر اس میں دروغ گوئی کی قطعی گنجائش نہیں ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ارشاد کے ذریعے علم اور اشاعت علم میں جھوٹ کی شدید مذمت فرمائی تھی (حدیث)

"جو شخص میری طرف سے کوئی بات بیان کرے اور جانتا ہو کہ وہ جھوٹ ہے تو وہ بھی جھوٹا ہے۔"

۲۔ نہ جاننے کا اعتراف

کم علمی کا اعتراف کرنے سے انسان کی سبکی نہیں ہوتی بلکہ یہ اس کی اعلیٰ ظرفی اور سچائی کی علامت ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس اصول کو خود ہی فروغ دیا حالانکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں سب سے زیادہ علم رکھتے تھے پھر بھی لوگوں کی اصلاح کے لیے بعض باتوں کے نہ جاننے

کا اعلان کرتے تھے تاکہ لوگوں کے لیے مثال قائم ہو اور وہ ان امور کے بارے میں جنہیں وہ نہ جانتے ہوں اندازے اور قیاس کرنے سے گریز کریں۔ علم کے معاملے میں معلمین کو بہت واضح ہونا چاہیئے اور کسی قسم کے ابہام اور غلط بیانی سے کام نہ لیا جائے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ ایک بار ایک شخص نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر سوال کیا کہ سب سے اچھے مقامات کون سے ہیں؟ آپؐ نے فرمایا میں نہیں جانتا۔ اس شخص نے پھر سوال کیا کہ سب سے برے مقامات کون سے ہیں؟ آپؐ نے اس سوال کے جواب میں بھی یہی فرمایا کہ میں نہیں جانتا۔

ان تمام امور کے متعلق جو انسان نہ جانتا ہو یہ تین مختصر سے لفظ "میں نہیں جانتا"
I don't know مسلمانوں کی تعلیم میں پیشہ ورانہ دیانتداری اور خلوص کی اصل روح ہیں۔ ان پر عمل کیا جائے تو راست گوئی اور دیانتداری کی سند ملتی ہے۔ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اکثر نہ جاننے کا اعتراف کیا اور لوگوں کو غلط معلومات فراہم کر کے انہیں گمراہ نہیں کیا۔ حالانکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سب سے زیادہ علم رکھتے تھے اور آپؐ جو کچھ فرما دیتے اسے جھٹلانے والا کوئی نہیں تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس اصول کو فروغ دیا کہ جس بات کو نہیں جانتے اس کے بارے میں رائے زنی بھی نہ کریں بلکہ واضح طور پر اپنے نہ جاننے کا اعتراف کریں۔ حضرت ابوہریرہؓ کی روایت کے مطابق آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں نہیں جانتا تھا کہ عزیر نبی تھے یا نہیں مجھے نہیں معلوم کہ تبعؑ ملعون تھا یا نہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد کے ایک ممتاز ماہر تعلیم حضرت عبداللہ بن مسعودؓ بھی جو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بہت قریب تھے اس ضمن میں بہت ہی واضح نقطہ نظر رکھتے تھے۔ آپ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ لوگو جو بات جانتے ہو وہی کہو جو نہیں جانتے اس پر اللہ اعلم (خدا بہتر جانتا ہے) کہا کرو کیونکہ علم کی ایک خاصیت یہ بھی ہے کہ انسان جو باتیں نہیں جانتا ان سے لاعلمی کا اعتراف کرے۔[1] آپ اکثر اپنے طالب علموں سے بھی یہی فرماتے تھے کہ جس چیز کے بارے میں نہیں جانتے ہو اس کے بارے میں اپنی رائے دینے سے پرہیز کرو اور اعتراف کر لو کہ میں نہیں جانتا۔[2]

---

[1] ابن عبد البر اندلسی: جامع بیان العلم وفضلہ - مترجم عبدالرزاق ملیح آبادی۔ العلم والعلماء۔ ادارہ اسلامیات لاہور پہلی بار ۱۹۷۶ء صفحہ ۱۶۲

[2] شاہ معین الدین ندوی: مہاجرینؓ (حصہ اول) دار المصنفین اعظم گڑھ طبع ثانی ۱۹۵۱ء صفحہ ۲۰۱

آپؐ کے ارشادات اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مختلف صحابہ کرام کی مثالوں کو سامنے رکھا جائے تو یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ اساتذہ کے لیے طلبا کے سامنے غلط بیانی کرنے سے بہتر ہے کہ وہ جو کچھ نہ جانتے ہوں اس کا برملا اعتراف کرلیں۔ اس طرح وہ خود بھی کوشش کریں گے کہ جو کچھ انہیں نہیں آتا وہ اسے جاننا شروع کردیں، تاکہ اپنے طلبہ کو بتا سکیں۔ یہ عمل ان میں مزید جاننے کی جستجو پیدا کرتا ہے اور ان کے پیشہ ورانہ تقاضوں اور اصولوں کے عین مطابق ہے۔

۲۔ مزید جاننے کی جستجو

معلمین کبھی بھی اس غلط فہمی میں مبتلا نہ ہوں کہ ان کا علم مکمل ہوگیا ہے اور انہیں اب مزید جاننے کی ضرورت نہیں رہی۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کے مطابق تمام باتوں کا علم صرف اللہ تعالیٰ کو ہے اور کوئی انسان وہ خواہ معلم ہی کیوں نہ ہو کسی بھی مضمون یا علم کے بارے میں سب کچھ جاننے کا دعویٰ نہیں کرسکتا۔ درس و تدریس سے وابستہ افراد کا تعلق چونکہ لاتعداد طالب علموں سے ہوتا ہے جو جاننے کے لیے رجوع کرتے ہیں اس لیے پیشہ ورانہ تقاضہ بھی یہی ہے کہ اساتذہ خود بھی مزید جاننے کے لیے جستجو کرتے رہیں اس طرح وہ طالب علموں کے جاننے کے تقاضے (تجسس) کی تسکین کرنے میں کامیاب ہوسکتے ہیں۔ جاننے کے لیے کوشش کرنے سے اساتذہ کو غلط بیانی سے نجات مل جائے گی اور وہ دنیاوی اعتبار سے بھی نہ جاننے والی کیفیت سے نکل آئیں گے۔ دوران تدریس اگر اساتذہ کسی بات کے بارے میں شبہ میں مبتلا ہوں تو بتانے سے پہلے انہیں چاہیے کہ وہ مختلف کتابوں اور ذرائع سے اس بات کی تصدیق کرلیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دور کے ایک ماہر تعلیم حضرت عبداللہ بن عمرؓ اسی طریقے پر عمل کرتے تھے۔ انہیں اگر کسی چیز کے بارے میں معمولی سا شک بھی ہوجاتا تو جواب دینے سے گریز کرتے تھے بلکہ اگر آپ فتویٰ جاری کرچکے ہوتے اور غلطی کا شبہ ہوجاتا تو فوراً رجوع کرلیتے تھے، اور بلا پس و پیش اپنی غلطی تسلیم کرلیتے تھے[۱]۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عم زاد حضرت عبداللہ بن عباس بھی عبداللہ بن عمرؓ کی اس خوبی کے بڑے معترف تھے۔ یقیناً آپ میں یہ خوبی اس وقت پیدا ہوئی ہوگی جب آپ نے مزید جاننے کا سلسلہ جاری رکھا ہوگا، کیونکہ غلطی کا اندازہ جاننے کے بعد ہی ہوتا ہے۔ ان واقعات سے اساتذہ کے

---

[۱] شاہ معین الدین احمد: مہاجرین (حصہ دوم) دارالمصنفین اعظم گڑھ طبع دوم ۱۹۵۲ء، صفحہ ۲۰

ہے مزید معلومات حاصل کرنے اور اپنے مطالعہ کو وسعت دینے کی سند ملتی ہے۔ اس طرح وہ پیشہ ورانہ طور پر زیادہ دیانتداری سے کام کر سکتے ہیں اور اپنے فرائض زیادہ سے زیادہ ماہرانہ طریقے پر ادا کر سکتے ہیں۔

۴۔ دوسرے اساتذہ سے سلوک

متعلمین کے برتاؤ کی طرح معلمین کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اپنے ساتھی اساتذہ سے شفقت اور محبت سے حسن سلوک کا مظاہرہ کریں۔ یہ حسن سلوک اسوہ حسنہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تقلید بھی ہے اور اساتذہ کے پیشہ ورانہ ضابطہ اخلاق کا تقاضہ بھی ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم خود معلم اعظم تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جتنے صحابہ کرام نے بحیثیت معلم کام کیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ان سے برتاؤ ہی اس حسن سلوک کی سب سے نمایاں مثال ہے۔ دیگر صحابہ کرام نے بھی اس مثال پر عمل کیا۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓو بصرہ میں درس دیا کرتے تھے۔ آپ طالب علموں سے بہت محبت سے پیش آتے تھے اور ساتھ ہی ساتھ اپنے ساتھی اساتذہ کی بھی بڑی عزت کرتے تھے۔[۱] اس دور کے اساتذہ میں پیشہ ورانہ چپقلش نہیں تھی بلکہ ایک دوسرے سے مفاہمت کا جذبہ سب سے نمایاں تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہ کرام اور ساتھیوں سے جو سلوک روا رکھا اس نے تمام مسلمانوں کی رہنمائی کی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے باہمی احترام اور محبت کی جس روایت کی بنیاد رکھی تھی معلمین نے اسی پر عمل کیا اور آپس میں حسد اور عداوت کے بجائے احترام اور تعاون کو فروغ دیا۔

۵۔ کتابوں کی تیاری

قدو العلم بالکتاب — علم کو لکھ کر محفوظ کرو

اساتذہ کے لیے کتابیں لکھنا اور انہیں متعلمین اور دوسرے افراد اور اساتذہ تک پہنچانا بھی اشاعت علم ہی سمجھا جاتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک صحابی حضرت عبداللہ بن عمروؓ نے اس کام میں پہل کی۔ انہوں نے سب سے پہلے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات اور ملفوظات کا ایک مجموعہ مرتب کر لیا۔ اس مجموعے کو "صادقہ" کے نام سے شہرت حاصل ہوئی۔ اس کی تیاری کا مقصد صرف یہی تھا کہ اس سے آنے والے لوگوں کو استفادہ کا موقع فراہم کیا جائے۔ ان صحابی

---

[۱] حاجی معین الدین ندوی: مہاجرین حصہ اول۔ دار المصنفین اعظم گڑھ۔ طبع ثانی سنہ ۱۹۵۱ء صفحہ ۳۴۲

کی یہ عادت تھی کہ جب کوئی بات یاد نہ ہوتی تو اسے لکھ لیا کرتے تھے تاکہ بعد میں اسے دہرا کر یاد کرلیں۔ لکھنے لکھانے کے عمل سے معلمین کی معلومات کی تجدید بھی ہوتی ہے اور اس ذریعہ سے دوسروں تک بھی بہت سی باتیں منتقل ہو جاتی ہیں۔

مندرجہ بالا پانچ اصول درحقیقت اس پیشہ ورانہ ضابطہ کے رہنما اصول ہیں جو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقۂ تعلیم و تربیت سے اخذ کیے جاسکتے ہیں۔ ان اصولوں سے پہلے ضابطۂ اخلاق کے چند اصول بھی بیان کیے جاچکے ہیں۔ ان تمام اصولوں پر عمل کیا جائے تو تعلیمی اداروں کا ماحول بھی خوشگوار رہتا ہے اور اساتذہ کی پیشہ ورانہ صلاحیتوں میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔ اس سے طالب علموں کے جاننے کے تقاضوں کی تکمیل ہوتی ہے اور اساتذہ کے مطالعہ اور معلومات میں بھی اضافہ کا عمل جاری رہتا ہے اپنے ہم عصر اساتذہ سے تعلقات میں اگر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کو مثال بنایا جائے تو محبت اور خلوص کی فضا پیدا ہوتی ہے اور مختلف پیشہ ورانہ رنجشیں سر نہیں اٹھاتیں۔ اس طرح ایک بے مثال تعلیمی ماحول قائم ہو جاتا ہے جس میں معلمین اپنے فرائض اور ذمہ داریوں سے بخوبی عہدہ برآ ہوتے ہیں

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ (ایک نمونہ)

ارشاد ربانی ہے کہ (القرآن)

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ احزاب ۔ پ ۔ ۲۱) (۳۳ ۔ ۲۱)

بے شک تمہاری رہنمائی کے لیے اللہ کے رسول (کی زندگی) میں بہترین نمونہ ہے۔

بلاشبہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارک دنیا کے لیے ایک روشن نمونہ تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں میں اس درجہ توازن تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو انسان کامل کا درجہ عطا ہوا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے زندگی کے تمام شعبوں میں اپنی اعلیٰ صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا اور بچپن سے لے کر زندگی کے آخری لمحے تک لوگوں کے لیے ایک مثالی زندگی کا نمونہ پیش کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عرب کے ایک چرواہے کی زندگی سے لے کر مسلمانوں کی عظیم مملکت کے سربراہ جیسی زندگی بھی گزاری لیکن ہر دور میں توازن اور اعتدال کو قائم رکھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ عمل دوسروں کے لیے باعث تقلید بنا اور آپ کو مثالی شخصیت Model personality کی حیثیت سے شناخت کیا جانے لگا۔ اللہ تعالیٰ

نے تو اپنی محبت کے اظہار اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے درجات (جنہیں اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا تھا) کی وجہ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دنیا کے لیے مثال قرار دیا لیکن عام لوگوں نے آپؐ کو قول اور عمل کی کسوٹی پر پرکھنے کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تقلید کو باعث نجات سمجھا۔ انسان کامل ہونے کی وجہ سے آپؐ نے درس وتدریس کے شعبے میں بھی مثالی معلم کی حیثیت سے کام کیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ صرف اپنا کام حسن وخوبی سے سرانجام دیا بلکہ اپنے ساتھیوں کو بھی ایسی تربیت دی کہ تعلیم وتربیت کے شعبے میں انہیں بھی نمایاں مقام حاصل ہوا۔ اہل علم نے آپؐ کی زندگی اور آپؐ صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل سے بڑی رہنمائی حاصل کی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو خود اہل علم سے بڑی انسیت تھی۔ اسی لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زندگی ہی میں انہیں اپنے ترکہ کا وارث قرار دیا۔ اور بالکل واضح کر دیا کہ انبیا کے ترکے میں علم ہوتا ہے جس کے حقیقی وارث علماء (اور معلمین) ہیں جو اسے دوسروں تک پہنچاتے ہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کے بعد معلمین پر عام لوگوں کا اعتبار اور بھی مستحکم ہو گیا کیونکہ معلمین دراصل وہی کام سرانجام دے رہے ہیں جس کا آغاز آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا تھا۔

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ورثا اور ان کی تقلید کرنے والوں (علما اور معلمین) کو اپنے قول اور عمل میں کیسا ہونا چاہیے اس کی واحد مثال آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ ہی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے قول اور عمل سے علم اور متعلمین کی بھی عزت افزائی فرمائی۔ ابوامامہ باہلی سے روایت ہے کہ

قَالَ ذُكِرَ لِرَسُولِ اللَّهِ صَلَّى
اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَجُلَانِ أَحَدُهُمَا عَابِدٌ وَالْآخَرُ عَالِمٌ فَقَالَ
رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَضْلُ الْعَالِمِ عَلَى الْعَابِدِ كَفَضْلِي
عَلَى أَدْنَاكُمْ ثُمَّ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِنَّ اللَّهَ
وَمَلَائِكَتَهُ وَأَهْلَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ حَتَّى النَّمْلَةَ فِي جُحْرِهَا
وَحَتَّى الْحُوتَ لَيُصَلُّونَ عَلَى مُعَلِّمِ النَّاسِ الْخَيْرَ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس دو شخصوں کا ذکر کیا گیا ان میں سے ایک عابد ہے اور دوسرا عالم۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عالم کی فضیلت عابد پر ایسی ہے جیسے میری فضیلت تمہارے ایک ادنیٰ پر۔ پھر رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تحقیق اللہ تعالیٰ اس کے فرشتے اہل آسمان اور اہل زمین حتیٰ کہ بلوں میں چیونٹیاں اور حتیٰ کہ مچھلیاں بھی لوگوں کو خیر کی تعلیم دینے والے کے لیے دعائے خیر

کرتی ہیں ۔ (ترجمہ)[1]

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے علما کی قدر و منزلت کا اندازہ ہوتا ہے وہ لوگ جن کے لیے دنیا کی تمام مخلوق یہاں تک کہ خالق کائنات بھی نیک توقعات رکھتا ہو وہ اور ان کے مطابق عمل کرنے والے کیسے ہوں گے اس کا اندازہ کرنا زیادہ مشکل نہیں ہے ۔ بلاشبہ اس سلسلے میں رہنمائی اور مثال کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے بہتر کوئی دوسری شخصیت ممکن نہیں ہے ۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کے نتیجے میں صحابہ کرام نے بھی درس و تدریس کے تقدس کو برقرار رکھا آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے دور میں کئی ایسی برگزیدہ شخصیات سامنے آئیں جنہوں نے فروغ علم کے لیے انتھک جدوجہد کی یہاں تک کہ اپنی ذاتی ضروریات اور تقاضوں کو بھی وہ اہمیت نہ دی جو عین فطرت انسانی ہے ان لوگوں نے اپنے فرائض اور پیشہ ورانہ معاملات کو اپنی ذمہ داریوں میں سرفہرست رکھا اور عملاً خود کو درس و تدریس کے لیے وقف کر دیا حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے قائم کردہ پہلے تعلیمی ادارے (مسجد نبوی) کے ایک استاد حضرت ابی بن کعب کی ایک مثال سے ان کی پیشہ ورانہ وابستگی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے ۔ آپ مسجد نبوی میں درس دیتے تھے اور اس کے لیے باقاعدہ وقت کا تعین کر لیا گیا تھا ۔ آپ تدریس کے بعد دوسرے کام بھی کرتے تھے البتہ نماز کی ادائیگی کے لیے پابندی سے مسجد میں حاضر ہوا کرتے تھے ۔ اکثر ایسا ہوتا تھا کہ نماز کے بعد لوگ آپ سے کچھ علم حاصل کرنے کی خواہش ظاہر کرتے ۔ آپ انہیں اپنے اس فارغ وقت میں سمجھانے کے لیے بیٹھ جاتے تھے ۔ ایک دفعہ بھی ایسا نہیں ہوا کہ آپ نے مقررہ وقت کے بعد کسی کو تعلیم دینے سے انکار کیا ہو ۔ مختلف صحابہ کرام کا بھی یہی اصول تھا وہ ہر وقت اور ہر جگہ اس فریضہ کی ادائیگی کے لیے مستعد رہتے تھے کبھی بھی معاوضہ ، وقت اور ذاتی مسائل ان کی راہ میں رکاوٹ نہیں بنے ۔ یہ تمام اصول اس دور کے اساتذہ کے بنیادی اصول تھے ۔ وہ تدریس کو ایک مذہبی فریضہ تصور کرتے تھے اور اس کی ادائیگی اسی اہتمام سے کیا کرتے تھے ۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عم زاد حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے بارے میں مشہور ہے کہ آپ ہمیشہ باوضو ہو کر درس دیا کرتے تھے ۔ آپ نے جن مضامین کا درس دیا ان میں صرف قرآن اور فقہ ہی نہیں بلکہ ادب اور شاعری بھی شامل تھے ۔ مختلف مضامین کی تدریس سے پہلے خود کو پاک صاف رکھنا در اصل تعلیم و تدریس کو ایک مقدس مذہبی فریضہ سمجھنے کا عملی اظہار ہے ۔[2]

---

[1] مشکوٰۃ شریف مترجم جلد اول کتاب العلم صفحہ ٦٧

[2] [illegible] صفحات [illegible]

مختلف صحابہ کرام میں درس و تدریس سے متعلق یہ خصوصیات آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کو دیکھ کر آئیں وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں رہے اور انہوں نے برسوں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے برتاؤ اور طور طریقوں سے اکتساب کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بار صحابہ کرامؓ کی محفل میں مسلمان کے بارے میں ایک بہت ہی منفرد تشبیہ بیان فرمائی۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بار لوگوں سے پوچھا کہ وہ کون سا درخت ہے جو مسلمانوں سے مشابہ ہے لوگوں کے ذہن میں مختلف درخت آئے اور کوئی جواب نہ دے سکا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کھجور کا درخت ایسا درخت ہے جو مسلمانوں سے مشابہ ہے۔

کھجور کے درخت کی منفرد اصطلاح دراصل اپنے اندر ایک وسیع مفہوم رکھتی ہے یہ درخت عرب میں بکثرت ہوتا ہے بلکہ نخلستان عرب میں اسے ایک نعمت کی حیثیت حاصل ہے ان علاقوں کے لوگ جہاں یہ درخت پائے جاتے ہیں ان کی کئی خصوصیات سے آگاہ ہیں یہ خصوصیات انہیں دوسرے پھل دار درختوں سے منفرد بناتی ہیں۔ مثلاً۔

۱۔ کھجور کے درخت عام طور پر ریگستانی اور صحرائی علاقوں میں ہوتے ہیں جہاں موسم اور آب و ہوا کی وجہ سے دوسرے پھل دار درختوں کے بڑھنے کے امکانات کم ہوتے ہیں۔

۲۔ کھجور کے درخت کے لیے عام پھل دار درختوں کی طرح زیادہ دیکھ بھال اور احتیاط کی ضرورت نہیں پڑتی۔

۳۔ یہ درخت دوسرے درختوں کے پھلنے پھولنے میں رکاوٹ نہیں بنتا۔ بلکہ خود بھی بہت کم جگہ گھیرتا ہے، اور ہمیشہ سیدھا کھڑا نظر آتا ہے۔

۴۔ اس درخت سے گرنے والے پھل خود بخود دوسرے درختوں کی نمو کا سبب بنتے ہیں، اس طرح ان کی افزائش خود بخود ہوتی رہتی ہے۔

۵۔ کھجور کا درخت خود ہمیشہ سخت دھوپ اور گرمی میں رہتا ہے اور دوسروں کو نخلستانوں میں سایہ اور غذا کے لیے پھل مہیا کرتا ہے۔

۶۔ یہ درخت پانی جیسی بنیادی ضرورت کا محتاج بھی نہیں ہوتا اس کے پتے بھی نہیں جھڑتے غرض موسم کے تغیرات اس کی ہیئت کو تبدیل نہیں کر پاتے۔

مندرجہ بالا خصوصیات کا بغور جائزہ لیا جائے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی

زبانِ مبارک سے اس تشبیہہ کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انتہائی مشکل حالات میں جدوجہد شروع کی اور لوگوں کے لیے زیادہ سے زیادہ آسانیاں فراہم کیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی دوسروں کو ایذا نہیں پہنچائی بلکہ اپنے ماننے والوں کو بھی اس امر کی ہدایت کی کہ وہ دوسروں کے کام آتے رہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام تکالیف کو خندہ پیشانی سے برداشت کیا اور دوسروں کے لیے فلاح و بہبود کی راہیں تلاش کرتے رہے

☆ ☆ ☆

باب ۷

نصاب اور غیر نصابی مشاغل

پڑھنے لکھنے اور حساب کی تعلیم

باقاعدہ تعلیم کے آغاز پر جن تین بنیادی باتوں کی ضرورت پڑتی ہے انہیں موجودہ تعلیمی اصطلاح میں 3 R - Reading writing and Arithmetic کہا جاتا ہے سامی عنوان اور مفہوم کے ساتھ یہ تینوں باتیں ابتدائی علم کی شکل میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں سامنے آئیں بلکہ اس دور میں باقاعدہ تعلیم کا آغاز انہی تین باتوں سے کیا گیا۔ ان تین باتوں کو جنہیں تین بنیادی مہارتیں کہا جاتا ہے اسلام میں اس حد تک اہمیت حاصل تھی کہ قرآن پاک کے نزول کے سلسلے میں سب سے پہلا لفظ ہی اقرا تھا جو پڑھنے کی پہلی مہارت کی نشان دہی کرتا ہے جبکہ اللہ تعالیٰ نے دنیا میں سب سے پہلی شے جو تخلیق دی وہ قلم ہے جو لکھنے کے کام آتا ہے۔ (ترمذی) خدا نے سب سے پہلے قلم کو پیدا کیا۔ پڑھنے اور لکھنے کی ان دو مہارتوں کا تذکرہ تو اسلام میں سرفہرست ہے اس کے بعد جب تبلیغ اسلام شروع ہوئی اور لوگ جوق در جوق اسلام قبول کرنے لگے تو حساب سیکھنے کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا۔ (ویسے حساب اور تخمینے Co unting and calculations کا وجود کائنات کی تخلیق اور اس کی ترتیب اور تنظیم سے بھی بخوبی ہوتا ہے) مسلمانوں میں ابتدا میں وراثت اور بعد میں مال غنیمت کی تقسیم کے معاملات نے حساب کی تعلیم کو بھی فروغ دیا اس طرح پڑھنے اور لکھنے کی مہارتوں کے ساتھ ساتھ گنتی اور حساب کی بنیادی مہارت کا وجود منظر عام پر آیا۔ حساب کے سلسلے میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک حدیث بھی منسوب ہے جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ علم الفرائض سیکھو اور لوگوں کو سکھاؤ (بیہقی) علم الفرائض جاننے کے لیے سب سے بنیادی شرط حساب (ریاضی) کو جاننا ہے۔ غرض یہ تین بنیادی مہارتیں Basic Skills جو تعلیم کے لیے نقطہ آغاز ہوتی ہیں، ان کو مسلمانوں نے باقاعدہ رواج دیا بہت ممکن ہے اس سے پہلے ان کی اہمیت محسوس کی جاتی ہو لیکن آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی تعلیمات کے ذریعہ ان تینوں کو جس طرح یکجا کر کے درس و تدریس کے لیے لازمی بنا دیا ایسی مثال اس سے پہلے نہیں ملتی۔ ان بنیادی مہارتوں کا تعین اور ان سے تعلیم کا آغاز

کرنے سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم بحیثیت ماہر تعلیم اور مستحکم ہو جاتے ہیں بلکہ نصاب کی تدوین اور ترتیب میں بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی کمال مہارت کا ثبوت ملتا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جن مہارتوں کو رواج دیا بعد میں آنے والے ماہرین تعلیم نے انہی کو رہنما اصول قرار دیا اور آج بھی تعلیمی نفسیات اور اصول تعلیم کی تمام تر توجہات ان مہارتوں کے بغیر درس و تدریس کی تکمیل کو ناممکن قرار دیتی ہیں۔

مسلمانوں میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مقرر کردہ لائحہ عمل کے مطابق نصاب کی تیاری میں ان تین باتوں کو قرار واقعی اہمیت دی گئی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو جامع اور متوازن نظام تعلیم ترتیب دیا اس کے اثرات بہت عرصہ بعد تک موجود رہے اس لیے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تعلیم کے ہر پہلو اور مرحلہ کا جائزہ لے کر مختلف تعلیمی اور تربیتی سرگرمیاں تجویز کی تھیں۔ اس نظام تعلیم کی ان خوبیوں کا اعتراف مختلف ادوار میں محققین نے بھی کیا ہے۔ وہ مختلف احادیث کے حوالے سے مسلمانوں کے نظام تعلیم و تربیت کی اس طرح تصویر کشی کرتے ہیں [1]

The general course of training for young males are setforth in the hadith as follows : on the seventh day after the child's birth the Aqiqa (hair cutting together with the sacrifice of an animal) is performed and he receives his name and is made secure against all harms; when he is six years old his education begins : at the stage of nine he is given a separate sleeping place; at thirteenth year of age he receives corporal punishment when he omits his prayers; at sixteenth his father gives him in marriage, then grasp him by the hand and says "My son I have trained you and had you taught and I have given you in marriage : now I beseach God for help against your temptations in this world and against you being punished in the last judgement (Ref-Ghazali).

احادیث کی روشنی میں لڑکوں کی تعلیم و تربیت کے لیے یہ نظام ترتیب دیا جا سکتا ہے پیدائش کے ساتویں دن عقیقہ کی تقریب منعقد کی جائے (جس میں بچے کے بال تراشنے کے ساتھ جانور کی قربانی دی جائے) اس کا نام تجویز کیا جائے اس طرح اسے آئندہ خطرات سے محفوظ کیا جائے چھ سال کی عمر میں اس کی تعلیم شروع کی جائے۔ نو سال کی عمر میں اسے سونے کے لیے الگ بستر فراہم کیا جائے تیرہ سال

---

1. James Hasting : Encyclopedia of Religion and Ethics : Vol : V Second Edition - London - 1937 - P-100

کی عمر میں اگر وہ نماز کی پابندی نہ کرے تو اسے جسمانی سزا دی جائے۔ سولہ سال کی عمر میں باپ بیٹے کی شادی کرتا ہے اور اس کا ہاتھ تھام کر کہتا ہے کہ بیٹے میں نے تمہاری تعلیم اور تربیت کردی ہے تمہاری شادی کردی ہے اب میں اللہ تعالیٰ سے دعاگو ہوں وہ تمہیں اس دنیا میں فتنہ سے محفوظ کرے اور روزِ محشر سزا سے محفوظ رکھے (بحوالہ امام غزالی)

مسلمانوں کے تعلیمی نصاب سے متعلق امام غزالی کے حوالہ کی تائید اور پورے نظام تعلیم و تربیت کا خاکہ اس امر کی نشاندہی کرتا ہے کہ ابتدا ہی سے تعلیم اور تربیت دونوں کو ایک ساتھ رکھا گیا۔ اس پورے عمل میں بچہ کی پیدائش کے فوراً بعد سے اس کی دیکھ بھال اور تربیت کا عمل شروع کیا جاتا تھا اور والدین اور اساتذہ اس کی زندگی کے آخری مرحلے تک اس کی تعلیم و تربیت کا خیال رکھتے تھے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں نصاب کا جائزہ لیا جائے تو بظاہر کوئی ایسا ریکارڈ یا تاریخی حوالہ نہیں ملتا جس سے معلومات اور مہارتوں کے اس نظام کو کوئی نام دیا جاسکے البتہ مختلف حوالوں اور شواہد کے ذریعے ان مضامین اور مہارتوں کے بارے میں جانا جاسکتا ہے جن کی تدریس اس دور میں رائج کی گئی تھی۔

قرآن کی تعلیم

اسلامی تعلیمات کا مرکز قرآن پاک کی تعلیم ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں قرآن کی تدریس کو نصاب کے مرکز Core of the curriculum کی حیثیت حاصل تھی۔ مذہبی تعلیمات کی رو سے قرآن وہ واحد ذریعہ ہے جس سے حکمت و دانش کا پتہ چلتا ہے۔ دنیا کے بیشتر علوم کے بارے میں جدید تحقیقات کے بعد موجودہ دنیا کے محققین بھی اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ تمام علوم کا سرچشمہ قرآن ہی ہے قرآن پاک جس طرح مختلف حصوں میں رفتہ رفتہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا اسی طرح لوگوں تک پہنچا دیا جاتا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سلسلے میں کئی صحابہ کرام کو مختلف ذمہ داریاں تفویض کی تھیں کچھ لوگ ان آیات کو ضبط تحریر میں لاتے اور اور کچھ لوگ ان آیات کی تدریس اور اشاعت میں مصروف رہتے تھے اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حقانیت کا سب سے پہلا مظہر یہی قرآن کریم تھا جس میں حکمت اور دانائی کی وہ تمام باتیں موجود تھیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے لیے عام کیا تھا تاکہ وہ فلاح پاسکیں اسی کتاب علم و حکمت (یعنی قرآن) Book of knowledge and wisdom کے مطابق نہ صرف قرآن کو تعلیم و تربیت میں مرکزی اہمیت دی گئی بلکہ ابتدائی عہد کے بے شمار شواہد کے مطابق تعلیم کا آغاز قرآن پاک ہی سے کیا گیا۔

مسلمانوں نے قرآن کی تدریس کے ساتھ ساتھ کئی ایسے علوم بھی وضع کیے جن کا تعلق براہ راست قرآن ہی سے تھا ابتدا میں یہ قرآن کی تدریس میں مختلف انداز سے معاونت کرنے والے شعبوں کی حیثیت رکھتے تھے لیکن بعد میں انہیں الگ مضمون کی حیثیت حاصل ہو گئی جو آج بھی اسی انداز سے برقرار ہے ان علوم میں لکھنے پڑھنے کے علاوہ قواعد (صرف و نحو)، علم لغت، علم معانی، بیان، بدائع اور تفسیر وغیرہ اب بھی بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ قرآن پاک کو پڑھنا اور اسے سمجھنا اسلام میں تعلیم کی بنیاد اور درس و تدریس میں مرکزی مضمون ہی نہیں بلکہ خود اسلام قبول کرنے کا لازمی تقاضہ بھی ہے۔ مسجد نبوی کے تعلیمی ادارے میں قرآن ہی کی تدریس سے سلسلہ شروع کیا گیا تھا اور دور دراز سے مسلمان اور غیر مسلم اسی کو سمجھنے اور جاننے کے لیے وہاں آیا کرتے تھے۔ بعد میں جب درس و تدریس کا سلسلہ اور مساجد اور تعلیمی اداروں تک وسیع ہو گیا تو قرآن کی تدریس وہاں بھی لازمی قرار پائی۔ اساتذہ صرف قرآن پڑھنا ہی نہیں سکھاتے تھے بلکہ مختلف الفاظ، تراکیب اور اصطلاحات کی وضاحت کے ساتھ ساتھ قرآنی آیات کا مفہوم بھی سمجھایا کرتے تھے۔

عہد نبوی میں نہ صرف قرآن بلکہ عام خط و کتابت اور تحریر بھی نقطوں اور اعراب سے خالی ہوتے تھے ابتدا میں انہیں پڑھنے والے تمام لوگ عربی ہی تھے اس لیے کوئی دشواری پیش نہیں آئی لیکن بعد میں جب غیر عرب اقوام نے بھی اسلام قبول کیا تو ضرورت محسوس ہوئی کہ بلاد عرب سے عجم تک پھیلے ہوئے ان لوگوں کے لیے قرآن کے مختلف الفاظ کے یکساں تلفظ کے معاملے کو حتمی طور پر طے کر لیا جائے یہ کوشش کافی دن تک ہوتی رہی اور بالآخر کافی تحقیق اور جستجو کے بعد قرآن پاک کو موجودہ نقطوں اور اعراب سے مزین کیا گیا۔ اس طرح تلفظ کے معاملے میں عربی اور عجمی کے اختلاف کا معاملہ ختم ہو گیا (واضح رہے کہ گول نقطے حجاج بن یوسف کی گورنری کے دور میں رائج ہوئے تھے اور ان کی ایجاد کا سہرا نصر بن عاصم اور یحییٰ بن یعمری کے سر تھا) یہ دونوں حضرات علم نحو کے بہت بڑے ماہر مانے جاتے تھے[1] قرآن کی ترتیب اور اسے اعراب اور نقطوں سے مزین کرنے احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم جمع کرنے اور ان کے بارے میں تحقیق کرنے کے لیے محققین کو کئی اور علوم کی مدد لینی پڑی۔ ویسے بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے تجویز کردہ تعلیمی پروگرام میں صرف ناظرہ قرآن ہی نہیں بلکہ قرآن کا فہم بنیادی مضمون ہے قرآن فہمی اتنا وسیع موضوع ہے کہ اس کے لیے خود نحو کئی اور مضامین کی تدریس بھی لازمی ہو جاتی ہے۔

---

[1] عبدالرزاق کانپوری: علم الکتابت یا ابجد کی تاریخ، مطبوعہ سلور جوبلی نمبر ماہنامہ زمانہ کانپور، بھارت

قرآن فہمی کے لیے مختلف مضامین کی معلومات

مسلمانوں میں کبھی اس بات پہ ذرہ برابر بھی اختلاف نہیں رہا کہ تعلیم و تدریس میں سب سے زیادہ اہمیت اور مرکزیت قرآن پاک کو حاصل ہے۔ البتہ اس موضوع پر محققین اور مورخین نے اظہار خیال ضرور کیا ہے کہ قرآن فہمی کس طرح ممکن ہے اور اس کے لیے کون کون سے مضامین کی معلومات لازمی ہو جاتی ہیں۔ ابو طالب طبری کے خیال میں قرآن کی تفسیر کرنے کے لیے تین باتوں کا ہونا ضروری ہے اور ان کے بغیر تفسیر قرآن قطعی طور پر ممکن نہیں ہے۔ ان تین باتوں میں اول صحیح اعتقاد ہے دوم حق اور راست گفتگو ہے اور سوم علم (نحو) اور اعراب سے واقفیت ہے۔ یقیناً حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد کے مفسرین میں یہ تینوں خصوصیات موجود تھیں۔ طبری کے برعکس علامہ جلال الدین سیوطی نے تفسیر قرآن کے لیے پندرہ علوم میں مہارت کو لازمی قرار دیا ہے۔ ان میں علم لغت، علم نحو، علم صرف، علم اشتقاق علم معانی۔ بیان۔ بدیع۔ علم قرات، علم اصول دین۔ فقہ، اسباب نزول اور علم قصص، علم ناسخ و منسوخ، علم اصول فقہ، علم حدیث اور علم لدنی (وھبی) تو بنیادی حیثیت رکھتے ہیں جن کا تعلق زبان اور اس کی قواعد کے ساتھ ساتھ براہ راست دین سے بھی ہے۔ ان بنیادی مضامین کے علاوہ کئی مضامین اور بھی ہیں جو براہ راست زبان یا مذہب کے احاطہ میں نہیں آتے اور جن کی معلومات حاصل کیئے بغیر قرآن کو سمجھنا اور اس کی تفسیر بیان کرنا ممکن نہیں ہے۔ یہ مضامین مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ جغرافیہ۔ جغرافیہ کی معلومات اس لیے ضروری ہیں کہ ان مقامات کے بارے میں جانا جاسکے جن کا قرآن کریم میں تذکرہ کیا گیا ہے۔

۲۔ تاریخ۔ قرآن میں بے شمار واقعات اور حالات بیان کیئے گئے ہیں اس میں کئی قصص بھی شامل ہیں ان سب کو اسی وقت بہتر طور پہ سمجھا جاسکتا ہے جب قاری کو تاریخ سے واقفیت ہو۔

۳۔ منطق۔ منطق کا علم اس لیے ضروری سمجھا جاتا ہے کہ قرآن میں جو باتیں کہی گئی ہیں انہیں بذریعہ دلائل نہ ماننے والوں اور حجت کرنے والوں پر ثابت کیا جاسکے۔

۴۔ علم الحقائق۔ علم الحقائق جدید مسائل اور تحریکات کے بارے میں واضح اور مقدس

مہارت فراہم کرتا ہے۔ اس مہارت کے حصول کے بعد ہی قرآن کو جدید تقاضوں اور تحریکات کے آئینے میں خود بھی سمجھا جاسکتا ہے اور دوسروں کو بھی سمجھایا جاسکتا ہے۔ اس علم کے بغیر تفسیر میں وہ جامعیت نہیں آتی جو جدید دور سے متاثر ہونے والے ذہنوں کو تعلیم دے سکے۔

۵۔ علم الحساب۔ قرآن میں کئی مقامات پر علم میراث کا بیان بھی ہے وراثت کے سلسلے میں اسلام نے جو طریقہ کار اور اصول وضع کیے ہیں وہ بہت جامع اور سائنٹفک ہیں لیکن ان سب کو سمجھنے اور پھر ان پر عمل کرنے کے لیے علم الحساب کا جاننا ضروری ہے۔ اس طرح وراثت اور اس کی تقسیم کے عمل میں معمولی سی غلطی کا امکان بھی باقی نہیں رہتا۔

۶۔ علم العدل یا مناظرہ۔ مفسر قرآن کو علم مناظرہ میں بھی مہارت حاصل ہونی چاہیے کیونکہ اس کے بغیر وہ اہل باطل کو قرآن کی حقانیت اور جامعیت کا قائل نہیں کرسکتا۔

۷۔ علم اسرار۔ علم اسرار النسان میں حقائق کو جانچنے اور پرکھنے کے لیے سائنسی طریقہ کار فراہم کرتا ہے اس کی وجہ سے النسان کی توجیہات اور تشریحات میں حقیقت شامل ہو جاتی ہے وہ محض اندازوں اور تصورات و خیالات کے ذریعے قرآن کے بارے میں رائے زنی سے محفوظ رہتا ہے۔ یہ علم دنیاوی اعتبار سے جتنا اہم ہے مذہبی اعتبار سے اس سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ اس لیے کہ قرآن کی تفسیر محض رائے سے کرنے کی ممانعت کی گئی ہے[1]

مندرجہ بالا حوالوں کی روشنی میں ایسے بیسیوں مضامین کی نشاندہی ہوتی ہے جن کی معلومات سے تفسیر قرآن میں معاونت ہی نہیں ہوتی بلکہ ان کے بغیر قرآن فہمی ممکن نہیں ہے ان مضامین میں سے بیشتر مضامین حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں بھی پڑھائے جاتے تھے البتہ ابتداء میں انہیں الگ مضمون کی حیثیت حاصل نہیں تھی۔ غرض ابتدائی عہد کے تعلیم و تدریس کے نصاب میں بالواسطہ طور پر قرآن کو سمجھنے اور اس کی اشاعت کا فریضہ ادا کرنے کی صلاحیت عطا کرنے والے کئی مضامین کی اہمیت واضح ہو جاتی ہے۔

---

[1] امیر الہدیٰ: مسلمانوں کے علمی و ثقافتی کارنامے: قمر کتاب گھر۔ کراچی صفحات ۲۳ - ۲۹

نصاب میں کئی مضامین کی شمولیت

قرآن فہمی کے حوالے سے کئی مضامین کی تدریس کی اہمیت اور مختلف شواہد سے اس دعوے کی توثیق بھی ہوتی ہے کہ عہد نبوی میں کئی اور مضامین بھی شامل نصاب تھے، یہ تمام مضامین اور ان کے موضوعات تعلیم و تدریس کا اس حد تک لازمی حصہ بن گئے تھے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان معلمین اور وفود کو بھی ان کی تعلیم و تربیت کے لیے ہدایات دیتے تھے جو اس کام کے لیے بھیجے جاتے تھے۔ مثلاً آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دس ہجری میں ربیع الاخر یا جمادی الاول کے مہینے میں حضرت خالد بن ولید کو بنی حرث کی جانب روانہ کیا (ہم پہلے ہی واضح کر چکے ہیں کہ عسکری خدمات کے ساتھ ساتھ انہوں نے گراں قدر تعلیمی خدمات بھی سرانجام دی تھیں) حضرت خالد بن ولیدؓ نے نجران میں قیام کیا اور لوگوں کو دین کی تبلیغ کی اور قرآن سکھایا وہاں سے انہوں نے ایک خط کے ذریعے اپنی تعلیمی سرگرمیوں کی رپورٹ حضورؐ صلی اللہ علیہ وسلم کو ارسال کی جس میں بتایا کہ وہ حسب ارشاد لوگوں کو دین کے امر و نواہی اور احکامات بتا رہے ہیں اور انہی کے درمیان مقیم ہیں انہوں نے مزید لکھا کہ اس کے بعد جو احکامات ہوں ان پر عمل کیا جائے۔[1] حضرت خالد بن ولید کے خط سے جہاں اس بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ ابتداء میں قرآنی تعلیمات دیتے وقت سب سے زیادہ ترجیح احکامات اور امر و نواہی کو دی جاتی تھی وہیں اس امر کی تصدیق بھی ہوتی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا معلمین سے براہ راست رابطہ تھا اور معلمین آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے تجویز کردہ موضوعات اور مضامین کی تعلیم دیتے تھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے نصاب کی ترتیب اور پھر اس کی تکمیل کی نگرانی کا ایک اور ثبوت حضرت عمرو بن حزمؓ کو دی جانے والی ہدایات سے ملتا ہے۔ انہیں قرآن اور اسلامی احکامات کی تعلیم دینے کے لیے یمن روانہ کیا گیا تھا (بعض مورخین کے مطابق آپ کے فرائض میں زکوٰۃ کی وصولیابی بھی شامل تھی) آپ کو جو تحریری ہدایات حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے ملی تھیں ان سے نصاب میں اسلام سے متعلق اہم موضوعات کا اندازہ ہوتا ہے ہدایات میں درج تھا کہ وہ لوگوں سے اسی قدر

---

[1] محمد بن ہشام: سیرۃ (ابن ہشام) مترجم شیخ محمد اسماعیل، مقبول اکیڈمی لاہور ۱۹۶۱ء صفحات ۵۷۱ - ۵۶۹

زکوٰۃ وصول کریں جس کا خدا نے حکم دیا ہے وہ لوگوں کی بھلائی کی بشارت دیں اور انہیں بھلائی کا حکم دیں ، انہیں قرآن اور احکام دین کی تعلیم دیں ، اس ہدایت نامے میں وضو ، نماز ، زکوٰۃ ، جزیہ اور ایسے ہی امور کی صراحت کی گئی تھی جن کی عملی زندگی میں زیادہ ضرورت پڑتی ہے[1] غرض دینی تعلیم میں بھی ان امور کو نصاب میں اولیت دی گئی تھی جن کی عام لوگوں کو ضرورت پڑتی ہے اس طرح اس نصاب میں عملی افادیت Practical utility کا خاص خیال رکھا گیا تھا مضامین اور موضوعات کی ترجیحات کے اعتبار سے یہ ترتیب دراصل جدید دور کے اس نصاب کی بنیاد ہے جسے مسائل محوری نصاب

Problem Centred Curriculum

کہا جاتا ہے اور جس میں افراد اور ان کے معاشرے کے تقاضوں کا زیادہ خیال رکھا جاتا ہے ۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مذہبی تعلیمات میں جن امور کو ابتداً رائج کیا حضرت عمرؓ نے انہیں باقاعدگی سے نصاب کا حصہ بنا دیا ۔ قرآن کی وہ سورتیں جن میں عام زندگی سے متعلق بیشتر شرعی احکامات موجود تھے ان کا سیکھنا لازمی قرار دیا گیا ان سورتوں میں سورۃ بقر ، سورۃ نساء ، سورۃ مائدہ سورۃ حج اور سورۃ نور شامل تھیں (بحوالہ کنز العمال ج ۱ ۔ ص ۔ ۲۰۱)[2] آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات کی روشنی میں یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسرے مضامین اور دوسری زبانیں سیکھنے کی بھی حوصلہ افزائی فرمائی ، حضرت زید بن ثابتؓ کو خود ہدایت فرمائی کہ وہ عبرانی زبان سیکھیں ۔ یہ زبان سیکھنے کی ضرورت اس لیے محسوس ہوئی کہ مسلمانوں کو یہودیوں سے بہت سے معاملات میں خط و کتابت اور معاہدے کرنے پڑتے تھے ۔ ان تمام باتوں کو خفیہ اور محفوظ رکھنے کے لیے ضروری تھا کہ مسلمانوں ہی میں سے کوئی اس زبان کی تحریر اس کے الفاظ اور ان کے مفہوم اور تشریحات سے پوری طرح باخبر ہو ۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں سیاسی ، سفارتی اور عسکری ضروریات کے تحت مختلف زبانیں اور مضامین سیکھنے کی تصدیق ہوتی ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد تو قرآن کے ساتھ ساتھ فرائض اور سنت کی تعلیم بھی لازمی ہو گئی تھی جبکہ باقی مضامین کی تدریس ویسے ہی رائج رہی ۔

مختلف حوالوں اور تذکروں میں قرآن و سنت کے علاوہ دوسرے مضامین کی تدریس

---

[1] محمد بن ہشام ، سیرۃ ابن ہشام ، مترجم شیخ محمد اسماعیل ۔ مقبول اکیڈمی لاہور ، ۱۹۶۱ء صفحات ۲ ، ۵

[2] امیر الہدیٰ ، مسلمانوں کے علمی و ثقافتی کارنامے ، قرکتاب گھر ، کراچی صفحہ ۲۲

کی تائید اور تصدیق تو ملتی ہے لیکن ان کا واضح طور پر مختلف مضامین کے حوالے سے تعین نہیں کیا جا سکتا اس امر کی شہادتیں بے شمار ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن وسنت کے لازمی نصاب کے علاوہ تقسیم ترکہ کی ریاضی مبادئ طب، علم ہیئت، علم الانساب، علم تجوید القرآن اور نشانہ بازی اور پیراکی کی تعلیم کو بھی نصاب میں شامل فرمایا تھا۔ یہ مضامین اختیاری Optional تھے۔ اور ان کا سرسری جائزہ لیا جائے تو اندازہ ہو جاتا ہے کہ ان میں معلومات Knowledge اور مہارتیں Skills دونوں ہی کا لحاظ رکھا گیا تھا۔ ان کا محور و مرکز عام لوگوں کی انفرادی اور اجتماعی ضروریات اور مسائل تھے کیونکہ ان علوم میں کمال کے بعد دنیاوی اعتبار سے بہت سے مسائل کو حل کیا جا سکتا تھا۔ یہ مختلف مضامین قرآن وسنت کے مضامین کے بعد اہمیت رکھتے تھے اور ان کا پڑھنا اور سمجھنا بھی لازمی تھا اسی لیے بعد میں مسلمانوں نے انہیں فرض کفایہ کی حیثیت دی [1]

نصاب میں مختلف مضامین کی تدریس کے بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف مواقع پر کئی امور کی نشاندہی کی۔ اس طرح نصاب کو جامع اور فطری تقاضوں کے عین مطابق بنانے کے لیے اہم اصول فراہم کیے حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ [2]

تعلموا الفرائض والقرآن وعلموا الناس فإني مقبوض (ترمذی)

علم فرائض اور قرآن کا علم سیکھو اور لوگوں کو سکھاؤ کیونکہ میں قبض کر جاؤں گا (اٹھا لیا جاؤں گا) ترمذی کے مطابق فرائض سے مراد یا تو فرض چیزیں ہیں یا علم الفرائض ہے اور علم الفرائض اسی وقت سیکھا اور سمجھا جا سکتا ہے جب ریاضی کی معلومات حاصل ہوں [3] غرض آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دینی اور دنیوی اعتبار سے انسانوں کی فلاح میں معاونت کرنے والے مضامین کی تدریس اور معلومات کی فراہمی سے کبھی بھی منع نہیں فرمایا البتہ صرف ایسی سرگرمیوں سے منع فرمایا جو خلاف اسلام تھیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور کے نصاب میں اس سے زیادہ وسعت اور موزونیت

---

[1] محمد حمید اللہ: عہد نبوی کا نظام حکمرانی (جلد اول) مکتبہ ابراہیمیہ، حیدر آباد دکن، بار دوم ۱۹۴۹ء صفحہ ۲۲۲

[2] مشکوٰۃ شریف مترجم جلد اول کتاب العلم صفحہ ۶۳۔

[3] ایضاً صفحہ ۹۹

اور کیا ہو سکتی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دورِ جاہلیت کے مضامین کی تدریس بھی جاری رہنے دی البتہ صرف وہ مضامین جو اسلامی تعلیمات کے منافی تھے صرف انہیں تبدیل یا منسوخ کر دیا گیا[1]

نصاب کی تیاری کے اصول

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کے مطالعے سے جن مضامین کی تدریس ثابت ہوتی ہے ان میں قرآن اور اسلامی احکامات کے علاوہ جو مضامین شامل ہیں ان کی نوعیت دو مختلف اعتبار سے بہت زیادہ تعلیمی ہے۔ ان مضامین میں بیک وقت معلومات اور مہارتوں دونوں کا خیال رکھا گیا ہے یہ مضامین نہ صرف لوگوں کو معلومات فراہم کرتے ہیں بلکہ ہنر اور مہارت کے ذریعے انہیں بہتر پیشہ ورانہ تربیت بھی فراہم کرتے ہیں۔ نصاب میں پیشہ ورانہ امور کے ساتھ جسمانی اور ذہنی تربیت کا انتظام بھی رکھا گیا تھا نصاب میں لڑکیوں کے لیے ان کے ماحول اور معاشرتی تقاضوں کی مناسبت سے الگ پیشہ ورانہ مہارتوں پر مبنی مضامین بھی رائج کیے گئے تھے ان میں مختلف گھریلو کام اور دستکاریوں کے حصول کی حوصلہ افزائی کی گئی تھی تاکہ وہ بھی اس شعبہ میں نمایاں مقام حاصل کر سکیں (اس موضوع پر خواتین کی تعلیم کے باب میں الگ بحث کی گئی ہے)

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے تجویز کردہ تعلیم و تربیت کے نظام میں نصاب کا تعین کرتے وقت جن اصولوں کو پیش نظر رکھا گیا تھا وہ مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ لوگوں کو ان کے حقیقی مقصد حیات سے باخبر کرنے کے لیے انہیں قرآن اور مذہبی امور کی تعلیم دی جائے تاکہ وہ اپنی زندگی کے تمام معاملات اسی ضابطے اور طریقہ کار کے مطابق گزار سکیں جو اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے مقرر کیا ہے۔ اس مقصد کے لیے قرآن کو لازمی قرار دیا گیا اس میں بھی نظری اور عملی th eoritical and practical ہر دو پہلوؤں کا پورا پورا خیال رکھا گیا تھا۔

۲۔ اپنے ماحول کو بہتر طور پر سمجھنے اور معاشرتی مطابقت حاصل کرنے کے لیے دوسری زبانوں کو سمجھنے کی تائید کی گئی تاکہ کسی بھی مرحلے پر عام افراد کو دوسروں سے رابطہ میں کوئی مشکل درپیش نہ ہو انہیں ایسے مضامین کی تحصیل کا موقع فراہم کیا گیا جو دوسرے لوگ بھی جانتے ہوں

---

[1] شاہ معین الدین ندوی: تاریخ اسلام غضنفر اکیڈمی۔ کراچی ۔ ۱۹۷۵ء، صفحہ ۱۹۹

۳۔ زندگی اور اس کے روزمرہ مسائل کے حوالے سے نصاب میں کئی ایسے مضامین اور سرگرمیاں بھی رائج کی گئیں جن سے ایک جانب تو بہتر معاشرتی مطابقت حاصل کی جاسکتی ہے دوسری جانب پیشہ ورانہ تربیت حاصل ہوتی ہے۔ اس طرح نصاب بیک وقت انفرادی اور اجتماعی ہر دو نوعیت کے تقاضوں کی تکمیل کے لیے معلومات اور مہارت فراہم کرتا ہے۔ مبادئ طب اور ریاضی اسی نوعیت کے مضامین ہیں۔

۴۔ نصاب میں تنوع پیدا کرنے کے لیے مختلف النوع سرگرمیوں کو فروغ دیا گیا مثلاً صرف کتابی معلومات ہی نہیں بلکہ عملی تجربات فراہم کرنے والے مضامین بھی شامل نصاب تھے۔ ان مختلف سرگرمیوں کے ساتھ جسمانی صحت اور ذہنی نمو کے لیے مختلف سرگرمیاں بھی رائج کی گئی تھیں۔ ان تمام اقدامات کے ذریعے نصاب کو مثالی متوازن نصاب بنایا گیا تھا۔ اس میں ایک جانب قرآن اور قرآنی تعلیمات جیسے موضوعات شامل تھے اور دوسری جانب مختلف پیشوں کی تربیت کے ساتھ ساتھ پیراکی اور نیزہ بازی جیسی عام سرگرمیاں بھی شامل تھیں۔

مندرجہ بالا اصولوں سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے تجویز کردہ نصاب کی قدر و قیمت کا اندازہ ہوتا ہے گو اس دور میں تعلیم و تربیت کی وہ سہولتیں موجود نہیں تھیں جو اب ہیں اور نہ ہی اس دور کے معاشرہ میں لوگوں کو زیادہ مشاہدات اور تجربات کے مواقع حاصل تھے پھر بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ صرف درس و تدریس کے عمل کو تیز کیا بلکہ ہمہ گیر اور متوازن نصاب کے ذریعے اسے زندگی اور زندگی کے مقاصد سے زیادہ قریب کر دیا۔

جسمانی صحت اور کھیل

کھیل اور جسمانی صحت کی مختلف سرگرمیاں بظاہر نصاب سے باہر کی سرگرمیاں نظر آتی ہیں لیکن موجودہ دور میں تعلیمی ماہرین انہیں ہم نصابی یا معاون نصابی سرگرمیاں Co-curricular activities کہتے ہیں گو یہ سرگرمیاں اب بھی باقاعدہ نصاب میں شامل نہیں ہوتیں لیکن ان کی افادیت اور اہمیت کے پیش نظر انہیں یہ درجہ دیا گیا ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے تجویز کردہ مضامین اور سرگرمیوں کی مختصر سی فہرست (جس کا تذکرہ اسی باب کے آغاز میں کیا گیا ہے) کا جائزہ لیا جائے تو ان میں کھیلوں اور جسمانی ورزش پہ مبنی پیراکی اور نیزہ بازی کی سرگرمیوں کی نشاندہی ہوتی ہے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں نصاب کا حصہ قرار دیا تھا اور موجودہ عہد کے ماہرین تعلیم طویل عرصے کے بعد ایک بار پھر اس جانب رجوع ہو رہے ہیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں ذہنی اور روحانی نشوونما کے لیے جسمانی صحت کی اہمیت کو محسوس کیا گیا تھا اسی لیے جسمانی صحت کو یقینی بنانے والی مختلف سرگرمیوں (کھیلوں) کی حوصلہ افزائی کی گئی تھی۔ تاکہ نوجوانوں میں چستی اور تندرستی قائم رہے۔ بہت سے مورخین کے خیال میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سرگرمیوں کی تعلیم و تربیت کو اس لیے رائج کیا تھا کہ مسلمان عسکری اعتبار سے اپنے آپ کو چاق و چوبند رکھ سکیں مقاصد کچھ بھی رہے ہوں دونوں صورتوں میں اس بات کی تصدیق ضرور ہوتی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس عہد میں جسمانی صحت کی اہمیت کو نہ صرف تسلیم کیا تھا بلکہ اس کے لیے مختلف سرگرمیاں بھی تجویز کی تھیں اسلامی عبادات کا نظام (نماز اور روزہ) روحانی اور مذہبی افادیت اور پاکیزگی کے ساتھ ساتھ انسانی جسم کو فعال رکھنے کا عمل بھی سر انجام دیتا ہے یہی خصوصیت اسلام کے تعلیم و تربیت کے نظام میں بھی ملتی ہے کیونکہ جسمانی صحت کے حوالے سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو تیراندازی شہسواری اور پیراکی کی تاکید فرمائی تھی[1] (یہ سرگرمیاں اس دور کے عرب معاشرے اور ماحول کی مناسبت سے تجویز کی گئی تھیں) عرب انہیں کھیل تصور کرتے تھے اور ظہور اسلام سے پہلے بھی ان سرگرمیوں کی طرف راغب تھے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے روایتی کھیلوں کو منسوخ نہیں فرمایا بلکہ ان کی افادیت محسوس کرتے ہوئے مسلمانوں کو بھی ان میں حصہ لینے کی تاکید کی ایک اور حوالے کے مطابق آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نشانہ بازی سیکھنے کا حکم بھی دیا تھا جو کھیل ہی کی نوعیت کی ایک فعالیت Activity ہے[2] اور جس کا مقصد جسمانی صحت اور تندرستی ہی ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ان سرگرمیوں سے متعلق ارشادات پر عمل پیرا ہونے سے مسلمانوں نے دینی علوم میں مہارت کے ساتھ ساتھ دنیاوی علوم اور اپنی جسمانی صحت کے معیار کو بھی برقرار رکھا۔ اکثر گھوڑوں اور اونٹوں کی سواری کے مقابلے منعقد ہوتے تھے جن میں حصہ لینے والوں

---

[1] شاہ معین الدین ندوی: تاریخ اسلام، غضنفر اکیڈمی کراچی ۱۹۷۵ء

[2] محمد حمید اللہ: عہد نبوی کا نظام حکمرانی۔ (جلد اول) مکتبہ ابراہیمیہ حیدرآباد دکن بار دوم ۱۹۴۹ء صفحہ ۲۲۰

کی ہمت اور حوصلے کو سراہا جاتا تھا حصہ لینے والے اپنی جسمانی ورزش کا مظاہرہ کرتے تھے ۔ جبکہ دیکھنے والوں کے لیے یہی سرگرمیاں کھیل اور تفریح کا باعث بنتی تھیں ۔ دیکھنے والوں کو اس طرح اس امر کی ترغیب بھی ہوتی تھی کہ وہ بھی خود کو ایسے مظاہروں میں شرکت سے نمایاں کر سکتے ہیں ۔ نیزہ بازی اور پیراکی جہاں جسمانی ورزش کی ایک اعلیٰ قسم ہیں وہیں انہیں عسکری مہارت کی حیثیت بھی حاصل ہے ۔ ان سرگرمیوں پر اس عرب معاشرہ میں جہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں رائج کیا تھا نہ تو بڑی رقم صرف کرنی پڑتی تھی اور نہ ہی بہت زیادہ وقت کا زیاں ہوتا تھا ۔ یہ مختلف النوع سرگرمیاں اس لیے رائج کی گئیں کہ ان سے لوگوں کی جسمانی صحت بھی برقرار رہے اور وہ اپنے فرصت کے اوقات کو بہتر طور پر گزار سکیں ۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے تعلیمی پروگرام کے متوازن ہونے کی ایک بڑی علامت یہ بھی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دین اور دینی معاملات کے ساتھ ساتھ انسانوں کو اپنی ذات اور اپنے وجود کے حقوق سے بھی باخبر رکھا ۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق لوگوں پر یہ فرض بھی عائد ہوتا ہے کہ وہ اپنی آنکھوں اور اپنے جسم کے حقوق ادا کریں (بخاری) جسم کے حقوق ادا کرنے کا مطلب یہ بھی لیا جاتا ہے کہ بلا وجہ اپنے آپ کو جسمانی سختی اور اذیت سے دوچار نہ کیا جائے اور جس حد تک انسان کی صلاحیت ہو اپنے آپ سے اتنا ہی کام لیا جائے ۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض مذاہب کی تعلیمات کی طرح بھوک اور پیاس کے ذریعہ اپنے جسم کو ایذا پہنچانے کی روایت کو یکسر منسوخ فرمایا ، انسانی جسم اور اس کی ضروریات کا اس حد تک لحاظ رکھا گیا تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عبادات میں بھی اعتدال سے کام لینے کا حکم دیا ایک نوعمر معلم حضرت عثمان بن ابی العاص رضی اللہ عنہ کو تو ایک بار آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خود حکم دیا تھا کہ نمازیں بہت مختصر پڑھا کرو کیونکہ مقتدی بوڑھے بیمار اور کاروباری لوگ بھی ہوتے ہیں[1] ۔ اعتدال سے کام لینے کا واضح مقصد یہی تھا کہ انسانی جسم کو تکلیف اور تنگی کے ذریعہ اذیت نہ پہنچائی جائے ۔ انتہا تو یہ تھی کہ اگر کوئی شخص رمضان کے علاوہ لگاتار روزے رکھنا شروع کر دیتا یا نوافل کثرت سے پڑھتا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم منع فرماتے تھے[2] آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ ہدایت صرف اس لیے تھی کہ انسان اپنے جسم سے اس کی صلاحیت کے مطابق کام لے صحت مند جسمانی

---

[1] محمد بن ہشام ، سیرۃ ابن ہشام ، مترجم شیخ محمد اسماعیل مقبول اکیڈمی لاہور ۱۹۶۱ء ، صفحات ۵۵۱ ، ۵۴۸

[2] سید سلیمان ندوی : سیرۃ النبی جلد چہارم ، قرآن لمیٹڈ لاہور ۱۳۹۵ھ ، صفحہ ۱۶۱

سرگرمیوں کے ذریعے اپنی تکان دور کرے اور تازہ دم ہو کر خود کو فرائض کی ادائیگی کے لیے تیار کرے ۔
آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے تعلیم و تربیت کے نظام میں جسمانی ورزش اور کھیل کے علاوہ مشاہدات عالم (سیر و تفریح) کو بھی شامل کیا گیا تھا ۔ جہاں تک کائنات کو دیکھنے اور اللہ تعالی کے مظاہرات کا اندازہ کرنے کا معاملہ ہے اس سے لوگوں کے مشاہدے اور معلومات دونوں میں اضافہ بھی ہوتا ہے نئے نئے مقامات اور اشیاء دیکھنے سے تجربات اور خیالات میں وسعت بھی پیدا ہوتی ہے ۔ اس پوری سرگرمی میں سیر و تفریح کا پہلو بھی شامل ہوتا ہے ، تمام مناظر قدرت جہاں انسان کو غور و فکر کی دعوت دیتے ہیں وہیں اس کی نگاہوں کو فرحت اور اس کے ذہن کو مزید معلومات فراہم کرنے کا ذریعہ بنتے ہیں ۔ اس کی دعوت خود اللہ تعالی نے دی ہے (القرآن)

قُلْ سِيْرُوْا فِي الْأَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ بَدَأَ الْخَلْقَ ثُمَّ اللّٰهُ يُنْشِئُ النَّشْأَةَ الْآخِرَةَ ۱ (العنکبوت پ - ۲۰ ۲۹ - ۲۰) فرمایئے سیر و سیاحت کرو زمین میں اور غور سے دیکھو کس طرح اس نے خلق کی ابتدا فرمائی پھر اللہ تعالی (اسی طرح) پیدا فرمائے گا دوسری بار

زمین میں چلنے پھرنے (یا سیر کرنے) کا مقصد قطعی طور پر یہ نہیں ہے کہ بلا مقصد ادھر ادھر گھوما جائے بلکہ اس سرگرمی کی تعلیمی افادیت بھی ہونی چاہیے ۔ گذشتہ صدی سے جدید تعلیمی اداروں میں رائج کی جانے والی تعلیمی سیر و سیاحت Educational trips or Excursions کی غرض و غایت کا جائزہ لیا جائے تو ان ارشادات گرامی کے مطابق سیر و تفریح کی تعلیمی اہمیت کا اندازہ ہو جاتا ہے بظاہر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاں کئی ایسے مضامین رائج کیے جن میں صرف معلومات اور مہارتیں موجود تھیں وہیں باقاعدہ نصاب سے ہٹ کر کچھ ایسی سرگرمیاں بھی رائج کی گئی تھیں ۔ جن سے افراد کی ذہنی اور جسمانی تربیت ہوتی ہے ۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں یہ سرگرمیاں باقاعدہ کسی تعلیمی ادارے میں منعقد نہیں ہوتی تھیں البتہ مختلف معاشرتی تقریبات میں ان کا اظہار ہوا کرتا تھا ۔ اس طرح نصابی اور معاون نصابی سرگرمیوں کے مابین ربط اور تعلق کو قائم رکھا گیا تھا ۔ غرض آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا نصاب تعلیم و تربیت صرف کتابوں تک محدود نہیں تھا بلکہ کتابوں سے باہر کی دنیا کو دیکھنے اور سمجھنے کی حوصلہ افزائی بھی کی گئی تھی ۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو

اصول وضع کیے وہ انسانی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کے تمام تقاضوں کا خیال رکھتے ہوئے ایک جامع اور مکمل نصاب ترتیب دیتے ہیں جس میں ذہنی، معاشرتی، جذباتی اور جسمانی غرض ہر نوعیت کی نشوونما کو یقینی بنایا جا سکتا ہے۔

اس عہد کی تمام تعلیمی سرگرمیوں کا محور و مرکز آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے روزمرہ معمولات اور ارشادات کے مطالعہ کے بعد محققین اس نتیجے پر پہنچے ہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی تعلیمات میں تمام تقاضوں کا لحاظ رکھا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں ہر عمر کے لوگوں کے تقاضوں اور صلاحیت کے مختلف ہونے کی وجہ سے ان کے لیے تعلیمی نصاب بھی ایک دوسرے سے مختلف ہی تھا۔ اس دور میں حصول علم کے لیے آنے والے کئی افراد عمر رسیدہ بھی ہوتے تھے[1] بچوں اور بوڑھوں کے لیے الگ الگ سرگرمیاں رائج تھیں جن سے نصاب کی افادیت اور تعلیمی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس عہد میں خواتین کی تعلیم کے لیے جو نصاب مقرر کیا گیا تھا وہ ان کی مخصوص جسمانی ساخت اور ان کے منفرد معاشرتی تقاضوں اور ماحول کے عین مطابق تھا۔ ان کے نصاب میں پیراکی نیزہ بازی اور گھوڑے سواری کے برعکس ایسی مہارتیں اور سرگرمیاں شامل کی گئی تھیں جنہیں خواتین آسانی سے سرانجام دے سکتی تھیں۔ مجموعی طور پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سب کے انفرادی اور نموئی اختلافات کے پیش نظر اور اس عہد کے معاشرتی تقاضوں اور ضروریات کے مطابق ایک جامع اور متوازن نصاب سازی کے لیے بنیادی اصول فراہم کر دیئے تھے جن پر بعد میں بھی عمل ہوتا رہا۔

مختلف زبانوں کی تعلیم

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف زبانوں کی تدریس کی حوصلہ افزائی کی تھی تاکہ مسلمان دوسرے مذاہب اور مختلف زبانیں بولنے والے افراد کو زیادہ بہتر طور پر سمجھ سکیں۔ اس طرح ایک جانب تو معاشرتی تعلقات میں استحکام ہوتا ہے دوسری جانب ان سازشوں اور اندیشوں سے بھی باخبر رہا جا سکتا ہے جو ان گروہوں میں پرورش پا رہے ہوں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے

---

[1] محمد حمید اللہ، عہد نبوی کا نظام حکمرانی، جلد اول، مکتبہ ابراہیمیہ، حیدرآباد دکن بار دوم ۱۹۴۹ء

اس معاملے میں جدید دور کی اصطلاح کے مطابق بہت ہی لبرل پالیسی اختیار کی۔ ایسی زبانوں کی تدریس کو بھی فروغ حاصل ہوا جو مسلمان اقوام کی زبانیں نہیں تھیں بلکہ ان کا تعلق غیر مسلم لوگوں سے تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کے مطابق کہ مادری زبان کے علاوہ دوسری زبانیں بھی سیکھی جائیں۔ حضرت زید بن ثابتؓ نے پہل کی وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے میر منشی (ہیڈ محرر) تھے اور سفارتی اور سیاسی معاملات میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بہت قریب تھے۔ اسی شعبے میں مہارت حاصل کرنے کے لیے انہیں عبرانی زبان سیکھنی پڑی ایک روایت کے مطابق وہ سترہ دن مسلسل محنت کے بعد عبرانی زبان پڑھنا اور لکھنا سیکھ گئے تھے[۱] زید بن ثابتؓ عبرانی زبان کے علاوہ سریانی، فارسی، رومی، قبطی اور حبشی زبانوں میں بھی مہارت رکھتے تھے بلاشبہ یہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم و تربیت کا نتیجہ تھا کہ نخلستان عرب میں رہنے والے غیر متمدن عرب جو دوسروں کو گونگا سمجھا کرتے تھے، دوسروں کی زبانوں کو تسلیم کرنے لگے اور خود انہیں سیکھنے کی کوششیں کیں۔ حضرت سلمان فارسی نے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں ہی قرآن کریم کی کچھ آیات کا فارسی ترجمہ کر رکھا تھا[۲] کئی صحابہ کرام ایسے تھے جنہیں اپنی زبان کے علاوہ دوسری زبانوں پر بھی عبور حاصل تھا ان میں سے ایک حضرت عبداللہ بن زبیر بھی تھے جو کئی زبانوں کے ماہر تھے[۳] احادیث اور ان کی روایتوں کے حوالے سے شہرت حاصل کرنے والے صحابی حضرت ابوہریرہؓ نہ صرف اپنی زبان کے علاوہ فارسی سے بھی باخبر تھے بلکہ انہیں تورات اور اس کے مسائل سے بھی واقفیت حاصل تھی[۴] دوسروں کی زبانیں سیکھنے اور ان میں کمال حاصل کرنے کی اسلام نے کبھی بھی ممانعت نہیں کی۔ بہت سے صحابہ کرام نے تو مختلف زبانوں کی تعلیم کے دوران ان کے مذاہب کی کتابیں بھی پڑھیں۔ حضرت عبداللہؓ بن عمرو جن کے پاس احادیث کا بہت بڑا ذخیرہ تھا۔ انہوں نے جب عبرانی زبان میں دسترس حاصل کرنے کا سلسلہ شروع کیا تو توریت اور انجیل کا بھی بغور مطالعہ کیا۔[۵]

---

[۱] محمد طفیل: نقوش رسول نمبر، جلد چہارم، ادارہ فروغ اردو لاہور سنہ ۱۹۸۳ء، صفحہ ۱۳۴

[۲] Mohammad hamidullah: Introduction to Islan India: 1959 P - 151

[۳] شاہ معین الدین ندوی۔ مہاجرین حصہ دوم۔ دار المصنفین اعظم گڑھ، طبع دوم سنہ ۱۹۵۲ء صفحہ ۶۱

[۴] محمد حمید اللہ: عہد نبوی کا نظام حکمرانی (حصہ اول) مکتبہ ابراہیمیہ، حیدر آباد دکن بار دوم سنہ ۱۹۴۹ء

[۵] حاجی معین الدین ندوی: مہاجرین حصہ اول دار المصنفین اعظم گڑھ، طبع ثانی سنہ ۱۹۵۱ء، صفحات ۳۴۱ - ۳۴۰

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے غیر مادری زبانوں کے سیکھنے کی جس قدر حوصلہ افزائی فرمائی اس سے یہ تاثر لینا کہ مادری زبان کی تدریس اور اس کی تعلیم پر توجہ کم کر دی گئی کسی بھی صورت میں مناسب نہیں، بلکہ ایسا اندازِ فکر تو اس اصول اور فکر کی روح کے قطعی منافی ہوگا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کی معاشرتی، سیاسی، سفارتی اور تبلیغی ضروریات کے پیشِ نظر انہیں مختلف زبانیں اور ان کی کتابوں کے پڑھنے کی اجازت دی تھی۔ یہ اجازت ان لوگوں کے لیے بھی جو پہلے اپنی زبان اور عقائد میں پختگی حاصل کر لیتے تھے۔ یہاں ایک غلط فہمی کا ازالہ بھی ہو جانا چاہیے دراصل غیر مذاہب کی کتابوں کے مطالعہ کی اجازت اسی وقت دی جا سکتی ہے جب پڑھنے والے ذہنی طور پر پختہ ہو چکے ہوں۔ ناپختہ ذہنوں کو یہ سب کچھ یا اخلاقی موضوعات کے بارے میں بتانے سے ان کے گمراہ ہونے یا ذہنی انتشار میں مبتلا ہونے کے امکانات ہوتے ہیں۔

غیروں سے اکتسابِ علم

مسلمانوں کے ابتدائی دور کے نظامِ تعلیم و تربیت میں قرآن اور قرآنی تعلیمات کے ساتھ ساتھ مختلف علوم اور مہارتوں کی تدریس کی تصدیق ہوتی رہے اور ایک ایسا نظام سامنے آتا ہے جس کے نصاب میں دین اور دنیا دونوں کے تقاضوں میں توازن رکھا گیا ہے۔ بعض حضرات ان تمام حقائق کا اعتراف کرنے کے ساتھ ساتھ اس بات پر سختی سے قائم ہیں کہ اکتسابِ علم کے لیے مسلمانوں کو کسی غیر مسلم سے رجوع نہیں کرنا چاہیے۔ ان کا یہ موقف ان کے ذاتی تجربات اور مشاہدات کی روشنی میں درست ہو سکتا ہے لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات سے باخبر ہونے کے بعد اس موقف پر اصرار کی گنجائش باقی نہیں رہتی اسلام نے حصولِ علم کے لیے جو اصول قائم کیا وہ اس حد تک جدید ہے کہ علوم و فنون کے تعین اور ان ذرائع کی تلاش کے لیے جہاں سے علم حاصل کیا جا سکتا ہے بہت ہی وسعت موجود ہے۔ لوگوں کو (چین کی مثال دے کر) انتہائی دور دراز اور دشوار خطوں سے جا کر تعلیم حاصل کرنے کی ہدایت کی گئی۔ واضح طور پر کہا گیا کہ علم مسلمانوں کی میراث ہے جہاں سے بھی ملے اسے حاصل کیا جائے اسلام نے علم کو مسلم اور غیر مسلم کی حدود میں تقسیم نہیں کیا تھا بلکہ ہر وہ علم جس سے اللہ تعالیٰ کی حاکمیت اور مخلوقِ خدا کی فلاح کی راہ نکلتی ہو اسلام میں انتہائی محترم قرار دیا گیا تاریخ گواہ

ہے کہ عہد نبوی ؐ میں کوئی ایک مسلمان بھی ایسا نہیں تھا جو غیروں سے علم حاصل کرتے ہوئے اپنے مذہب یا عقائد سے برگشتہ ہوا ہو اس دور میں ایسا بھی نہیں ہوا کہ دوسروں کی زبانیں اور مہارتیں حاصل کرنے والے اپنی شناخت سے ہاتھ دھو بیٹھے ہوں۔ مسلمانوں نے انتہائی فراخدلی اور وسعت النظری کا ثبوت دیا چونکہ ان کی نیتیں صاف تھیں اور ان کے قلوب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت سے منور تھے اس لیے انہوں نے اس فراخدلانہ پالیسی کے باوجود علم وفن کے میدان میں نمایاں کارکردگی کا مظاہرہ کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں مسلمان عددی اعتبار سے بہت کم تھے اور اس نئے مذہب کے ماننے والوں کو قدیم مذاہب کی اقوام کی شدید مخالفت اور سازشوں کا سامنا تھا۔ اگر غیر مسلموں کے علوم وفنون سے گمراہی کا احتمال ہوتا تو اس عہد میں تو اس پابندی کے امکانات زیادہ تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم بذات خود اس معاملہ میں بہت فراخدلانہ نقطہ نظر کے حامل تھے یہی سبب تھا کہ نزول وحی کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خدیجہ رضؓ کا یہ مشورہ من وعن قبول کر لیا کہ ورقہ بن نوفل سے رجوع کیا جائے۔ انہوں نے جب آپؐ کی باتوں کی تصدیق کی اور آپؐ کو اطمینان دلایا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی سکون کا سانس لیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سیکھنے کے معاملے میں کبھی تعصب اور تنگ نظری سے نہ خود کام لیا اور نہ ہی دوسروں کو اس کی ہدایت کی صحابہ کرام میں ابتدائی دور میں لکھنے پڑھنے کی صلاحیت رکھنے والے لوگ بہت کم تھے خواندگی میں اضافے کے لیے جو بھرپور کام شروع کیا گیا اس میں غیر مسلموں کی خدمات بھی حاصل کی گئیں۔ لکھنا پڑھنا سکھانے کا کام ان لوگوں سے بھی لیا گیا جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور اصحاب رسول ؐ کے بدترین دشمن تھے اور لشکر کفار میں شامل ہو کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کرنے کے ارادہ سے آئے تھے۔ حضرت زید بن ثابت رضؓ نے انہی لوگوں سے بہت کچھ سیکھا۔[1] آپ نے کئی زبانیں سیکھیں جو آپ کو ان آزاد کردہ غلاموں نے سکھائی تھیں جو مدینے میں رہتے تھے۔ اندازہ ہے کہ آپ نے کم وبیش جتنی زبانیں سیکھیں وہ سب سکھانے والے انہی زبانوں سے تعلق رکھنے والے مختلف غلام تھے[2] غیر مسلموں سے اکتساب علم کا سلسلہ کافی عرصہ تک جاری رہا۔ ایسا نہیں ہوا تھا کہ

---

[1] Robert Gullick : Mohammad the Educator : Islamic Culture Lahore - P.P - 52-53

[2] محمد طفیل: نقوش رسول نمبر۔ جلد چہارم۔ ادارہ فروغ اردو، لاہور ۱۹۸۳ء صفحہ ۱۳۴

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک خاص مدت تک ان سے حصول علم کی اجازت دی تھی اور بعد میں ممانعت فرما دی تھی۔ مسلمانوں نے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق کہ

اَلْكَلِمَةُ الْحِكْمَةُ ضَالَّةُ الْحَكِيْمِ فَحَيْثُ وَجَدَهَا فَهُوَ اَحَقُّ بِهَا (حدیث)

(حکمت و دانش کی باتیں مومن کی کھوئی ہوئی متاع ہیں جہاں سے بھی ملیں وہ ان کا زیادہ حقدار ہے) حصول علم کا سلسلہ جاری رکھا۔ اس اصول کی وضاحت حضرت علی رضؓ کے اس قول سے بھی ہوتی ہے[1] کہ علم گم گشتہ مال ہے جہاں سے ملے لے لو چاہے مشرکین ہی کے ہاتھ سے ہو علم سیکھنے میں عیب نہ سمجھو آپس میں مل جل کر اور علم کا چرچا کرو ورنہ علم جاتا رہے گا۔ غرض مسلمانوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں کبھی بھی سیکھنے کے معاملے میں بخل سے کام نہیں لیا۔ ایک صحابی حضرت عبداللہ بن مسعود رضؓ جنہوں نے علم و فن کے شعبہ میں بڑی شہرت حاصل کی اکثر عربی زبان اور لغت کے معاملے میں استفسارات کے لیے غیر مسلموں سے رجوع کرتے تھے اکثر زبان کے دقائق کے لیے آپ زر بن جیش نامی ایک غیر مسلم کے پاس جاتے جو عربی زبان کا بہت بڑا ماہر تھا اس شخص کی موت ۸۳ھ میں ہوئی اس وقت اس کی عمر ایک سو بیس سال تھی اور اس نے آخر وقت تک اسلام قبول نہیں کیا تھا[2]۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عمزاد حضرت عبداللہ بن عباس رضؓ کا شمار بھی اس عہد کے ممتاز تعلیمی ماہرین میں ہوتا ہے انہیں شعر و شاعری سے بہت شغف تھا ان دنوں میں آپ شاعری کے سلسلے میں دو غیر مسلم افراد ضرمہ بن قیس انصاری اور ابو قیس سے رجوع کیا کرتے تھے یہ دونوں حضرات اس وقت راہب تھے لیکن بعد میں انہوں نے اسلام قبول کر لیا تھا[3]۔ حضرت عبداللہ بن عباس کے بارے میں عام روایات ہیں کہ ان کے خطبے سننے کے لیے دور دراز علاقوں سے لوگ آیا کرتے تھے۔ وہ ہفتہ میں ایک دن تفسیر قرآن۔ دوسرے دن فقہ، تیسرے دن صرف و نحو۔ چوتھے دن تاریخ عرب اور پانچویں دن شعر و شاعری کا درس دیتے تھے۔ قرآن کی مشکل سے سمجھ میں آنے والی عبارتوں کی تشریح کے لیے وہ اکثر قدیم شعرائے عرب کے کلام سے مثالیں پیش کیا کرتے تھے۔ اس کی

---

[1] ابن البر اندلسی: جامع بیان العلم و فضلہ: مترجم عبدالرزاق کانپوری۔ العلم والعلماء۔ ادارہ اسلامیات لاہور پہلی بار ۱۹۷۷ء صفحہ ۸۴

[2] ایضاً صفحہ ۲۸۹

[3] ایضاً صفحہ ۲۸۴

بدولت ادب جاہلیت کے مطالعے اور تحفظ کو بہت فروغ حاصل ہوا۔ وہ اکثر ارشاد فرماتے تھے کہ جب کبھی تمہیں قرآن کے سمجھنے میں کوئی مشکل پیش آئے (الفاظ اور تراکیب کے اعتبار سے) تو اس کا حل شعرائے عرب کے کلام میں ڈھونڈو کیونکہ وہ عرب قوم کا صحیفہ ہے[1] تاریخ میں اور کئی برگزیدہ اصحاب کی مثالیں بھی موجود ہیں، جنہوں نے اکتساب علم کے معاملے میں غیر مسلموں سے بھی استفادہ کیا۔

غیر مسلموں سے علم حاصل کرنا یا ان سے کچھ اخذ کرنا (اگر وہ اسلام کی بنیادی تعلیمات کے منافی نہ ہو) کوئی ناپسندیدہ فعل نہیں تھا بلکہ اس سلسلے میں تو مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ کی اجازت بھی حاصل تھی۔ لوگوں کو دوسروں سے معلوم کرنے کی دعوت دی گئی تھی۔ (القرآن)

قُلْ هَلْ عِنْدَكُمْ مِّنْ عِلْمٍ فَتُخْرِجُوْهُ لَنَا ۔ پ ۸ (انعام ۔ ۶ ۔ ۱۴۸)

آپ فرمائیے کیا تمہارے پاس کوئی علم ہے تو نکالو اسے ہمارے لیے۔

اللہ تعالیٰ کے ارشادات حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات اور صحابہ کرام کے کردار سے اس امر کی تصدیق ہوتی ہے کہ مسلمانوں کے لیے سیکھنے اور سمجھنے کے معاملے میں کوئی پابندی عائد نہیں کی گئی تھی۔ ایک ایسا نظام وضع کر دیا گیا تھا جس میں ہر شخص کو اس امر کا اختیار تھا کہ وہ اسلام کے بنیادی احکامات سے متصادم امور کے علاوہ باقی تمام باتوں کا علم حاصل کر سکتا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی پالیسی اس ضمن میں بہت ہی واضح تھی اور مکمل طور پر ایک آزادانہ اور روادارانہ نظام تعلیم و تربیت تشکیل دیا گیا تھا۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے تجویز کردہ رہنما اصولوں کی روشنی میں نظام تعلیم میں غیر مسلموں سے اکتساب کی گنجائش موجود ہے۔ لیکن یہ معاملہ غور طلب ہے کہ آخر ان لوگوں سے کون کون سے مضامین سیکھے جا سکتے ہیں یا ان کی کون کون سی باتیں اخذ کی جا سکتی ہیں۔ ڈاکٹر احمد شلبی کی رائے کے مطابق جہاں تک قرآن اور احادیث یا دیگر مذہبی علوم کا تعلق ہے ان کی تدریس کسی بھی غیر مسلم کے ذریعہ ممکن نہیں ہے۔ کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ابتدائی دور میں بھی انہی لکھے پڑھے لوگوں کو کاتب وحی بنایا گیا تھا جو مسلمان تھے۔ البتہ نوشت و خواند کا کام غیر مسلموں سے لیا گیا تھا اور وہ لوگ اس دوران ایسی مختلف زبانیں اور موضوعات لکھنے

---

[1] سید امیر علی: اسپرٹ آف اسلام، مترجم محمد ہادی حسین، ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور، طبع سوم ۱۹۸۴ء، صفحات ۴۶۵، ۴۶۴

اور پڑھنے کی مشق کراتے تھے جن کا تعلق قرآن اور مذہبی تعلیمات سے نہیں ہوتا تھا[۱] ڈاکٹر شلبی کے اس نقطہ نظر کی کئی اور مسلم محققین بھی حمایت کرتے ہیں۔ غرض عہد نبوی کی ان شہادتوں کے بعد غیر مسلموں کے بحیثیت اساتذہ تقرر پہ پابندی نہیں رہتی اور یہ بات بھی آسان ہو جاتی ہے کہ ان سے کن مضامین کی تدریس کا کام لیا جائے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعین کردہ اصول اس امر کی اجازت دیتے ہیں کہ اسلام اور اسلامی تعلیمات کے علاوہ ایسے تمام مضامین جن میں دین اور دینی عقائد مسخ ہونے کا احتمال نہ ہو ان کی تدریس کے لیے غیر مسلموں سے استفادہ کیا جا سکتا ہے۔ شرط یہ ہے کہ وہ لوگ جن کی خدمات حاصل کی جائیں علمی اعتبار سے نمایاں مقام رکھتے ہوں اور درس و تدریس کے فن میں بھی مہارت حاصل کر چکے ہوں۔

غیر مسلموں سے اکتساب علم کی تصدیق کے بعد نصاب کے تعین کا معاملہ بھی طے ہو جاتا ہے۔ نصاب میں قرآن اور اسلامی تعلیمات (نظری اور عملی) کو لازمی Compulsory قرار دینے کے بعد اسی اصول کی روشنی میں اختیاری مضامین Optional subjects کا تعین کیا جا سکتا ہے ان مضامین کے گروپ بنانے میں معاشرتی اور قومی ضروریات کو ترجیح دی جائے اور یہ نہ دیکھا جائے کہ ان علوم کا آغاز کہاں سے ہوا ہے اور اس میں کون لوگ زیادہ مہارت رکھتے ہیں۔ اس طریقے سے نصاب میں مختلف مضامین اور سرگرمیوں کا ایک خاکہ ترتیب دیا جا سکتا ہے۔ جو اسلامی اقدار اور جدید دور کے تقاضوں کے عین مطابق ہوگا۔

---

[۱] ڈاکٹر احمد شلبی، تاریخ تعلیم و تربیت اسلامیہ، مترجم محمد حسین خان زبیری، ادارہ ثقافت اسلامیہ، جون ۱۹۶۲ء

باب ۸

تدریسی طریقے

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جس انداز سے لوگوں کو تعلیم دی اس کے مکمل اور مؤثر ہونے کی لاتعداد شہادتیں موجود ہیں۔ ان میں سے ایک بڑی شہادت تو یہی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں ہزاروں لوگوں نے اپنے صدیوں پرانے عقائد اور روایات سے کنارہ کشی اختیار کر لی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات سے متاثر ہو کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا تجویز کردہ ضابطہ حیات اختیار کر لیا۔ یہ سب کچھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تبلیغ کے موثر ہونے کی وجہ سے ممکن ہوا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم و تبلیغ کے طریقہ کار کے بارے میں جن رہنما اصولوں کا تعین اللہ تعالیٰ نے خود کیا تھا ان کے اثرات آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث میں بھی ملتے ہیں۔

یسر و لا تعسرا و بشرا و لا تنفرا

دین کو آسان بنا کر پیش کرو مشکل بنا کر نہیں لوگوں کو خوش خبری سناؤ انہیں نفرت نہ دلاؤ

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد مسلمانوں کے لیے تعلیم و تدریس کا سب سے بڑا اصول قرار دیا گیا۔ اسی اصول کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور کے مختلف طریقہ ہائے تدریس کی بنیاد قرار دیا جاتا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم جب مختلف صحابہ کرام کو تبلیغ کے لیے روانہ فرماتے تو انہیں اسی انداز کی نصیحتیں فرماتے تھے ان ارشادات کا بالغور جائزہ لیا جائے تو ہر ذی فہم شخص انہیں مثالی طریقہ ہائے تدریس کا نام دے گا۔ اس دور میں کسی ایک انداز سے تبلیغ یا تعلیم دینے کی پابندی نہیں تھی بلکہ حالات و واقعات کے حوالے سے مختلف لوگوں کی ذہنی صلاحیتوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے طریقے کا انتخاب کیا جاتا تھا۔ طریقہ تدریس کے رہنما اصولوں کے تعین کے بعد ان کے انتخاب کے لیے معلم کو اختیار دیا جاتا تھا کہ وہ اصل صورت حال میں مناسب

انداز سے لوگوں کو سکھا سکے جو مختلف طریقے اختیار کیے گئے ان کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

خطبات Lectures

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جس طریقہ تدریس کو سب سے زیادہ فروغ دیا وہ طریقہ ہائے تدریس کی اصطلاح میں طریقہ تقریر Lecture method کہا جاتا ہے۔ یہ طریقہ دنیا کا سب سے قدیم طریقہ تدریس ہے اور آج بھی پہلے کی طرح مقبول ہے۔ اس طریقہ تدریس کے چند اہم اصول ہیں جن پر عمل نہ کیا جائے تو اس کی افادیت ختم ہو جاتی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ سے تقریری طریقے کے ان اصولوں کا اکتساب کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی روایت کے مطابق آپ صلی اللہ علیہ وسلم تیز گفتگو نہیں فرماتے تھے بلکہ رک رک کر صاف اور واضح کلام فرماتے تھے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب بیٹھا ہوا ہر شخص اسے سن سکتا تھا اور محفوظ کر سکتا ہے۔ ایک اور روایت کے مطابق آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایسے تقریر فرماتے تھے کہ کوئی شخص الفاظ شمار کرنا چاہے تو شمار کر سکتا تھا۔ حجۃ الوداع کے موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے خطبے میں ہر جملے کے بعد توقف فرماتے گئے اور ربیعہ بن امیہ بن خلف اس وقفہ میں بلند آواز سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی کہی ہوئی بات کو دہراتے گئے تاکہ مجمع کے تمام لوگ انہیں پوری طرح سن سکیں (واضح رہے کہ اس خطبے کے دوران لوگوں کی تعداد بہت زیادہ تھی اور ان تک آواز پہنچانے کے لیے دہرانے والے Repeator کی خدمات حاصل کی گئیں۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام میں فصاحت و بلاغت کے ساتھ ساتھ جن اصولوں کی نشاندہی اوپر کی گئی ہے، انہیں لیکچر کی اہم ترین خصوصیات سمجھا جاتا ہے۔ لیکچر کے دوران ان نکات کا خیال نہ رکھا جائے تو لیکچر غیر موثر ہو جاتا ہے۔ سننے والوں کی تعداد زیادہ ہو تو باتوں کو دہرانے کے لیے موید (اعادہ کرنے والے) کی تصدیق بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے طریقہ تقریر سے ہوتی ہے۔ جدید تعلیمی نظام میں لیکچر کو زیادہ سے زیادہ موثر بنانے کے لیے یہی طریقے اور اصول تجویز کیے جاتے ہیں جن کا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زندگی ہی میں عملی مظاہرہ کیا تھا۔

پہلے آسان پھر مشکل

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تدریس میں یہ اصول رائج کیا کہ پہلے آسان باتیں بتائی جائیں اور مشکل اور پیچیدہ باتوں سے تعلیم شروع نہ کی جائے بلکہ رفتہ رفتہ ان باتوں کی طرف آیا جائے۔ ابتدا ہی میں مشکل الفاظ اور مشکل خیالات سے واسطہ پڑ جائے تو متعلمین مزید جاننے سے بھی کتراتے ہیں۔ آپ کا یہ تدریسی اصول مغرب سے درآمد شدہ تدریسی مقولوں Maxims of teaching میں بھی سرفہرست موجود ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نہ صرف اس کے خالق تھے بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بھی اس پر عمل کیا کہ درس کو متعلمین کے لیے زیادہ سے زیادہ آسان اور سہل بنا کر پیش کیا۔ ایسا کرنا اس لیے بھی ضروری ہو جاتا ہے کہ اس طرح متعلمین کی سبق سے دلچسپی قائم رہتی ہے۔ لوگوں کو سکھانے کے لیے یہی طریقہ کار قرآن حکیم نے شروع کیا تھا سورۃ نساء میں تو واضح طور پر کہا گیا ہے کہ

خدا تمہارے لیے آسانیاں پیدا کرنا چاہتا ہے کیونکہ انسان ضعیف پیدا کیا گیا ہے۔ انسانی فطرت کے بارے میں خداوند کریم کے اس ارشاد کی روشنی میں انسان کی تعلیم و تربیت کے لیے اساتذہ کی ذمہ داریاں اور بڑھ جاتی ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بھی اسی اصول پر عمل کیا اور بعد میں اس عہد کے دیگر ماہرین تعلیم نے بھی اسی اصول کو راہنما بنایا۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت [۵] ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تبلیغ و اشاعت کے لیے "سکھاؤ آسان کرو مشکل نہ بناؤ" کا طریقہ کار اختیار کیا اور یہی طریقہ کار طریقہ تدریس کی بنیاد ٹھہرا۔ اس اصول تدریس کے مطابق تعلیم دینے سے اسلام کی تبلیغ و اشاعت میں بہت کامیابی ہوئی۔ اسلام کو سادہ اور سہل بنا کر پیش کیا گیا تب ہی وہ لوگوں میں بہت جلد مقبول ہوا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سکھانے میں مختلف باتوں کو ان کی اہمیت اور افادیت کی مناسبت سے ترتیب دیا۔ معلومات کو اس طرح ترتیب وار (بتدریج) لوگوں تک پہنچایا گیا۔ اس طرح مرحلہ وار خیالات اور معلومات ترتیب دینے سے سننے والوں کو وہ آسان اور سہل محسوس ہوتی تھیں اور وہ انہیں آسانی سے یاد

---

[۵] عبدالبر اندلسی: جامع بیان علم و فضلہ، مترجم عبدالرزاق ملیح آبادی۔ العلم والعلما ادارہ اسلامیات لاہور پہلی بار ۱۹۷۷ء صفحہ ۹۰

کر لیتے تھے دعوت اسلام دینے والے معلمین کو بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا ہی کرنے کی تاکید فرمائی تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے کہ کسی قوم کو دعوت دیتے وقت شریعت کے تمام احکامات کا بوجھ ایک ہی دفعہ میں ان کی گردن پر نہ ڈال دیا جائے بلکہ یہ باتیں رفتہ رفتہ ان کے سامنے لائی جائیں مثلاً پہلے توحید اور رسالت کو پیش کیا جائے اس کے بعد عبادات کی تعلیم دی جائے عبادات میں بھی اہم عبادات کو اولیت دی جائے اور سب سے پہلے نماز زکوٰۃ اور دوسرے اہم فرائض بتائے جائیں تدریس کے ایسے ہی زریں اصولوں پر مبنی ایک لائحہ عمل آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود ہی ترتیب دیا تھا۔ حضرت معاذ بن جبل کو تعلیم و تدریس کے لیے یمن بھیجتے وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو حکمت عملی وضع کی تھی وہ بلا شبہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے تجویز کردہ طریقہ ہائے تدریس میں سب سے نمایاں ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان تمام باتوں کو جن کی تعلیم دینی مقصود تھی (جسے ہم موجودہ اصطلاح میں نصاب یا مقررہ معلومات کہہ سکتے ہیں) مختلف اجزا میں تقسیم کیا تھا اور نصیحت کی تھی کہ تمام باتیں ایک ساتھ نہ بتائی جائیں۔ بلکہ رفتہ رفتہ بتائی جائیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا کہ جب وہ ایک بات سمجھ لیں تو دوسری بتانا شروع کریں۔ جب اسے مان لیں تو تیسری اس طرح ایک ایک کر کے انہیں سب کچھ بتا دیا جائے[1] (مقصد یہی تھا کہ لوگوں کو مشکل میں نہ ڈالا جائے اور نہ ہی تمام باتوں کو ایک ساتھ پیش کر کے انہیں پیچیدہ بنا لیا جائے تاکہ سیکھنے میں دقت نہ ہو)۔ اس طرح مرحلہ وار معلومات کی منتقلی کا ایک سبب تو یہ ہے کہ متعلمین پر زیادہ بوجھ نہ ڈالا جائے انہیں پہلے آسان اور چھوٹی چھوٹی باتیں سمجھائی جائیں جب وہ انہیں سمجھ لیں تو ان کی اُس معلومات سے استفادہ کرتے ہوئے انہیں مزید بتایا جائے تعلیم و تدریس کے بیشتر مقولے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے انہی تدریسی اصولوں سے ثابت ہوتے ہیں۔ مرحلہ وار منتقلی کا یہ طریقہ کار قرآن میں بھی پسندیدہ قرار دیا گیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے نزول قرآن میں بھی یہی طریقہ اختیار کیا۔ (القرآن)

وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِيْلًا (۳، ۴-۴) المزمل پ ۲۹

اور قرآن کو خوب ٹھہر ٹھہر کر پڑھو (ترجمہ)

---

[1] سید سلیمان ندوی، سیرۃ النبی ﷺ، جلد چہارم، قرآن لمیٹڈ، لاہور ۱۳۹۵ھ صفحہ ۳۲۹

یہی اصول اور طریقہ کار تدریس کا رہنما اصول قرار دیا گیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی انداز پر لوگوں کو تعلیم دی۔ صحابہ کرام نے بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات پر عمل کرتے ہوئے تدریس کے انہی اصولوں اور طریقوں کو اپنایا اور اس طرح مؤثر انداز پر لوگوں کو تعلیم دی۔

ایک وقت میں ایک مضمون

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور کے تعلیمی نظام سے ایک اور منفرد بات ثابت ہوتی ہے اور وہ یہ کہ کئی مضامین کی تدریس بیک وقت شروع نہ کی جائے بلکہ انہیں الگ الگ وقت پر پڑھایا جائے۔ ایک ہی وقت میں ایک ہی مضمون کی تدریس کا یہ طریقہ اب تو عام ہے بلکہ اس حد تک فروغ پاگیا ہے کہ صدیوں سے مختلف مضامین کے لیے مختلف اساتذہ اور شعبے قائم جانے لگے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور کے بہت سے اساتذہ جو بیک وقت کئی مضامین میں مہارت رکھتے تھے اور ان سب مضامین کی تعلیم دیتے تھے انہوں نے بھی مختلف مضامین کی تدریس کے لیے الگ الگ وقت مقرر کیا تھا تاکہ مختلف مضامین کی معلومات کو سمجھاتے وقت انہیں الگ الگ سمجھایا جا سکے۔ ایک مشہور معلم حضرت عبداللہ بن عباسؓ اسی طریقے پر درس دیتے تھے۔ انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں کافی وقت گزارا تھا اور کئی علوم میں مہارت حاصل کر لی تھی ابو صالح تابعی کے بقول ان کا تدریسی معاملہ کچھ اس طرح تھا کہ انہیں کئی مضامین پڑھانے اور سمجھانے پڑتے تھے۔ ان کے مکان کے سامنے علم حاصل کرنے والوں کا اس درجہ اژدھام ہو جاتا تھا کہ مکان میں داخل ہونے اور وہاں سے نکلنے کے لیے جگہ نہیں ملتی تھی۔ انہیں جب لوگوں کے آنے کی اطلاع دی جاتی تو وہ باوضو ہو کر بیٹھ جاتے اور فرماتے کہ پہلے قرآن کے شعبے سے متعلق جو سائل ہوں انہیں اطلاع دو وہ لوگ آتے اور سمجھ کر چلے جاتے تو فرماتے کہ حرام و حلال اور فقہ کے سائلوں کو بلاؤ وہ بھی چلے جاتے تو فرائض سیکھنے والوں کو بلواتے ان کے جانے کے بعد عربی زبان، شعر و شاعری، ادب اور انشا کے سائلوں کی باری آتی تھی۔ آپ کا درس مستقل حلقوں کی صورت میں ہوتا تھا اور درس کے علاوہ آپ کبھی کبھی نماز کے بعد تقریر اور خطبے کے ذریعہ بھی لوگوں کو تعلیم دیا کرتے تھے۔[۵]

---

[۵] حاجی معین الدین ندوی: مہاجرینؓ (حصہ اول) دار المصنفین اعظم گڑھ طبع ثانی سنہ ۱۹۵۱ صفحات ۲۳۱ — ۲۴۰۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقہ تعلیم سے نہ صرف ایک وقت میں ایک ہی مضمون کی تدریس ثابت ہوتی ہے بلکہ تدریسی نصاب میں مختلف مضامین کی اہمیت اور حیثیت کا تعین بھی ہوتا ہے اس سے موجودہ دور کے تعلیمی اداروں میں نصابی سرگرمیوں اور ٹائم ٹیبل بنانے میں بھی رہنمائی حاصل ہوتی ہے۔ ایک وقت میں ایک ہی مضمون کی تدریس سے معلم یکسوئی سے ایک ہی موضوع پر اظہار خیال کرتے تھے اور اس طرح طالب علموں کے ذہن بھی ایک ہی جانب مبذول رہتے تھے۔ اس طرح تدریس میں ترتیب اور سلیقہ پایا جاتا تھا جس کی وجہ سے سمجھنا اور آسان ہو جاتا تھا۔

گروہی تدریس اور کلاس

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دور کے تعلیمی نظام کا جائزہ لیا جائے تو تدریس کے مختلف طریقوں میں سب سے زیادہ شواہد گروہی تدریس Group teaching کے ملتے ہیں۔ مختلف صحابہ کرام سے پڑھنے کے لیے مختلف گروہ قائم کر لیے گئے تھے جہاں وہ باقاعدگی سے درس دیا کرتے تھے۔ اس طرح کے گروہوں کے معاشرتی فوائد بھی ہوتے تھے اور طالب علموں کو درس و تدریس کے علاوہ دوسرے اہم موضوعات پر بھی باہم تبادلہ خیال کے مواقع مل جاتے تھے۔ یہ طریقہ دنیا کے بیشتر ممالک میں آج بھی رائج ہے اور انفرادی تدریس Individual teaching کے مقابلے میں زیادہ مقبول اور کارآمد سمجھا جاتا ہے اصحاب صفہ خود ایک ایسا گروہ (حلقہ) تھا جس میں تدریس کا آغاز حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا تھا۔ یہ روایت بعد میں بھی قائم رہی اور مسلمانوں نے جہاں کہیں بھی تعلیم و تدریس کا سلسلہ شروع کیا حلقے کو اہمیت حاصل ہوتی گئی۔

مسلمانوں کے نظام تعلیم میں حلقہ یا گروہ کی اصطلاح سے کلاس میں نشستوں کی ترتیب کا واضح طور پر اندازہ بھی ہو جاتا ہے۔ لیکن اس کا سب سے زیادہ واضح ثبوت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ سے ملتا ہے۔ ایک بار آپ صلی اللہ علیہ وسلم مدینے کی ایک مسجد میں تشریف لے گئے جو بطور درسگاہ استعمال ہوتی تھی۔ اس درسگاہ میں اس وقت ایک قاری قرأت کر رہے اور لوگ سن رہے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھ کر قاری خاموش ہو گئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم بیٹھے اور اشارہ فرمایا کہ لوگ دائرے کی شکل میں

بیٹھیں ۔ لوگ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق حلقہ بنا کر بیٹھ گئے[1]۔ تعلیمی اداروں میں کلاس کی موجودہ ترتیب اور حلقے یا دائرے کی ترتیب میں جو فرق ہے اس کا تعلیمی نقطہ نظر سے جائزہ لیا جائے تو کئی نئی باتیں سامنے آتی ہیں ۔ ان باتوں سے جو انتہائی باریکی اور مہارت کی علامت ہیں درس و تدریس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی قابلیت اور دور بینی کا اندازہ ہوتا ہے

کلاس دراصل اجتماعی یا گروہی تدریس کی ایک صورت ہے اور موجودہ دور میں بھی اس لیے رائج ہے کہ اس سے کم وقت اور کم اخراجات کے ذریعہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کو پڑھایا جا سکتا ہے اس کی ایک اور افادیت یہ بھی ہے کہ اس میں شامل طلبا کے مابین اجتماعی حیثیت میں کام کرنے اور ان کے گروہی مزاج کی تسکین کو بھی فروغ ملتا ہے اکثر ایسا ہوتا ہے کہ بہت سے طالب علموں کی اعلیٰ کارکردگی کلاس میں موجود دوسرے طالب علموں کے لیے ترغیب کا باعث بنتی ہے اور ان میں مسابقت کا رجحان پیدا ہوتا ہے ۔ کلاس میں تدریس اساتذہ اور طلبا کا مشترکہ عمل ہوتی ہے جس میں دونوں کے مابین براہ راست تعلق اور رابطہ Face to face relation قائم ہوتا ہے اور اس طرح ذہنی اور معاشرتی تربیت کا عمل مکمل ہوتا ہے ۔ موجودہ صورت میں ترتیب دی جانے والی کلاسوں میں درس کے دوران اساتذہ اور طلبہ کے مابین یہ تعلق تو قائم رہتا ہے لیکن تعلیمی اعتبار سے دوران درس طلبا کے درمیان بھی ایسا ہی تعلق جو ہونا چاہیے وہ قائم نہیں ہوتا ۔ طالب علم کلاس میں ایک دوسرے کے پیچھے مختلف نشستوں پر بیٹھتے ہیں اس طرح کچھ طالب علم اساتذہ کی نظروں سے پوشیدہ بھی رہ سکتے ہیں ۔ اگر ایسا نہ ہو تب بھی وہ کلاس میں دوران تدریس ایک دوسرے کے چہرے اور اس کے تاثرات کو نہ دیکھ سکتے ہیں اور نہ محسوس کر سکتے ہیں ۔ ایسی کلاسوں میں نظم و ضبط کے مسائل بھی پیدا ہوتے ہیں اس انداز سے کلاسوں کی ترتیب کے بجائے حلقے (دائرے) میں کلاس ترتیب دی جائے تو اساتذہ اور طلبہ اور طلبہ کے دوسرے ساتھی طلبہ سے براہ راست تعلق کو مزید تقویت ملتی ہے ۔ درس کے دوران اساتذہ انفرادی طور پر ایک ایک طالب علم کو اور ہر طالب علم اپنے ایک ایک ساتھی کو دیکھ سکتا ہے اور مختلف موضوعات پر بحث اور سوال و جواب کے دوران وہ ایک دوسرے کے چہرے کے تاثرات اور کیفیات

---

[1] مولانا سعید انصاری : سیر الصحابہ ، حصہ اول و دوم ، دار المصنفین اعظم گڑھ ، طبع دوم ۱۹۴۰ء صفحہ ۲۱۱

سے بھی باخبر رہ سکتے ہیں، ایسی کلاس میں موجود ہر فرد ایک دوسرے کے سامنے ہوتا ہے اور کسی کی طرف کسی کی پشت نہیں ہوتی ہے۔ دائرہ کی شکل میں ترتیب دی جانے والی کلاسوں میں شرارتیں اور بدنظمی کے واقعات بھی کم ہوتے ہیں اس لیے کہ طلبا کی تعداد کی خود بخود ایک حد متعین ہو جاتی ہے اور وہ سب براہ راست معلم کے سامنے ہوتے ہیں، تعلیمی نقطہ نظر سے دائرے یا حلقے کے انداز سے ترتیب دی جانے والی کلاس یقیناً عام کلاسوں سے زیادہ موثر ثابت ہوتی ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی انداز سے حلقے میں درس و تدریس کی ہدایات دی تھیں۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں اجتماعی اور گروہی تدریس کے لاتعداد شواہد موجود ہیں جبکہ کہیں کہیں انفرادی تدریس کی مثالیں بھی ملتی ہیں۔ اندازہ ہوتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انفرادی تدریس کی مکمل طور پر نفی نہیں کی تھی بلکہ ضرورت پڑنے پر اس انداز سے کام لینے کی اجازت بھی دی تھی۔ کئی اساتذہ جن کے مستقل حلقہ درس موجود تھے وہ اشاعت علم کے مقصد کے پیش نظر انفرادی طور پر بعض لوگوں کو پڑھایا کرتے تھے۔[۵]

کلاس میں طالب علموں کی تعداد

عہد رسالت میں کلاس (دائرے یا حلقے) کا تصور تو بہت واضح ہے لیکن اس امر کے حتمی شواہد نہیں ملتے کہ اس دائرے میں طلبا کی تعداد کتنی ہونی چاہیے۔ غالباً اس کا ایک سبب یہ ہو سکتا ہے کہ مسلمانوں کے مختلف تعلیمی اداروں (بشمول مسجد نبوی) میں ہر وقت لوگ حصول علم کے لیے جمع رہتے تھے۔ ان کے آنے اور جانے کا سلسلہ لگا رہتا تھا اور ابتدائی دور میں ان سب کی تعلیم کے لیے کوئی حد مقرر کرنا مناسب نہیں سمجھا گیا ہوگا۔ معلمین نے بھی اس سلسلہ میں کبھی پابندی عائد نہیں کی اور نہ ہی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کلاس کو محدود کرنے کی نشاندہی کی۔ بعض تاریخی حوالوں سے اس بات کی تصدیق ضرور ہوتی ہے کہ مسجد نبوی (صفہ) میں ایک ہی وقت میں ستر سے زیادہ افراد نے تعلیم حاصل نہیں کی گویا وہاں کی کلاس میں طلبا کی زیادہ سے زیادہ تعداد Maximum No: of students ستر تک پہنچتی ہے۔ انہی

---

[۵] ایضاً صفحہ ۱۳۰

حوالوں کے مطابق یہ تعداد بھی صرف ایک ہی بار اس حد تک پہنچی تھی اور وہ بھی اس وقت جب بنو تمیم کے افراد وہاں آئے تھے اور وہاں انہوں نے قرآن سیکھا اور دینی تعلیم حاصل کی [1] اس ایک واقعے کے علاوہ متعلمین کی زیادہ سے زیادہ تعداد کے بارے میں دوسرا کوئی حوالہ نہیں ملتا بعض لوگ اندازے سے زیادہ سے زیادہ تعداد سو تک لے جاتے ہیں لیکن مصدقہ روایات سے یہی ثبوت ملتا ہے کہ طالب علموں کی تعداد ستر یا اس سے کم ہوا کرتی تھی۔ اس سلسلے میں اگر عہد نبوی کے حوالے سے کلاس میں طلبا کی زیادہ سے زیادہ حد مقرر کر لی جائے تب بھی اس بات کا خیال رکھنا ضروری ہو جاتا ہے کہ ان سب کے لیے نشستوں اور ان کی ترتیب میں براہ راست تعلق Face to face contact کی گنجائش موجود ہو۔

سبق کو دلچسپ بنانے کیلئے مثالیں دینا

متعلمین کو سمجھانے کے لیے سبق کی وضاحت اور تشریح کے لیے مثالیں دینا ایک مؤثر طریقہ ہے۔ اس طرح سبق کو زیادہ آسان اور دلچسپ بنایا جا سکتا ہے۔ مثالوں کے ذریعے متعلمین میں دوسروں سے اخذ کرنے اور اس طرح تقابلی جائزہ لینے سے اپنا اندازہ کرنے کا شعور بھی نمایاں ہوتا ہے۔ مثالیں سادہ اور عام فہم ہوں اور ایسے افراد اور واقعات سے متعلق ہوں جن میں طالب علم دلچسپی لیتے ہیں۔ مثالیں دینے کے اس طریقے کی تائید قرآن پاک سے بھی ہوتی ہے جس میں بے شمار مثالیں اس غرض سے دی گئی ہیں کہ لوگوں کے لیے سمجھنے میں آسانیاں پیدا ہوں (القرآن)، وَتِلْكَ الْأَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ ۖ وَمَا يَعْقِلُهَا إِلَّا الْعَالِمُونَ ۝ العنکبوت ۲۹ - ۴۳ (پ - ۲۰)

اور یہ مثالیں ہیں ہم بیان کرتے ہیں انہیں لوگوں (کو سمجھانے) کے لیے اور نہیں سمجھتے انہیں مگر اہل علم۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی مثالوں کے اس انداز پر عمل کیا آپ کے لیکچرس میں یہی خوبی نمایاں رہی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم مثالیں اپنے گرد و پیش سے ہی لیا کرتے تھے تاکہ لوگوں کو زیادہ سے زیادہ متوجہ کر سکیں۔ مثلاً جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلانیہ تبلیغ کا سلسلہ شروع کیا تو انہیں پہاڑ کے عقب سے کسی لشکر کے آنے کی مثال دی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مختلف خطبات میں ایسی ہی مثالیں کثرت سے ملتی ہیں جنہیں لیکچر کو مؤثر بنانے کے لیے بیان کیا جاتا تھا۔

---

[1] حبیب الرحمن ترود۔ علمائے سلف و نابینا علما تعلیقات و حواشی منتم، نعمت اللہ شہابی: اکیڈمی آف ایجوکیشنل

عملی طریقہ

آموزش بذریعہ عمل Learning by doing ایک اہم تعلیمی طریقہ ہے جس میں عمل کے ذریعہ تدریس پر زور دیا جاتا ہے۔ تدریس میں عمل کرکے دکھانے Demonstration کو بھی اتنی ہی اہمیت حاصل رہی ہے تعلیمی اصطلاح میں اسے مظاہراتی طریقہ تدریس کا نام دیا جاتا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری زندگی اسی انداز پر گزری کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو اپنی عملی زندگی سے متاثر کیا۔ تدریس میں بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں یہ طریقہ رائج تھا۔ قرا جو کچھ پڑھتے اسے حلق اور زبان کی حرکتوں سے دوسروں پر ظاہر کرتے خوشنویس جو کچھ لکھنا سکھاتے پہلے خود اس کا مظاہرہ کرتے، غرض مختلف نوعیت کی معلومات اور مہارتوں کی تدریس کو بذریعہ مظاہرہ سمجھایا جاتا تھا۔ اس طرح دوسروں کو سمجھنے اور اس کے مطابق عمل کرنے میں بہت سہولت ہوتی تھی اس سلسلے میں ابوالاسود نے عربی زبان کے قواعد مرتب کرتے وقت بہت زیادہ انحصار اسی طریقے پر کیا۔ انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے کچھ دنوں بعد ہی یہ قواعد مرتب کرنا شروع کیے تھے ان کا طریقہ بہت ہی دلچسپ تھا اور آج بھی صرف بیان کیا جائے تو پوری کیفیت نگاہوں کے سامنے آجاتی ہے اور سننے والا اس پر حرف بہ حرف عمل کر سکتا ہے۔ انہوں نے الفاظ کی ترتیب کے وقت کاتب کو یہ ہدایت کی کہ تم میرے لبوں کی حرکت کو دیکھا کرو میں جب کوئی لفظ بولوں تو اس کی طرز ادا کا خیال رکھو جس حرف کے ادا کرنے سے منہ کھلا رہے اس پر ایک نقطہ لگا دو جس حرف میں دونوں لب کناروں سے ملے ہوئے ایک حلقے کی صورت میں نظر آئیں۔ تو حرف کے دائیں جانب نقطہ دے دو اور اگر میرا منہ لٹکا ہوا ہو اور نیچے کا لب ٹھوڑی کی طرف جھکا ہوا ہو تو اس حرف کے نیچے نقطہ لگا دو پھر آپ بولتے گئے اور کاتب ویسے ہی عمل کرتا گیا۔[1]

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بھی لوگوں کو سکھایا تو عمل کرنے کے بعد بتایا۔

---

[1] عبدالرزاق کانپوری: علم مکتب یا الجب کی تاریخ: مطبوعہ سو جوبلی نمبر ماہنامہ زمانہ کانپور بھارت [illegible]

اسلام کی بیشتر عبادات میں بھی یہی خصوصیت کارفرما ہے کہ وہ مظاہرہ اور عمل Demonstration کے ذریعے سکھائی جا سکتی ہیں۔ عربی زبان کے مختلف الفاظ اور ان کی ادائیگی کے لیے یہی طریقہ اختیار کیا گیا۔

ذریعہ تعلیم

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیشہ اس بات کی تاکید فرمائی کہ لوگوں کو انہی کی زبان میں تعلیم دی جائے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ تاکید تدریس کے بنیادی اصولوں کے عین مطابق ہے کیونکہ آپ جسے سکھا رہے ہیں اس سے اس کی زبان اور استعداد کے مطابق گفتگو نہیں کریں گے تو انتہائی کوشش کے باوجود اسے نہیں سمجھا سکتے۔ اللہ تعالیٰ نے مختلف انبیاء کرام کو دنیا میں اسی مقصد کے لیے مختلف علاقوں میں مبعوث کیا تھا کہ وہ انہی کی زبان اور مزاج کے مطابق تعلیم دے سکیں[1] لوگوں کو تعلیم دینے کے لیے انبیاء کرام کے لیے جو طریقہ مقرر کیا گیا تھا اس کی وضاحت حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی فرمائی تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد تھا کہ (حدیث)

انا امرنا معشر الانبیاء بان نکلم الناس علی مقادیر عقولهم

ہم نبیوں کی جماعت کو حکم دیا گیا ہے کہ ہم لوگوں سے بقدر ان کی فہم و دانش کے گفتگو کریں۔

انبیاء کرام کی جماعت کا تصور کیا جائے تو واضح ہو جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے عوام الناس کی تربیت کے لیے جتنے معلمین مبعوث کیے تھے انہیں یہ حکم دیا تھا کہ وہ اپنے حلقے کے لوگوں کی صلاحیتوں اور عقل کے مطابق بات کریں تمام ہی انبیاء کرام نے اس ہدایت پر عمل کیا اور لوگوں کو انہی کی زبان میں Language تعلیم دی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تو زبان کے معاملے میں اس درجہ محتاط تھے کہ عرب کے جس قبیلے سے گفتگو کرتے اسی قبیلے کی زبان کے مخصوص لب و لہجے میں گفتگو کرتے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ماہرانہ کلام کو سن کر بہت سے وفود تو یہ اعتراف کرتے تھے کہ ان کی زبان میں فصاحت و بلاغت کے اعتبار

---

[1] علامہ شمس بریلوی: سرورِ کونین کی فصاحت، مدینہ پبلشنگ کمپنی کراچی ...

سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا مقام ان سے زیادہ ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس عمل میں کوئی سیاست کارفرما نہیں تھی بلکہ تدریس کو مؤثر بنانے کا یہ سادہ سا اصول تھا کہ لوگوں کو ان کی زبان میں ان کی صلاحیت کے مطابق باتیں بتائی جائیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تقلید میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بیشتر صحابہ کرام نے بھی یہی طریقہ اختیار کیا۔ وہ سب بڑی مہارت اور روانی سے مختلف لوگوں سے انہی کی زبان میں گفتگو کرتے تھے۔ انتہا تو یہ تھی کہ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ جو کئی زبانوں کے ماہر تھے اپنے غلاموں سے گفتگو کرتے وقت اس بات کا لحاظ رکھتے تھے کہ اس کی کون سی زبان ہے (ان کے پاس مختلف زبانیں بولنے والے غلام تھے اور آپ ان سے بھی انہی کی زبان میں گفتگو کرتے تھے)۔[۱]

عام لوگوں سے انہی کی زبان میں گفتگو کرنے کی وجہ سے اسلام کی تبلیغ کا کام بہت جلد مکمل ہو گیا۔ یہی وہ سبب تھا جس کے لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام کو مختلف زبانیں سیکھنے کا مشورہ دیا تھا۔ بعد میں درسگاہوں میں بھی ایسا ہی کیا گیا اور اس طرح لوگوں کے لیے درس و تدریس کو زیادہ سے زیادہ سہل بنا دیا گیا۔ موجودہ دور کے ماہرین اب اس امر پر متفق ہو رہے ہیں کہ سب سے زیادہ موثر ذریعہ تدریس Medium of Instruction طالب علم کی اپنی مادری زبان کے علاوہ کوئی اور زبان نہیں ہو سکتی۔ اس بنیادی اصول کی تائید حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نظام تعلیم و تربیت سے بھی حاصل ہوتی ہے۔

سبق کی مختلف اجزا میں تقسیم

حضور اکرم ہمیشہ بات کو طول دینے سے گریز فرماتے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے شہرۂ آفاق لیکچرس میں بھی یہی خصوصیت موجود تھی اسی لیے تمام لیکچرس جامع اور مختصر ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کے مطالعے سے یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ ایسی باتیں جو بہت دقیق ہوں یا جنہیں متعلم پہلی بار سن رہے ہوں انہیں ایک ہی نشست میں مکمل نہ کیا جائے بلکہ اسے مختلف اجزا اور مختلف نشستوں میں طالب علموں کو سمجھایا جائے۔ حضرت ام سلمہؓ سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم قرات کے دوران ایک ایک آیت الگ۔ الگ

---

[۱] محمد طفیل: نقوش رسول نمبر، جلد چہارم۔ ادارہ فروغ اردو، لاہور، ۱۹۸۳ء، ص ۱۳۵

پڑھتے تھے یہ بتا کر آپ نے خود بھی ویسے ہی پڑھ کر بتلایا۔[1] آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس انداز سے یہ بات سمجھ میں آجاتی ہے کہ سبق کو مختلف اجزا میں تقسیم کرنے اور پھر ان اجزا کو الگ الگ متعلمین تک منتقل کرنے میں اس بات کا احتمال نہیں رہتا کہ وہ اسے سمجھنے سے قاصر رہیں گے۔ سبق بہت طویل ہوں یا موضوعات زیادہ وسیع ہوں تو ثانوی اور اعلیٰ ثانوی تک یہی طریقہ اختیار کیا جانا چاہیے۔ سبق یا موضوع کو افادیت کے اعتبار سے الگ الگ کر لینے کی تصدیق حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل اور قرآن پاک کے ارشادات سے بھی ہوتی ہے۔ (القرآن)

وَقُرْاٰنًا فَرَقْنٰهُ لِتَقْرَاَهٗ عَلَى النَّاسِ عَلٰى مُكْثٍ وَّنَزَّلْنٰهُ تَنْزِيْلًا ۝ قُلْ اٰمِنُوْا بِهٖٓ اَوْ لَا تُؤْمِنُوْا اِنَّ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ مِنْ قَبْلِهٖٓ اِذَا يُتْلٰى عَلَيْهِمْ يَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ سُجَّدًا ۝ وَّيَقُوْلُوْنَ سُبْحٰنَ رَبِّنَآ اِنْ كَانَ وَعْدُ رَبِّنَا لَمَفْعُوْلًا ۝ (۱۷-۱۰۶)

اور قرآن کریم کو ہم نے جدا جدا کر کے نازل کیا تاکہ آپ لوگوں کے سامنے اسے ٹھہر ٹھہر کر پڑھیں اور ہم نے اسے تھوڑا تھوڑا کر کے اتارا ہے۔ آپ (کفار کو) کہیے خواہ تم ایمان لاؤ اس پر یا نہ ایمان لاؤ۔ بے شک وہ لوگ جنھیں دیا گیا ہے علم اس سے پہلے جب اسے پڑھا جاتا ہے ان کے سامنے تو وہ گر پڑتے ہیں ٹھوڑیوں کے بل سجدہ کرتے ہوئے اور کہتے ہیں (ہر عیب اور نقص سے) پاک ہے ہمارا رب بلاشبہ ہمارے رب کا وعدہ پورا ہو کر رہتا ہے۔

قرآن کریم کی یہ بھی خصوصیت ہے کہ اسے جدا جدا حصوں میں نازل کیا گیا۔ اور ٹھہر ٹھہر کر پڑھنے کی ہدایت کی گئی اس ہدایت میں بڑی تعلیمی مصلحت کار فرما تھی۔ اس سے رہنمائی حاصل کرتے ہوئے سبق کی تدریس کے لیے اسے مختلف اجزا میں تقسیم کرنا زیادہ کارآمد اور موثر ثابت ہوتا ہے۔

چھٹی کا تصور

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں متعلمین کے لیے کسی مخصوص دن چھٹی کی بظاہر کوئی شہادت نہیں ملتی۔ البتہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مرتب کردہ کچھ اصولوں کی روشنی میں چھٹی کا تصور ضرور سامنے آتا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو تدریسی اصول وضع فرمائے تھے ان کے مطابق متعلمین پر زیادہ بوجھ ڈالنے کی اجازت نہیں تھی۔ کیونکہ اس سے ان کے اکتا جانے

---

[1] مولانا سعید انصاری۔ سیر الصحابیات ؓ، معارف اعظم گڑھ۔ طبع چہارم ۱۹۵۲ء، صفحہ ۵۱

کا خدشہ تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سبق کو آسان اور دلچسپ بنانے کی ہدایت بھی اسی لیے دی کہ متعلمین کو زیادہ ذہنی مشقت سے دوچار نہ کیا جائے۔ بعض حوالوں سے تدریس میں تعطل (وقفے) یا چھٹی کا ثبوت ملتا ہے تب بھی کسی ایک دن کو چھٹی کا دن Holiday نہیں کہا جا سکتا۔ تدریس میں وقفے کی تصدیق بہرحال ہو جاتی ہے مثلاً حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مدینے آمد کے موقع پر کئی مہاجرین ایسے بھی تھے جنہیں رہنے کے لیے مکہ کے مضافات میں جگہ ملی۔ ان صحابہ کرام میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ بھی شامل تھے۔ اس دوران بہت سے صحابہ کرام سیکھنے کی غرض سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوا کرتے تھے۔ وہ لوگ جو شہر سے دور تھے ان کے لیے روز جانا مشکل تھا اس لیے انہوں نے یہ سہولت طے کی کہ ایک دن چھوڑ کر جایا کریں۔ خود حضرت عمر رضی نے اس سلسلے میں اپنے ایک پڑوسی سے معاملہ طے کر لیا تھا۔ جس دن پڑوسی کی باری ہوتی وہ جاتے اور جو کچھ سیکھ کر آتے حضرت عمر رضی کو بتا دیا کرتے تھے۔ دوسرے دن جب حضرت عمر رضی جاتے واپس آکر اسی طرح اپنے پڑوسی کو بتا دیا کرتے تھے۔[1] اس حوالے سے تدریس میں وقفہ یا چھٹی کی تصدیق تو ہوتی ہے لیکن واضح طور پر کسی ایک کا تعین نہیں ہوتا چھٹی کی تائید دوسرے حوالوں سے بھی ہوتی ہے حضرت شقیق رضی کی ایک روایت کے مطابق حضرت عبداللہ بن مسعود رضی ہر جمعرات کو وعظ فرماتے تھے۔ آپ سے کسی نے درخواست کی کہ ہمیں روز تعلیم دیا کریں۔ آپ (عبداللہ بن مسعود رضی) نے جواب میں فرمایا کہ میں تمہیں تھکانا نہیں چاہتا اور تمہارا ایسے ہی خیال رکھتا ہوں جیسے رسول صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے۔[2] چھٹی کے دن کے برعکس کام (تدریس) کے آغاز کی شہادتیں ضرور ملتی ہیں۔ ان میں سے ایک کا تذکرہ کافی عرصہ بعد شیخ برہان الدین (صاحب ہدایہ) سے ملتا ہے۔ وہ بدھ کو کتاب شروع کرتے تھے اور حدیث بیان کرتے تھے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ بدھ کے دن جو کام شروع کیا جائے وہ پورا ہو کر رہے گا۔ امام ابوحنیفہ بھی ایسا ہی کرتے تھے۔ شیخ ابو یوسف ہمدانی بھی ایسا کرتے تھے۔ اس لیے کہ حق تعالیٰ نے اسی دن نور تخلیق کیا تھا۔[3]

---

[1] مولانا رشید احمد ارشد: اسلام کا تعلیمی نظام: مطبوعہ البلاغ منی ۱۹۸۳ء صفحہ ۱۰۹

[2] مشکوٰۃ شریف مترجم جلد اول کتاب العلم صفحہ ۵۰

[3] برہان الدین زرنوجی: الرشیق الفہیمہ بطریق التعلیم، مترجم محمد معین الدین تعلیم متعلم طریق التعلیم

مندرجہ بالا حوالے اس امر کی تصدیق کے لیے کافی ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں تعلیم و تدریس کے عمل میں وقفہ رکھا جاتا تھا۔ یہ عمل دراصل طالب علموں کے تقاضوں کے عین مطابق تھا اس لیے کہ مسلسل کام سے تھکن اور اکتاہٹ کے امکانات بڑھ جاتے ہیں اور ذہنی تربیت کا عمل کمزور پڑ جاتا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام نے بھی اس اصول کی اہمیت کو محسوس کیا تھا اسی لیے بلا وقفہ (مسلسل) تعلیم دینے سے اجتناب برتا تھا۔ ان تمام حقائق کی روشنی میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں چھٹی سے اختلاف نہیں ملتا اور یہ تعلیمی اداروں کے منتظمین کے اختیار میں ہے کہ وہ کوئی سا دن یا وقت چھٹی کے لیے مخصوص کر سکتے ہیں۔

مباحثہ اور مذاکرہ

تدریس کے حوالے سے رسول اللہ کے تجویز کردہ تعلیمی نظام میں دو باتیں بہت واضح طور پر سامنے آتی ہیں۔ ایک مرافقہ ہے اور دوسرے مباحثہ۔ مرافقہ سے مراد کئی متعلمین کا ایک ساتھ (ایک دوسرے کی رفاقت میں) پڑھنا ہے جسے کلاس روم یا اجتماعی اور گروہی تدریس کا نام دیا جاتا ہے جبکہ مباحثہ کا مطلب مذاکرے یا گفتگو کے ذریعے طالب علموں کو اپنے درس میں شریک کرنا ہے کئی طالب علموں کا ایک ساتھ پڑھنا تو معاشرتی اعتبار سے بھی اچھا عمل قرار دیا جا سکتا ہے لیکن مباحثہ یا مذاکرے سے بعض ذہنوں میں کچھ غلط فہمیاں پیدا ہو سکتی ہیں اس لیے اس امر کی وضاحت ضروری ہے دراصل دوران تدریس کسی سبق یا موضوع کے بارے میں طالب علم اپنے اساتذہ یا اپنے ساتھی طالب علموں کے خیالات کو سمجھنے کے لیے استفسارات کرتے ہیں وہ دوسروں کے خیالات کے حوالے سے جب اپنا نقطہ نظر یا خیال بیان کرتے ہیں تو اس طرح زیر تدریس موضوع کی تکرار ہوتی ہے اور بیشتر نکات واضح ہو جاتے ہیں تعلیمی اعتبار سے اس عمل کو طالب علموں کی گستاخی یا بداخلاقی نہیں سمجھا جاتا بلکہ ان کے اس عمل کو سبق میں ان کی فعال شرکت Active participation سمجھا جاتا ہے۔ اس طرح طالب علم دوران تدریس متحرک اور فعال رہتے ہیں طالب علم غیر فعال Inactive رہیں تو تدریس بے معنی ہو کر رہ جاتی ہے۔ یہ فعال شرکت مباحثہ یا مذاکرے کے نتیجے میں پیدا ہوتی ہے

اس لیے مرافقہ اور مباحثہ دونوں ہی تدریس کی کامیابی کے لیے ضروری اور ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم سمجھے جاتے ہیں۔

مرافقہ (رفاقت Companionship) کے بارے میں تو گروہی تدریس اور کلاس کے عنوان کے تحت بحث کی جا چکی ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مباحثہ اور مذاکرے کی بھی تاکید فرمائی تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں اس کی کئی مثالیں ملتی ہیں۔ اس دور کے ممتاز ماہر تعلیم حضرت معاذ بن جبلؓ کا قول تھا کہ تم علم کو طلب کرو اس لیے کہ رضائے الٰہی کی خاطر اسے پڑھنا خشیت ہے اس کا باہم مل کر حاصل کرنا عبادت ہے اس کا مذاکرہ تسبیح کے قائم مقام اور اس کا علمی مباحثہ کرنا جہاد ہے۔ آپ کے اس قول سے کلاس اور مذاکرے دونوں کی تعلیمی اہمیت واضح ہوتی ہے۔ عہد نبوی کے ایک اور معلم حضرت علقمہ کا قول ہے کہ حدیث کا مذاکرہ کرو کیونکہ مذاکرے سے علم جوش مارتا ہے (علم میں اضافہ ہوتا ہے)[1] مباحثہ یا مذاکرے کا مقصد بلا مقصد گفتگو کو الجھانا یا بات کو طول دینا نہیں بلکہ دوسروں کو یہ موقع فراہم کرنا ہے کہ وہ موضوع کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کریں اور دوسروں کے خیالات سے استفادہ کریں اس طرح موضوع کے وضاحت طلب نکات کی تشریح ہوتی جاتی ہے اور متعلم اور معلم دونوں ہی تدریس میں فعال کردار Active role ادا کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں سب سے نمایاں مثال حضرت معاذ بن جبلؓ کی ہے۔ انہوں نے عہد نبوی میں طویل عرصہ درس و تدریس میں صرف کیا اور حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے دور میں بھی یہی سلسلہ جاری رہا بعد میں آپ نے فلسطین میں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی آپ کے مستقل حلقہ درس قائم تھے جن میں سے ایک دمشق میں اور دوسرا حمص میں بھی تھا۔ آپ وہاں درس دینے کے لیے خود بھی جایا کرتے تھے۔ آپ کا طریقہ تدریس مباحثے اور مذاکرے کی سب سے واضح مثال تھا۔ آپ کی موجودگی میں صحابہ کسی مسئلے پر مذاکرہ شروع کرتے تھے اور آپ خاموشی سے سنتے رہتے تھے اگر مذاکرہ کے ذریعے صحابہ خود کسی نتیجے پر نہ پہنچتے تو آپ مداخلت کرتے اور مسئلہ کو علم کی روشنی میں طے کرتے۔[2]

---

[1] عبدالبر اندلسی: جامع بیان العلم و فضلہ (مترجم عبدالرزاق ملیح آبادی)۔ العلم والعلماء ادارہ اسلامیات لاہور پہلی بار ۱۹۷۷ء صفحہ ۸۴

[2] مولانا سعید انصاری: سیر انصارؓ حصہ دوم۔ دار المصنفین اعظم گڑھ طبع دوم ۱۹۴۸ء صفحات ۱۸۱-۱۸۰

حضرت معاذ بن جبلؓ نے یہ طریقہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سیکھا تھا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حلقہ درس کا یہی انداز ہوتا تھا۔ تمام متعلمین کو اس میں شرکت کی اجازت تھی اور اس طرح انہیں آزادانہ طور پر درس میں شرکت کا موقع فراہم کیا جاتا تھا۔ حضرت ابی بن کعبؓ جو مسجد نبوی کے ایک برگزیدہ معلم تھے اور جنہیں ممتاز ماہر تعلیم اور محقق کی حیثیت سے بھی شہرت حاصل ہوئی اس معاملے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مثال دیا کرتے تھے۔ حضرت ابی بن کعب کو کئی علمی عہدے دیے گئے تھے۔ حضرت ابوبکر رضی صدیقؓ کے عہد خلافت میں قرآن کی ترتیب اور تدوین کا کام شروع ہوا تو ایک بورڈ تشکیل دیا گیا جس کا چیئرمین آپ کو مقرر کیا گیا۔ بعد میں خلیفہ سوم حضرت عثمان غنیؓ نے تلفظ کے اختلافات دور کرنے کے لیے ایک کمیٹی تشکیل دی تو آپ ہی کو اس کمیٹی کا کنوینر بنایا گیا۔ آپ اپنے دور طالب علمی کے بارے میں بتاتے تھے کہ بات کو سمجھنے کے لیے میں (ابی بن کعب) دیر تک حضور سے مذاکرہ کرتا تھا اور جب بات واضح طور پر سمجھ میں آجاتی تھی تب وہاں سے اٹھتا تھا۔[1]

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جس طریقہ تدریس کو فروغ دیا اس کی افادیت آج بھی موجود ہے۔ جدید دور کی درسگاہوں میں مباحثہ Discussion اور مذاکرے کو زیادہ اہمیت دی جاتی ہے بلکہ اعلیٰ تعلیم اور تحقیقی موضوعات کے سلسلے میں تو اس طریقے کی افادیت اور بھی مسلم ہے۔ اس سے طالب علموں میں سیکھنے کا رجحان بڑھتا ہے۔ ان میں تقریر کی صلاحیت فروغ پاتی ہے اور وہ خود سمجھنے کے بعد دوسروں کو بھی زیادہ موثر انداز سے سمجھا سکتے ہیں۔

طالب علموں کی نفسیات سے واقفیت

موجودہ عہد میں یہ بات بڑے زور وشور سے کہی جاتی ہے کہ اساتذہ کے لیے طالب علموں کی نفسیات سے واقف ہونا بیحد ضروری ہے۔ وہ جب تک طالب علموں کی فطرت ان کے تقاضوں ان کی صلاحیتوں اور استعداد سے واقف نہیں ہوں گے انہیں بہتر طور پر تعلیم نہیں دے سکتے۔ موجودہ دور کے ماہرین تعلیم اس امر پر بھی متفق ہیں کہ نفسیات کا یہ علم موجودہ صدی

---

[1] ایضاً صفحہ ۱۶۶

ہی میں منظر عام پر آیا ہے اور ان دنوں اس میں مزید تحقیقات اور اضافہ کا عمل جاری ہے۔ تعلیم اور تدریس میں نفسیات خصوصاً طالب علم کو سمجھنے کی اہمیت اپنی جگہ پر موجود ہے لیکن ان اصولوں کا آغاز کب اور کیسے ہوا اس ضمن میں تھوڑی سی تفصیل سے جائزہ لیا جائے۔

قرآن پاک کی سب سے پہلے نازل ہونے والی سورہ علق میں انسان کی پیدائش اور اس کی نشو و نما کے بارے میں کئی علامتیں موجود ہیں۔ یہی سورۃ وحی کے ذریعہ سب سے پہلے نازل ہوئی تھی۔ اس میں اللہ تعالیٰ نے گوشت کے لوتھڑے سے انسان کی تخلیق اور اس کی نشو و نما کے آغاز کی نشاندہی کی ہے۔ قرآن پاک کی ایک دوسری سورہ سورہ النساءٔ میں پیدائش کے بعد انسان کے ضعیف اور کمزور ہونے کی تصدیق بھی کی گئی ہے واضح طور پر کہا گیا ہے کہ انسان کو ضعیف پیدا کیا گیا ہے (یعنی وہ وقت اور حالات کے ساتھ ساتھ نمو حاصل کرتا جاتا ہے) قرآن پاک میں انسان کی پیدائش اس کی نشو و نما اور اس کی فطرت کے بارے میں جو باتیں کہی گئی ہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں اور بھی زیادہ واضح الفاظ میں بیان فرمایا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد سے نہ صرف انسان کی فطرت بلکہ اس کی نشو و نما کے تمام مراحل بھی واضح ہو جاتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ اس بات کی تصدیق بھی ہو جاتی ہے کہ فطرت پر ماحول کے اثرات بھی غالب آسکتے ہیں۔ (حدیث)[1]

وما من مولود الا یولد علی الفطرۃ فابواہ یہودانہ و ینصرانہٗ و یمجسانہ
کما تنتج البھیمۃ بھیمۃ جمعاً ھل تری فیھا جدعا۔

(ترجمہ) ہر انسان مسلم (یعنی سلیم الفطرت) پیدا ہوتا ہے بعد میں اس کے ماں باپ اسے یہودی یا عیسائی یا مجوسی بنا دیتے ہیں جس طرح جانور کا بچہ پیدا ہوتا ہے تو کیا جب تک تم اس کا کوئی عضو خود نہ کاٹو تو تمہیں اس کا کوئی عضو کٹا ہوا دکھائی دیتا ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد گرامی سے انسان کی تخلیق اور اس کی فطرت کا اندازہ ہوتا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پیدائش کے بعد ہر بچے کو عین فطرت کے مطابق قرار دیا ہے جس میں ضعف اور کمزوری کے باوجود معصومیت اور نیکی کے

---

[1] سید امیر علی: اسپرٹ آف اسلام، مترجم: ہادی حسین، ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور، طبع سوم [illegible]، صفحہ ۵۹۵

عناصر شامل ہوتے ہیں وہ مکمل طور پر اللہ تعالیٰ کی تخلیق کا شاہکار ہوتا ہے اس لیے اس میں کوئی برائی یا خرابی نہیں ہوتی۔ اگر اس میں منفی اثرات آتے بھی ہیں تو وہ پیدائش کے بعد اور بعض خارجی عوامل کی وجہ سے، یعنی فطرت اور ماحول Nature and Nature دونوں وہ بنیادی عوامل ہیں جو انسان کی نشو و نما اور اس کی شخصیت کی تکمیل کا سبب بنتے ہیں انسان کی فطرت میں خباثت اور معصیت نہیں یہ برائیاں اس میں توارث کے ذریعہ پرورش نہیں پاتیں بلکہ اس کے والدین، احباب اور ماحول کی مختلف اشیا اسے متاثر کرکے اس کی شخصیت میں ان باتوں کو شامل کر دیتے ہیں۔ بچوں کی تخلیق اور نشو و نما کے بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم صرف اسی ایک بات کی نشاندہی نہیں کرتے بلکہ انسانی جبلتوں اور میلانات کا تذکرہ بھی فرماتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق انسان میں دو قسم کے میلانات ہوتے ہیں ایک تو وہ جو اسے نیکی کی طرف لے جاتے ہیں اور نیکی کرنے پر مجبور کرتے ہیں اور دوسرے وہ جو اسے بدی کی طرف لے جاتے ہیں اور بدی کرنے پر مجبور کرتے ہیں[۱] (حدیث بحوالہ بخاری۔ باب عنوان ما قیل فی اولاد المسلمین) انسان میں نیکی اور بدی کی جبلتوں اور میلانات کے دوران آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بچوں کے کردار کا تعین نہیں کیا بلکہ واضح طور پر یہ ارشاد فرمایا کہ جو لوگ عنفوان عمر ہی میں مرجاتے ہیں ان کے بارے میں خدا ہی سب سے بہتر جانتا ہے کہ ان کا کردار کیا ہوتا، اگر وہ سن بلوغ تک زندہ رہتے[۲]

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مندرجہ بالا ارشادات انسان کی پیدائش اور اس کی نشو و نما کے ساتھ اس کی فطرت جبلت اور کردار کے بارے میں اتنی گراں قدر معلومات فراہم کرتے ہیں کہ موجودہ صدی کی نفسیات کی معلومات ان کے سامنے نقطہ آغاز معلوم دیتی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بچوں کے بارے میں مکمل معلومات فراہم کی ہیں تاکہ ان کی تعلیم و تربیت کرنے والے ان کی شخصیت اور اس کے تقاضوں سے پوری طرح باخبر ہوسکیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انسانی نشو و نما Human Development کی تشریح کے دوران مختلف لوگوں کے مابین انفرادی اختلافات Individual differences

---

[۱] ایضاً صفحہ ۵۹

[۲] ایضاً

کی بھی نشاندہی کی ہے۔ اس طرح بچوں کی مختلف اقسام سامنے آتی ہیں جو ذہنی نشو و نما کے حوالے سے ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہیں۔ جدید تعلیمی نفسیات بچوں کی تربیت میں انہی مختلف اقسام کو بنیاد بناتی ہے اور سب کے لیے الگ الگ اقدامات تجویز کرتی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ اقسام زمین کی مختلف کیفیات اور صلاحیتوں کے حوالے سے بیان کی ہیں۔ حضرت ابو موسیٰ کی روایت کے مطابق آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا (حدیث)

اللہ تعالیٰ نے جس علم و ہدایت کے ساتھ مجھے بھیجا ہے اس کی مثال بارش کی سی ہے جو زمین پر نازل ہوتی ہے زمین کا کچھ حصہ عمدہ اور زرخیز ہوتا ہے اور اس میں بارش جذب کرنے کی صلاحیت موجود ہوتی ہے چنانچہ اس کی بنا پر وہ بارش سے سرسبز و شاداب ہو جاتا ہے۔ اس کا کچھ حصہ پتھریلا ہوتا ہے وہ خود تو پانی کو جذب کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا مگر وہ اس پانی کو روک لیتا ہے جس سے دوسرے لوگ فائدہ اٹھاتے ہیں۔ وہ خود پیتے ہیں اپنی کھیتیاں سینچتے ہیں اپنے جانوروں اور مویشیوں کو پلاتے ہیں زمین کا کچھ حصہ چٹیل میدان ہوتا ہے نہ اس میں بارش جذب کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے اور نہ ہی کوئی دوسرا اس سے متمتع ہوتا ہے ایسے ہی ان لوگوں کی مثال ہے جو اللہ کے بھیجے ہوئے علم کو خود سیکھتے ہیں لوگوں کو سکھاتے ہیں اور ان لوگوں کو جنہیں ان کی چنداں پرواہ نہیں ہے اور جس ہدایت کو میں لے کر آیا ہوں اسے قبول نہیں کرتے۔

علم کو بارش سے تشبیہ دے کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حصول علم کے حوالے سے لوگوں کی مختلف اقسام کا تذکرہ کیا ہے۔ اس طرح انسانوں کی مختلف اقسام کا اندازہ ہوتا ہے جس سے درس و تدریس میں رہنمائی ملتی ہے اور متعلمین کو سمجھنے کا مرحلہ پایہ تکمیل تک پہنچتا ہے۔ انہی ارشادات کو سمجھنے کے بعد معلمین نے مختلف بچوں کے لیے مختلف نصاب اور مختلف تدریسی طریقے تجویز کیے جن کی تفصیل پہلے بیان کی جا چکی ہے۔

تدریس کے لیے آمادگی کی شرط

انسان کی پیدائش، اس کی فطرت، اوصاف، جبلتوں اور اس کے کردار کے ساتھ ساتھ مختلف اقسام کو پیش نظر رکھتے ہوئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بھی درس و تدریس

یہ ضمن میں متعلمین کی آمادگی READiness کو لازمی قرار دیا ہے ۔ امادگی دراصل ایک ایسی کیفیت کا نام ہے جس میں متعلم خود بھی کچھ سیکھنے کے لیے تیار ہو اس کیفیت کو محرکات یا ترغیبات کا نتیجہ بھی کہا جا سکتا ہے ۔ آمادگی کا تعین جسمانی اور ذہنی ہر دو صلاحیتوں کو سامنے رکھ کر کیا جاتا ہے ۔ متعلمین میں جب تک سیکھنے اور سمجھنے کی صلاحیتیں تحریک نہ پیدا کریں ان میں آمادگی کی کیفیت پیدا نہیں ہوتی ۔ اس کیفیت کے بغیر تدریس غیر موثر ثابت ہوتی ہے

آمادگی کی ایک مثال حضرت عبداللہ بن عباس کی تدریس سے ملتی ہے جس میں آپ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور معلمین صحابہ کرام کی تقلید کرنے کا دعویٰ کیا ہے حضرت عکرمہ رضؓ کی روایت کے مطابق ابن عباس رضؓ نے ایک بار ان سے کہا کہ تم ہر جمعہ کو لوگوں کے سامنے حدیث بیان کیا کرو (یعنی ہفتے میں صرف ایک بار) اور اگر لوگ اس کو نہ مانیں یعنی ہفتے میں ایک بار وعظ ونصیحت کو کم سمجھیں تو ہفتہ میں دو بار اور اس سے زیادہ کی ضرورت ہو تو ہفتے میں تین بار اور نہ رنجیدہ اور تنگ کرو لوگوں کو اس سے زیادہ اس قرآن سے ۔ اسی روایت کے مطابق اس کے بعد ابن عباس رضؓ نے فرمایا کہ نہ پاؤں میں تجھ کو اس حالت میں کہ تو کسی قوم یا جماعت کے پاس جائے اور وہ اپنی باتوں میں مشغول ہوں اور تو ان کی باتوں کو منقطع کر کے ان کو وعظ ونصیحت شروع کر دے اور ان کو رنج پہنچائے ۔ ایسی حالت میں تجھ کو چاہیئے کہ خاموش رہ البتہ اگر وہ تجھ سے وعظ ونصیحت کی خواہش کریں تو ان کے سامنے حدیث بیان کر جب تک وہ اس کے خواہشمند ہوں اور دعا میں مقفیٰ عبارت استعمال نہ کر ۔ بس میں نے معلوم کیا ہے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب سے کہ وہ ایسا نہ کرتے تھے یعنی دعا میں مقفیٰ الفاظ استعمال نہ کرتے تھے ۔ (بخاری)[1]

اس روایت سے یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ آمادگی کا تعین کیئے بغیر کسی کو کچھ سکھانا یا اسے سیکھنے کے لیے مجبور کرنے کے تعلیمی اعتبار سے اچھے نتائج برآمد نہیں ہوتے ۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے منسوب اس طریقہ کار کے مطابق تدریس سے پہلے آمادگی یا جاننے کی تحریک اور ترغیب کا ہونا ضروری ہے ۔ اس پہلے مرحلے کی تکمیل کے بعد دوسرے

---

[1] مشکوٰۃ شریف مترجم جلد اول ۔ کتاب العلم صفحہ ۱۰۱

مرحلے میں اس بات کا خیال رکھا جائے کہ جو کچھ بتایا جائے وہ اتنا سادہ اور سہل ہو کہ آسانی سے ذہن نشین کیا جا سکے۔ آمادگی اور تحریک کے ساتھ ساتھ تدریس کی ایک اور خصوصیت یہ بھی ہونی چاہیئے کہ وہ طلبا کے مزاج بلکہ ان کی صلاحیتوں اور ان کی استعداد کے مطابق ہو۔ ان اصولوں کا اطلاق نہ صرف تدریس بلکہ نصاب کی تدوین پر بھی کیا جاتا رہا ہے۔ نصاب میں اس ماحول اور علاقے کے تقاضوں کا بھی خیال رکھا گیا تھا جن علاقوں کے متعلمین کے لیے اسے ترتیب دیا گیا تھا۔ مثلاً آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں اسلام کی تبلیغ کے ابتدائی مرحلے پر مکہ کے مشرکین مدینہ اور خیبر کے یہود، اور شام اور یمن کے اطراف پھیلے ہوئے نصرانیوں اور مجوسیوں میں تبلیغ کرنے کے لیے قرآن کی ترتیب میں بھی خیال رکھا گیا تھا۔ سب کی تبلیغ کے لیے انہی کی مناسبت سے باتوں کو شامل کیا گیا تھا۔ مکی سورتوں میں توحید کی ترغیب اور بت پرستی کی مذمت کی گئی تھی۔ اس لیے کہ مکے کے مشرکین ان خرافات میں زیادہ گرفتار تھے۔ مدنی آیات میں ابتداً طرز خطاب یہودیوں کی مذہبی تاریخ، تحریفات اخلاقی کمزوریوں اور بنی اسرائیل سے متعلق ہے۔ نصرانیوں میں تعلیم و تبلیغ کا مرحلہ اس کے بعد شروع ہوا اور اسی مناسبت سے فتح مکہ کے بعد سورہ آل عمران نازل ہوئی۔[1] نزول قرآن کی ترتیب ہی سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اسلام میں تبلیغ کے لیے کیا اصول کارفرما رہے، ہر علاقے اور ماحول کو دیکھ کر وہیں کی مناسبت سے احکامات اور آیات نازل ہوتی گئیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عام لوگوں کی تعلیم و تربیت میں جن باتوں کا خیال رکھا ان میں لوگوں کی فطرت ان کے پیدائشی اوصاف، صلاحیتوں اور استعداد کے ساتھ ساتھ ان کے ماحول کو بھی شامل کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بحیثیت معلم اپنے عمل سے یہ ثابت کیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایک عظیم ماہر نفسیات بھی تھے۔ لوگوں کو سمجھ کر اُن کے مزاج اور ان کی استعداد کے مطابق بات کرنے کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسی خوبی بیان فرمایا جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرح دوسرے انبیاء کرام کو بھی عطا ہوئی تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود ہی اس کا اظہار بھی فرمایا تھا۔[2]

انا امرنا معشر الانبیاء بان تکلم الناس علی مقادیر عقولهم

---

[1] سید سلیمان ندوی: سیرۃ النبیؐ، جلد چہارم، قرآن لمیٹڈ، لاہور ۱۳۹۵ھ، صفحہ ۳۶۰

[2] علامہ شمس بریلوی: سرورِ کونین کی فصاحت، مدینہ پبلشنگ کمپنی، کراچی ۱۹۸۵ء، صفحہ ۲۲۹۔

ہم نبیوں کی جماعت کو حکم دیا گیا ہے کہ ہم لوگوں سے بقدر ان کی فہم و دانش کے گفتگو کریں۔ (ترجمہ)

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام نے بھی اسی اصول کو تعلیم کی بنیاد بنایا۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ تو اس ضمن میں بہت ہی محتاط تھے وہ لوگوں کو تعلیم دیتے وقت ان کی استعداد کا خیال نہ رکھنے کو نہ صرف تعلیم و تدریس کے برعکس بلکہ انتہائی نقصان دہ تصور کرتے تھے۔ ان کا مشہور قول ہے کہ[1] لوگوں کی عقل سے زیادہ بات کہو گے تو کسی نہ کسی کے لیے ضرور فتنہ بن جائے گی۔

⁂ ⁂ ⁂

---

[1] ابن عبدالبر اندلسی: جامع بیان العلم وفضلہ۔ مترجم عبدالرزاق ملیح آبادی۔ العلم و العلماء۔ ادارہ اسلامیات لاہور پہلی بار ۱۹۷۷ء صفحہ ۱۰۳

باب ۹

خواتین اساتذہ اور خواتین کی تعلیم

خواتین کے لیے تعلیم کی اہمیت

اسلام میں مردوں اور خواتین پر حصول علم یکساں طور پر فرض کیا گیا ہے ۔ اس معاملے میں خواتین کو کمتر اور کم عقل نہیں سمجھا گیا ۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا واضح ارشاد ہے ۔ کہ

(حدیث) طلب العلم فریضۃ علی کل مسلمہ و مسلمۃ

حصول علم مسلمان عورتوں اور مردوں پر فرض ہے ۔

بعض محققین اور شارحین اس حدیث مبارکہ میں مسلمۃ (مسلمان خواتین) کی اصطلاح کے حق میں نہیں ہیں بلکہ ان کے بقول بعض شواہد کے مطابق یہ اصطلاح اصل حدیث میں موجود نہیں لیکن ایسے افراد کی تعداد دوسروں کے مقابلے پر کم ہے ۔ بالفرض محال ان کی یہ بات تسلیم بھی کر لی جائے تب بھی کئی اور ذرائع ایسے باقی رہ جاتے ہیں جو اسلام میں خواتین کی تعلیم کے حق کو نہ صرف تسلیم کرتے ہیں بلکہ اسے ان کے لیے لازمی قرار دیتے ہیں اگر خواتین تعلیم حاصل نہ کریں تو گویا وہ اپنے فرائض سے کوتاہی کی مرتکب ہو رہی ہیں ۔ خواتین کے حصول علم کے لیے قرآن کریم نے واضح طور پر امہات المومنین کو اس فرض کی اہمیت سے آگاہ کیا (القرآن)

وَاذْكُرْنَ مَا يُتْلَىٰ فِي بُيُوتِكُنَّ مِنْ آيَاتِ اللَّهِ وَالْحِكْمَةِ (۳۳-۳۴) (احزاب - پ - ۲۲)

یاد کر لیا کرو جو تمہارے گھروں میں اللہ کی آیات اور حکمت کے بارے میں پڑھا جاتا ہے ۔ (ترجمہ)

قرآن کریم کے اس ارشاد کے مطابق حصول علم یا آیات و احکامات ربانی کا سمجھنا اور یاد کرنا صرف امہات المومنین ہی سے وابستہ کر دیا جائے تب بھی دوسری خواتین کے لیے حصول علم ثابت ہو جاتا ہے ۔ کیونکہ امہات المومنین پر حصول علم کے ساتھ ہی اشاعت

علم کا فریضہ عائد سمجھا جاتا ہے اور اشاعت علم کے وسیلے دوسری خواتین ہی اسے حاصل کریں گی۔
آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خواتین کے لیے تعلیم لازمی قرار دیتے وقت کسی قبیلہ منصب یا
حیثیت کی خواتین کے لیے خصوصی احکامات جاری نہیں فرمائے تھے بلکہ سب کو مساوی تصور
کرتے ہوئے حصول علم کا مشورہ دیا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم خواتین کی تعلیم کے حق میں
اس درجہ واضح نقطہ نظر رکھتے تھے کہ ان خواتین کو (جو کنیزیں تھیں اور مکمل طور پہ اس دور
کی عرب روایات کے مطابق دوسروں کی ملکیت تھیں) انہیں بھی تعلیم دینے کی ہدایت
کی۔ (حدیث) من کانت لہ جارلۃ فعلمھا

اگر کسی کے پاس لونڈی ہو تو وہ اسے بھی تعلیم دے

اسی حدیث کو بخاری کے حوالے سے گولڈزیہر GOLDZIHER نے انسائیکلو پیڈیا
میں کچھ اس طرح درج کیا ہے[۱]۔

It is regarded as a work of specially meritorious character 'to educate a slave girl well, then set her free and give her to husband'

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے لونڈیوں کی آزادی اور ان کی شادی سے پہلے انہیں تعلیم
دینے کی ہدایت فرمائی تھی۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ تعلیم کو کس قدر اہمیت دی گئی تھی ابتدائی
دور میں تو کئی ایسی ترغیبات رائج کی گئی تھیں تاکہ خواتین بھی
تعلیم کے شعبہ میں نمایاں مقام حاصل کرسکیں اسی نوعیت کی ترغیبات پر مبنی ایک اسکیم یہ بھی
رائج رہی کہ وہ شوہر جو اپنی بیویوں کو زیور تعلیم سے آراستہ کریں انہیں مہر کی ادائیگی سے مبرا
قرار دیا جاتا تھا۔ گویا عورت کو تعلیم دلادی گئی تو یہ عمل اس کے حق مہر کی ادائیگی کے متبادل
سمجھا گیا۔ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ جس شخص نے
اپنی کنیز کو اچھی تعلیم و تربیت سے سنوارا پھر آزاد کر کے اپنی زوجیت میں لے لیا اس کے دو ثواب ہیں[۲]

---

[۱] James Hasting : Encyclopedia of Regligion and Ethics : Vol : V Second Edition - London - 1937 - P-193

[۲] ابن عبدالبر اندلسی: جامع بیان العلم و فضلہ: مترجم عبدالرزاق ملیح آبادی۔ العلم و العلماء۔ ادارہ اسلامیات لاہور پہلی بار ۱۹۸۳ء صفحہ ..

تعلیم وتربیت اور آزادی دونوں کو الگ الگ ثواب کی حیثیت عطا کر کے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس دور کے معاشرے میں سب سے کم حیثیت رکھنے والی خواتین (لونڈیوں) کی تعلیم کے حق کو نہ صرف تسلیم کیا بلکہ دوسروں کو بھی اس کے مطابق عمل کرنے کی ہدایت کی۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اولاد کے حوالے سے والدین کی اہم ذمہ داریوں میں اولاد کی تعلیم و تربیت کو بھی شامل کیا ہے فرمایا کہ عمدہ تعلیم وتربیت اولاد کا حق ہے اور انہیں یہ حق دینا والدین کی جانب سے سب سے اچھا تحفہ ہے۔ بغور جائزہ لیا جائے تو اندازہ ہوگا کہ اولاد کی تربیت میں باپ اور ماں دونوں ہی برابر سے شریک ہوتے ہیں۔ بلکہ چھوٹی عمر کے بچوں کی تربیت کا زیادہ انحصار تو صرف ماں ہی پر ہوتا ہے۔ وہ خود بہتر طور پر تعلیم وتربیت حاصل کر چکی ہوگی تو اولاد کو بھی انہی خطوط کے مطابق تعلیم وتربیت دے سکتی ہے۔

غرض آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم خواتین کی تعلیم کے حق میں تھے یہی سبب تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے شفا بنت عبداللہ سے کہا کہ وہ ام المومنین حضرت حفصہ بنت عمرؓ کو پڑھا دیا کریں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بھی خواتین کو تعلیم دی۔ حصول علم اور اشاعت علم کے حوالے ام المومنین حضرت عائشہؓ نے اتنی شہرت حاصل کی کہ خواتین تو درکنار ہزاروں مردوں نے بھی ان سے علم حاصل کیا۔ یہ سب شواہد اور حوالے اس امر کی واضح تصدیق کرتے ہیں کہ حصول علم مردوں اور عورتوں کی یکساں ذمہ داری تھی گو دونوں کو اس فرض کی ادائیگی کے یکساں مواقع مہیا نہ ہو سکے پھر بھی خواتین نے اس شعبہ میں بھرپور حصہ لیا اور حصول علم اور اشاعت علم میں مردوں کے شانہ بشانہ کام کرتی رہیں۔

جاننے میں حیا نہ کرنے کی اجازت

خواتین اپنی جسمانی نشوونما اور فطری تقاضوں میں مردوں سے مختلف ہوتی ہیں عربوں میں خصوصاً ظہور اسلام سے پہلے انہی جسمانی اور ارثی (توارث) اختلافات کے باعث خواتین کو انتہائی کمزور سمجھا جاتا تھا اور انہیں حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ بعض عرب تو اس باطل

---

[1] ڈاکٹر احمد شلبی: تاریخ تعلیم وتربیت اسلامیہ، مترجم محمد حسین خاں زبیری۔ ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور سنہ ۱۹۶۳ء صفحہ ۱۵۴

خدشے کی بنیاد پر کہ ان کی لڑکی بالغ ہو کر کسی دوسرے کی زوجیت میں جائے گی اور اس طرح ان کی سبکی ہوگی وہ اسے زندہ دفن کر دینا مناسب سمجھتے تھے۔ انہوں نے عزت اور وقار کے حوالے سے کئی ایسے معیار قائم کر لیے تھے جنہیں کوئی بھی معاشرہ قدر کی نگاہ سے نہیں دیکھتا۔ عورت کو کمتر اور حقیر سمجھنا بھی ان کے ایسے ہی معیارات میں سے ایک معیار تھا۔ ظہور اسلام سے پہلے کے اس منفی رجحان پر مبنی عرب روایت سے اس بات کا عندیہ ضرور ملتا ہے کہ وہ لوگ عزت اور غیرت کے معاملے میں بہت سخت گیر واقع ہوئے تھے وہ عورت کو بھی اسی حوالے سے دیکھتے تھے یہ انداز فکر اب بھی بہت سی قوموں میں رائج ہے گو اس میں پہلے جیسی شدت باقی نہیں رہی خود ہمارے موجودہ معاشرے میں بھی زر اور زمین کے ساتھ ساتھ زن (عورت) کو بھی انتہائی حساس مسئلہ سمجھا جاتا ہے۔

اسلام نے معاشرے کی جس نئے انداز سے تربیت کی اس میں عورت کی حیثیت کو باعزت بنانا بھی شامل ہے عرب معاشرے میں پہلی بار ایسا ہوا کہ خواتین کو مردوں کے بنائے ہوئے عزت اور غیرت کے اس منفی معیار سے نجات حاصل ہوئی جس کا وہ برسوں سے نشانہ بنائی جارہی تھیں۔ اس پوری تربیت میں سب سے نمایاں کردار آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا تھا جنہوں نے اپنے عمل اور اپنی تعلیمات سے خواتین کا اعتماد بحال کیا اس عمل میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ساتھ امہات المومنین بھی پیش پیش رہیں۔ اسلام میں خواتین کی معاشرتی بحالی کا مطلب یہ نہیں تھا کہ انہیں مردوں سے آزادانہ میل جول کی اجازت دے دی گئی تھی بلکہ ان کے حقوق اور فرائض کے سلسلے میں وہی یکساں اصول رائج کیا گیا جس کا اطلاق مردوں پر ہونے لگا تھا۔ اس طرح خواتین میں اعتماد بحال ہوا اور انہوں نے تعلیمی اور معاشرتی شعبوں میں اپنا کردار آزادی سے ادا کیا۔

اسلام میں حصول علم کے حوالے سے جائزہ لیا جائے تو کہیں بھی مردوں اور عورتوں کی تخصیص صرف اس بنیاد پر نہیں کی گئی کہ وہ جسمانی ساخت کے اعتبار سے ایک دوسرے سے مختلف ہیں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خواتین کو بھی حصول علم کے مواقع فراہم کیے اور اس سلسلے میں ان کی مکمل حوصلہ افزائی فرمائی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم جب تک مکے میں مقیم رہے وہاں کی خواتین حصول علم کے لیے (یہاں تک کہ مذہبی معاملات کے بارے میں جاننے کے لیے) اپنی سابقہ معاشرتی اقدار کے زیر اثر آپ صلی اللہ علیہ وسلم

سے رابطہ قائم نہیں کرسکتی تھیں۔حالانکہ مذہبی اعتبار سے خصوصاً عبادات اور احکامات میں کئی معاملات ایسے بھی تھے جن کے بارے میں خواتین کو استفسار کی ضرورت محسوس ہوتی تھی جاننے کی خواہش رکھنے کے باوجود وہاں کے حالات کی وجہ سے حصول علم میں مکے کی خواتین کو پیچھے رہ جانا پڑا۔ یہ مسئلہ مدینے کی خواتین کے نزدیک خاصا اہم تھا۔ اسی لیے ہجرت کے بعد جب آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم مدینے تشریف لے گئے تو وہاں کی خواتین نے مکے کی خواتین کے قطعی برعکس آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے براہ راست رجوع کیا اور حصول علم کی درخواست کی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خواتین انصار کے اس جذبے کو نہ صرف سراہا بلکہ انہیں مہاجرین خواتین سے زیادہ بہتر قرار دیا۔ (حدیث)

نعم النساء نساء الانصار لم یکن یمنعھن الحیا یتفقھن فی الدین

انصار کی عورتیں بہترین عورتیں تھیں کہ حیا ان کے فہم دین حاصل کرنے میں حائل نہ ہوتی (ترجمہ)

علم کی دلدادہ ان خواتین نے بلا حجاب و تکلف حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ان مسائل کو پیش کیا جو خصوصیت سے صرف انہی سے متعلق تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس ضمن میں انہیں اسلامی احکامات بتائے۔ یہ سلسلہ اس حد تک فروغ پا تا گیا کہ خواتین کی تعلیم کے لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دن مخصوص کر دیا۔[۱] (بحوالہ صحیح بخاری۔ کتاب العلم) اور وہ بھی مسجد نبوی میں آکر تعلیم حاصل کیا کرتی تھیں۔ حصول علم سے متعلق خواتین انصار کا یہ عمل حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پسند فرمایا تھا اور اسی حوالے سے ان خواتین کو بہترین خواتین ہونے کی سند عطا فرمائی تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کی روشنی میں وہ خواتین جو جھجک کے باعث معلومات حاصل کرنے میں تامل کا مظاہرہ کریں اور ناکام رہیں ان سے وہ خواتین جو جاننے کے لیے بلا وجہ حجاب اور تامل نہ کریں زیادہ بہتر قرار دی گئی ہیں۔ اس حوالے سے یہ بات اخذ نہیں کی جاسکتی کہ مسلمان خواتین عام تعلیم حاصل کرنے کے لیے شرم و حیا کو بالائے طاق رکھ دیں اس امر کی اجازت تو دینی تعلیم کے حصول کے دوران بھی نہیں البتہ انتہائی ضروری دینی اور علمی معاملات میں استفسار کے لیے ان پر عائد عام معاشرتی حدود کو کسی حد تک نرم ضرور کیا جا سکتا ہے۔

---

[۱] حمید ﷲ۔ عہد نبوی کا نظام حکمرانی (جلد اول) مکتبہ ابراہیمیہ۔ حیدر آباد دکن بار دوم ۱۹۴۹ء

مذہبی فرائض اور امور خانہ داری

خواتین کی تعلیم کے سلسلے میں یہ بات تو بالکل واضح ہے کہ دین اور دینی معلومات کے حصول کے لیے انہیں مکمل آزادی حاصل ہے جہاں تک عام دنیوی علوم کے حصول کا معاملہ ہے اس سلسلے میں دو واضح نقطہ نظر سامنے نظر آتے ہیں۔ ایک طبقہ علی الاعلان یہ بات کہتا ہے کہ اسلام عورتوں کو دینی اور شرعی احکامات کے علاوہ اور کسی موضوع کی تعلیم حاصل کرنے کی اجازت نہیں دیتا اس نوعیت کے خیالات رکھنے والوں میں غیر مسلم مورخین اور محققین کے ساتھ ساتھ چند مسلم محققین بھی شامل ہیں۔ گوز بیہر نے خواتین کی تعلیم کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے۔ اسے اگر بغور دیکھا جائے تو اس نقطہ نظر کا کسی حد تک اندازہ ہو جاتا ہے۔ ان صاحب کی تحقیق ہے کہ اس عہد میں خواتین کے "لکھنے" پر سخت پابندی تھی۔ انہوں نے لقمان کے حوالے سے ملنے والی ایک روایت کا تذکرہ بھی کیا ہے کہ ایک بار ان کا (لقمان کا) کسی ادارے کے پاس سے گزر ہوا تو دیکھا کہ ایک لڑکی کو تعلیم دی جا رہی ہے لقمان نے کہا کہ تلوار پر سان دھری جا رہی ہے۔ (اس کی دھار تیز کی جا رہی ہے) یقیناً یہ لڑکی اپنے شوہر کی بربادی کا سبب بنے گی (گوز بیہر نے ان واقعات کو قتادی حدیثیہ۔ ابن مسعود ابن حجاریہ کے حوالے سے نقل کیا ہے) اس روایت کا جائزہ لیا جائے تو اس کی تصدیق یا تردید سے پہلے ہی یہ بات سامنے آتی ہے کہ اس کا تعلق حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد سے نہیں بلکہ یہ بعد کے ادوار سے متعلق ہو سکتی ہے۔ اس لیے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں ایسی باقاعدہ درسگاہوں یا تعلیمی اداروں کی تصدیق ہی نہیں ہوتی جہاں لڑکے اور لڑکیاں پڑھا کرتے تھے۔ اس عہد سے لکھنے Writing پر پابندی کی تصدیق بھی نہیں ہوتی یہ ہو سکتا ہے کہ بعد میں معاشرتی اور اخلاقی اعتبار سے اس قسم کی پابندیاں رائج کی گئی ہوں۔ گوز بیہر نے میزان الاعتدال کے حوالے سے خواتین کی تعلیم (خصوصاً حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کے حوالے

سے متعلق مندرجہ ذیل نقطہ نظر قائم کیا ہے۔ ^ل^

The following utterance of the Prophet regarding females - said to rest on the authority of AISHA is frequently quoted - Do not let them frequently -- the roofs ; do not teach them the art of writing : teach them spinning and Surat-al-Nur.

اس اقتباس میں لڑکیوں کے لیے لکھنے کی مہارت اور گھروں سے نکلنے کی پابندیوں کا اعادہ کیا گیا ہے۔ البتہ انہیں چرخہ کاتنے Spinning اور سورۃ النور کی تعلیم حاصل کرنے کی رعایت دی ہے (اس سورہ میں وہ تمام احکامات شامل ہیں جنہیں خواتین کے لیے بڑی اہمیت حاصل ہے)۔

خواتین کو ایسے علوم سیکھنے کی اجازت دی گئی ہے جن کے حصول کے لیے انہیں گھر سے باہر نہ نکلنا پڑے اور جنہیں حاصل کر کے وہ معاشی طور پر اپنے خاندان کی کفالت میں معاون ثابت ہو سکیں۔ اس طرح انہیں مختلف ہنروں اور مہارتوں کے حصول میں مصروف رکھ کر گھر میں ان کے فارغ اوقات کا بہترین مصرف بھی تجویز کر دیا گیا ہے۔ پہلے مکتبہ فکر کے لوگوں کے ذہن میں خواتین کی تعلیم کے لیے اس کے علاوہ اور کسی چیز کی اجازت نہیں ہے۔ غیر مسلم محققین نے مسلمانوں (خصوصاً عہد نبوی) کے سلسلے میں اس قسم کی باتوں سے یقیناً یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں بھی خواتین کو معاشرتی اعتبار سے کوئی خاص اہمیت حاصل نہیں تھی البتہ وہ چند مسلمان محققین جو موجودہ دور میں بھی ان کی اس بات پر اصرار کرتے ہیں ان کے بارے میں رائے زنی اس لیے مناسب نہیں کہ وہ اپنے طرز عمل سے اسلام کے بارے میں یہ تاثر عام کر رہے ہیں کہ نعوذ باللہ اسلام ان کی طرح تنگ نظری پر مبنی ہے اور انہیں اس کی وسعت اور بالغ نظری کا اعتراف نہیں ہے۔

خواتین کی تعلیم کے سلسلے میں دوسرا مکتبہ فکر خواتین کی تعلیم کے حق میں ہے وہ یہ ثابت کرتا ہے کہ خواتین کو تعلیم حاصل کرنے کے پورے مواقع فراہم کیے جائیں اور مردوں کی طرح ان کے نصاب میں بھی سب سے پہلے قرآن اور احکامات شرعیہ کو شامل کیا جائے تاکہ انہیں

---

^ل^ James Hasting : Encyclopedia of Religion and Ethics - Vo:V Second Edition - London - 193? - P-2??

اسلامی احکامات اور عبادات کی تعلیم دی جا سکے ۔ مذہبی تعلیم کے بعد عورتوں کو دوسرے مضامین کی تعلیم بھی دی جائے ان کے یہ عام شعبہ ہائے تعلیم مردوں کے نصاب یا تعلیمی سرگرمیوں سے مختلف ہوں اور ان میں خواتین کی ضروریات اور ان کے تقاضوں کا خیال رکھا جائے ۔ ان کے نصاب میں ایسے مضامین رائج کیے جائیں جن میں انہیں زیادہ جسمانی مشقت نہ کرنی پڑے اور نہ ہی انہیں زیادہ وقت گھر سے باہر گزارنا پڑے ۔ ان کا نصاب اس طرح مردوں کے نصاب سے مختلف ہو جاتا ہے جس میں گھریلو مصنوعات کی تیاری اور تربیت پر زور زیادہ دیا گیا اور اس کا تعین خصوصیت سے خواتین کے لیے خود آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہی فرمایا تھا ۔[1] خواتین کی تعلیم میں اس طرح مذہبی فرائض کی تعلیم کے ساتھ ساتھ امور خانہ داری اور پیشہ ورانہ مہارت کے حامل مضامین کی تدریس کا جواز ملتا ہے ۔ جہاں تک ان میں لکھنے کی مہارت کا تعلق ہے writing اس نوعیت کی روایات زیادہ مستند نہیں ہیں ۔ لکھنے کی صلاحیت اگر ناپسندیدہ ہوتی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم دوسروں کو اس کی ہدایت فرماتے اور امہات المومنین رض کو بھی اس عمل سے منع فرماتے ۔ کئی شواہد ملتے ہیں کہ حضرت عائشہ رض اور حضرت حفصہ رض ۔ دونوں ہی لکھنا پڑھنا جانتی تھیں ۔ سنن داؤد کے مطابق حضرت حفصہ رض کو جس خاتون نے لکھنا سکھایا تھا وہ حضرت شفا بنت عبداللہ تھیں[2] جو خود بھی مسلمان تھیں اور انہوں نے یہ تربیت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق دی تھی ۔ غرض عہد نبوی میں کئی مسلمان خواتین ایسی تھیں جو علم و مہارت میں مردوں کے ہم پلہ تھیں انہیں مختلف علوم و فنون میں دسترس حاصل تھی یہاں تک کہ ادب اور شاعری جیسے شعبوں میں بھی خواتین نمایاں حیثیت رکھتی تھیں ۔

علم الصحت نرسنگ اور بچوں کی تربیت

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے شوہروں پر یہ ذمہ داری عائد کی کہ وہ اپنی بیویوں کی تعلیم کا انتظام کریں ۔ ہم پہلے ہی اس بات کا تذکرہ کر چکے ہیں کہ اولاد کی صحیح تعلیم و تربیت اسی وقت

---

[1] محمد حمید اللہ : عہد نبوی کا نظام حکمرانی (جلد اول) مکتبہ ابراہیمیہ ۔ حیدر آباد دکن ۔ بار دوم سنہ ۱۹۴۹ء

[2] مولانا سعید انصاری : سیر الصحابیات : معارف اعظم گڑھ ۔ طبع چہارم سنہ ۱۹۵۳ء

ممکن ہے جب والدین خود بھی بہتر تعلیم و تربیت کے حامل ہوں۔ اس اعتبار سے خواتین کے لیے
بچوں کی نگہداشت اور ان کی صحت کی دیکھ بھال کی ذمہ داری مردوں سے کچھ زیادہ ہو جاتی ہے
(اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ان کے لیے زندگی کے دوسرے شعبے ممنوع قرار دے دیئے گئے۔
ہیں۔ یہاں ہم عہد نبویؐ کے عرب اور وہاں کی معاشرت کے حوالے سے گفتگو کر رہے ہیں جس میں
موجودہ دور کے کئی علوم اور ان کے مختلف شعبہ جات کا سرے سے کوئی تصور ہی رائج نہیں تھا)
بچوں کی صحت اور نگہداشت موجودہ دور میں ایک الگ مضمون ہی نہیں بلکہ ایک کلیہ
Facult.. کی حیثیت اختیار کر چکی ہے یہ موضوعات اس دور میں اتنے وسیع اور
مسلّ نہیں تھے۔ اس عہد میں ایسے باقاعدہ اداروں کی تصدیق تو نہیں ہوتی جہاں خواتین کو
ان موضوعات کی باقاعدہ تعلیم یا تربیت دی جاتی ہو البتہ بچوں کی صحت اور نگہداشت کے
لیے روایتی Traditional طریقوں سے سیکھنے کے شواہد ضرور ملتے ہیں
اس نوعیت کی تعلیم میں عربوں کے روایتی طور طریقے بھی شامل تھے جس کی ایک مثال حضرت
شفا بنت عبداللہؓ سے ملتی ہے یہ خاتون صحابیہ ایام جاہلیت ہی سے ایک ایسے منتر (عمل)
سے واقف تھیں جس سے چیونٹی کے کاٹنے کے اثرات زائل ہو جاتے ہیں یہ بات حضور صلی اللہ
علیہ وسلم کے علم میں بھی تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سوچتے ہوئے کہ ریگزار عرب میں رہنے
والے عام لوگ ان کی اس مہارت سے استفادہ کرتے ہیں اور اس کا کوئی معاشرتی یا اخلاقی طور
پر منفی اثر بھی نہیں پڑتا اس لیے انہیں یہ عمل کرنے سے نہیں روکا۔ بعد میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم
نے ان سے کہا کہ وہ یہ طریقے ام المومنین رضؓ حضرت حفصہؓ کو بھی سکھا دیں[1] حضرت حفصہؓ
کو حصول علم کا بہت شوق تھا اور آپ نے لکھنا بھی انہی خاتون سے سیکھا تھا۔ (بحوالہ مسند
ابن حنبل، ص۔ ۳۵) اسی نوعیت کے اور علوم یا طریقوں کے رواج کی تصدیق تو نہیں ہوتی
لیکن اس خیال کو تقویت ضرور پہنچتی ہے کہ بچوں کی نگہداشت کے حوالے سے خواتین کے لیے
مزید جاننا مستحسن عمل قرار دیا گیا تھا۔ خواتین کی تعلیم کے حوالے سے دوسرا اہم ترین موضوع
صحت تھا جو موجودہ دور کے میڈیکل شعبے کی ابتدائی صورت کہی جا سکتی ہے۔ عہد نبویؐ
میں اس شعبے سے وابستہ خواتین کا اندازہ پہلی بار غزوہ احد کے موقع پر ہوتا ہے۔ وہ خواتین

---

[1] ایضاً

جنہوں نے زخمیوں کی مرہم پٹی کی یقیناً انہوں نے یہ فن کہیں نہ کہیں سے ضرور سیکھا ہوگا۔ ان خواتین نے اپنی اس شعبہ میں مہارت یا معمولی شدبد کا اظہار حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں کیا تھا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے اس عمل کو ناپسندیدہ نہیں کہا تھا اس لیے اس شعبہ میں خواتین کے حصول علم کی تائید کی جا سکتی ہے۔

مندرجہ بالا شواہد اور حقائق کا سنجیدگی سے جائزہ لیا جائے تو یہ بات پایہ تصدیق کو پہنچ جاتی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں خواتین کے علم حاصل کرنے پہ پابندی نہیں تھی۔ ان کا تعلیمی نصاب مردوں کے تعلیمی نصاب سے کسی حد تک مختلف ضرور تھا لیکن ان پہ عورت ہونے کی وجہ سے مختلف علوم کی تعلیم حاصل کرنے کے دروازے بند نہیں کیے گئے تھے۔ ان کے لیے جو نصاب ترتیب دیا گیا اس میں قرآن اور مذہبی تعلیمات کو لازمی مضمون کی حیثیت حاصل تھی۔ اس کے علاوہ انہیں علم الصحت، بچوں کی نگہداشت اور امور خانہ داری سے متعلق دیگر مضامین (بشمول پیشہ ورانہ مہارتیں) کی تعلیم حاصل کرنے کی اجازت تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں خواتین کی تعلیم و تربیت میں پیراکی، نیزہ بازی اور گھوڑے سواری جیسی مہارتوں کا ثبوت نہیں ملتا یہ مہارتیں خصوصیت سے مردوں کے لیے لازمی تھیں جن پہ اپنی اور اپنے اہل خانہ کے تحفظ کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے، خواتین کا تحفظ اور دفاع چونکہ براہ راست ان کے باپ، بھائی یا پھر شوہر کی ذمہ داری ہے اس لیے انہیں ان مہارتوں کے حاصل کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی ہوگی، خواتین نے ادب اور شاعری جیسے موضوعات میں بھی تعلیم حاصل کی (جن کی تفصیل آئندہ سطور میں موجود ہے) ان میں سے کئی خواتین کو معاشرہ میں اہم مقام بھی حاصل ہوا۔ ان سب حوالوں سے خواتین کی تعلیم سے متعلق یہ نقطہ نظر کہ انہیں تعلیم کے معاملے میں محدود کر دیا جائے خود بخود غلط ثابت ہو جاتا ہے۔

خواتین اساتذہ اور ادارے

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں خواتین علم و فضل کے اعتبار سے مردوں سے

کمتر نہیں تھیں۔ یقیناً ان پر علم حاصل کرنے کی پابندی نہیں تھی اسی لیے انہوں نے یہ مقام حاصل کیا کئی صحابیات نے قرات، تفسیر، حدیث، فقہ اور فرائض میں کمال حاصل کر لیا تھا۔ حضرت عائشہؓ، حضرت حفصہؓ، حضرت ام سلمہؓ اور حضرت ام ورقہؓ کو قرآن پاک حفظ تھا۔ ان کے علاوہ قرآن کے کئی پارے حفظ کر لینے والی خواتین میں حضرت ام سعدؓ بنت سعد ابن ربیع، حضرت ام ہشامؓ بنت حارثہ، حضرت رائطہؓ بنت حیان اور حضرت ہندؓ بنت اسید شامل تھیں ان خواتین میں سے حضرت ام سعدؓ تو باقاعدہ درس دیتی تھیں اور خواتین کو قرآن پڑھایا کرتی تھیں، تفسیر قرآن کی معلمات میں سب سے نمایاں حیثیت حضرت عائشہؓ کو حاصل تھی، جہاں تک حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے مختلف روایات نقل کرنے کا تعلق ہے خواتین اس شعبے میں مردوں سے پیچھے نہیں تھیں، حضرت عائشہؓ سے تقریباً دو ہزار دو سو دس (۲۲۱۰) اور حضرت ام سلمہؓ سے تقریباً تین سو اٹھہتر (۳۷۸) روایات منسوب ہیں، ان کے علاوہ روایات نقل کرنے کے سلسلے میں حضرت ام عطیہؓ اسما بنت ابو بکرؓ، ام ہانیؓ اور فاطمہ بنتؓ قیس کی اہمیت اور علمیت کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔[۱]

• خواتین صحابیات نے صرف قرآن کی تفسیر اور تعلیم ہی نہیں دی بلکہ وہ تبلیغ اسلام کی جدوجہد میں بھی شریک رہیں۔ حضرت ام شریکؓ مکہ کی قریش خواتین میں مخفی طور پر اسلام کی تبلیغ اور اشاعت کا کام کرتی تھیں، کئی خواتین ایسی تھیں جن کے استدلال کے باعث ان کے شوہر یا خاندان کے دوسرے مرد مسلمان ہو گئے۔ اس سلسلے میں ایک نام حضرتؓ فاطمہ بنت خطاب کا بھی ہے جن کی دعوت پر ان کے بھائی حضرت عمرؓ نے اسلام قبول کیا۔ اسی طرح حضرت ام سلیمؓ کے تبلیغ کرنے پر حضرت ابو طلحہؓ اور حضرت ام حکیمؓ کی تبلیغ سے متاثر ہو کر ان کے شوہر عکرمہ نے اسلام قبول کیا[۲] خواتین میں حضرت ام ورقہ بنت عبداللہ قرآن بھی پڑھی ہوئی تھیں اور انہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں کی عبادت کے دوران قیادت کرنے کے لیے (امام) مقرر کیا تھا۔ ان کے ساتھ ایک موذن کا تقرر بھی کیا گیا تھا۔ آپ کو اپنے کام سے اس

---

[۱] ایضاً صفحات ۷-۶

[۲] ایضاً

درجہ رغبت تھی کہ رات گئے تک قرآن پاک پڑھا کرتی تھیں۔ ان صحابیہ کو ان کے غلام نے گلا گھونٹ کر ہلاک کر دیا تھا۔ لوگ راتوں کو ان کے قرآن پڑھنے کی آواز سے اس قدر مانوس ہو چکے تھے کہ صبح حضرت عمرؓ استفسار کرتے رہے کہ رات خالہ کے قرآن پڑھنے کی آواز کیوں نہیں آئی۔[1] حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں طب کی تعلیم دینے والی خواتین میں حضرت رفیدہؓ نامی صحابیہ کا نام سب سے نمایاں ہے۔ آپ کے خیمے کو جراح خانہ کی حیثیت حاصل تھی ان کا یہ طبی اور تعلیمی مرکز مسجد نبوی سے متصل تھا۔ ان مختلف صحابیات کے حوالوں سے اس بات کی تصدیق ہو جاتی ہے کہ خواتین نہ صرف حصول علم بلکہ اشاعت علم کے معاملے میں بھی نمایاں کردار ادا کر رہی تھیں۔ ان کے بعض تعلیمی یا تربیتی نوعیت کے ادارے بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی ہی میں کام کر رہے تھے۔

خواتین کے مرد شاگرد

حصول علم کے معاملے میں خواتین جس طرح مردوں کے شانہ بشانہ مصروف رہیں بالکل اسی طرح انہوں نے اشاعت علم کے لیے بھی مردوں کی طرح کام کیا۔ بعض صحابیات کو تو یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ ان سے تعلیم حاصل کرنے والوں میں مرد بھی شامل تھے۔ ایسی خواتین میں سرفہرست حضرت عائشہؓ اور حضرت حفصہؓ کے نام آتے ہیں یہ دونوں امہات المومنینؓ میں سے تھیں اس اعتبار سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں خواتین کی تعلیم اور اس نظام تعلیم و تربیت میں خواتین کی شرکت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ حضرت عائشہؓ سے علم حاصل کرنے والے افراد کی کم از کم تعداد دو سو ہے۔ ان کے متعلمین میں مرد اور خواتین سب ہی شامل تھے۔ مرد شاگردوں میں حضرت عروہ بن زبیرؓ، حضرت قاسم بن محمدؓ، حضرت ابوسلمہؒ بن عبدالرحمٰن، مسروقؒ، عمرۃ، حضرت معاویہ عدویہ اور خواتین میں حضرت صفیہ بنت شیبہؓ اور حضرت عائشہ بنتؓ طلحہ کے نام سب سے نمایاں ہیں۔ حضرت عائشہ کی طرح حضرت حفصہؓ سے علم حاصل کرنے والوں میں بھی مرد اور خواتین دونوں ہی شامل تھے۔ ان کے متعلمین کی فہرست میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضرت حمزہؓ (ابن

---

[1] ایضاً صفحہ ۱۷۲

عبداللہ، حارثہ بن وہب مطلب بن ابی وادعہ، عبداللہ بن صفوان، عبدالرحمن بن حارث بن ہشام اور حضرت صفیہ بنت عبداللہ اور حضرت ام بشر الضاریہؓ کے اسماء گرامی شامل ہیں۔[۱]

ان دو برگزیدہ معلمات کے نقش قدم پر چلتے ہوئے کئی اور مسلمان خواتین نے درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا ان خواتین میں حضرت نفیسہ کو بہت شہرت حاصل ہوئی۔ وہ عہد نبویؐ کے بعد ہی اس شعبے سے وابستہ ہو گئی تھیں اور محدثہ کی حیثیت سے بڑا مقام حاصل کر لیا۔ یہ خاتون حضرت علیؓ کے خاندان سے تعلق رکھتی تھیں اور بعض روایات کے مطابق ان کے درس میں حضرت امام شافعی بھی شریک ہوا کرتے تھے۔[۲] مسلمانوں کے ابتدائی عہد میں درس و تدریس کے شعبے سے وابستہ خواتین کے اسماء گرامی کی تصدیق کئی حوالوں سے ہوتی ہے اس لیے اس بات کا کوئی امکان نہیں رہتا کہ اس دور میں خواتین کی تعلیم سے انکار کیا جا سکے کئی خواتین نے تو اس درجہ مہارت حاصل کر لی تھی کہ ان سے علم حاصل کرنے کے لیے مردوں نے رجوع کیا۔ یہ اسلام کے اس نظام تعلیم و تربیت کا کمال تھا کہ وہ عرب جو چند سال پہلے خواتین کو انتہائی حقیر اور کند ذہن سمجھتے تھے حصول علم کے لیے خود ان کے پاس حاضر ہوتے تھے اور اسے اپنے لیے اعزاز تصور کرتے تھے۔

خواتین بحیثیت ماہر مضمون

خواتین نے دوسروں کو تعلیم دینے کے ساتھ ساتھ خود بھی مختلف علوم کی تحصیل کا سلسلہ جاری رکھا اور اسی محنت کے سبب انہوں نے مختلف مضامین میں وہی مہارت حاصل کر لی جو مرد حاصل کرتے جا رہے تھے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں ایسی خواتین خاصی معقول تعداد میں تھیں جنہوں نے فقہ۔ تفسیر۔ فتاویٰ علم الفرائض خطابت۔ علم اسرار۔ علم تعبیر اور ادب اور شاعری میں خصوصی مقام حاصل کر لیا تھا۔ فتاویٰ کے شعبے کا جائزہ لیا جائے تو حضرت عائشہؓ سر فہرست نظر آتی ہیں۔ ان کے فتاویٰ کی تعداد سب سے زیادہ ہے۔ فقہ میں کمال اور مہارت حاصل کرنے والی خواتین میں حضرت صفیہؓ۔ حضرت حفصہؓ۔ ام حبیبہؓ۔

---

[۱] ایضاً

[۲] ڈاکٹر احمد شلبی۔ تاریخ تعلیم و تربیت اسلامیہ۔ مترجم محمد حسین خان زبیری۔ ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور۔ ۱۹۶۳ء

حضرت جویریہ رضؓ، حضرت میمونہ رضؓ، حضرت فاطمہ زہراؓ، حضرت ام شریک رضؓ، حضرت ام عطیہ حضرت اسماء بنت ابوبکر رضؓ، حضرت لیلیٰ بنت قائف، خولہ بنت تویت، ام الدرداء رضؓ عاتکہ بنت زید رضؓ، سہلہ بنت سہیل، فاطمہ بنت قیس، زینب بنت ابو سلمہ، ام ایمن ام یوسف اور ام سلمی رضؓ نے اپنے شعبہ میں بڑی شہرت پائی، اسی طرح علم الفرائض میں حضرت عائشہ رضؓ، علم اسرار میں حضرت ام سلمہ رضؓ، علم خطابت میں حضرت اسماء بنت سکن اور علم تعبیر میں حضرت اسماء بنت عمیس نے کمال حاصل کیا تھا۔

عہد نبویؐ میں خواتین نے صرف دینی علوم ہی میں مہارت حاصل نہیں کی بلکہ طب، ادب، شاعری اور تاریخ میں بھی نام حاصل کیا۔ طب کے شعبے میں حضرت رفیدہؓ کے علاوہ حضرت ام مطاع، ام کبشہ، حمنہ بنت جحش، معاذہ، امیمہ، ام زیاد، ربیع بنت معوذ، ام عطیہ اور ام سلیم کو یہ اعزاز حاصل ہوا کہ انہوں نے طب میں خصوصی مہارت حاصل کی۔ طب کے علاوہ ادب اور شاعری کا شعبہ بھی خواتین کی دسترس میں رہا۔ اچھی شاعرات میں حضرت سعدی، صفیہ، ہند بنت حارث، زینب بنت عوام، عاتکہ بنت زید، ہند بنت اثاثہ، کبشہ بنت رابع، میمونہ، رقیہ زیاد، عاتکہ اور امامہ کو نمایاں مقام حاصل تھا۔ حضرت خنساؓ اس دور کی صاحب دیوان شاعرہ تھیں [1]۔ عہد نبویؐ کی خواتین میں علم وفضل اور درس وتدریس کے حوالے سے سب سے نمایاں مقام حضرت عائشہ رضؓ کو حاصل تھا۔ ان کا شمار اس عہد کی مجتہد صحابیات میں ہوتا ہے۔ آپ سے متعلق آپ کے ایک شاگرد حضرت عروہؓ بن زبیر کا قول تھا کہ انہوں نے قرآن، فرائض، حلال وحرام، فقہ، شاعری، طب، عرب کی تاریخ اور علم نسب میں حضرت عائشہ رضؓ سے بڑھ کر اور کوئی عالم نہیں دیکھا [2]۔ اس عہد کی خواتین کی تعلیم وتربیت میں حضرت عائشہ کا بہت دخل رہا تھا آپ حج کے دنوں میں اپنا خیمہ پہاڑ کے دامن میں نصب کراتی تھیں تاکہ خواتین عرب اپنی معلومات میں اضافہ کے لیے بلا تکلف آپ سے رجوع کریں [3]، اس طرح آپ نے ایام حج میں بھی خواتین کے لیے محفوظ اور علیحدہ عارضی درسگاہ کا انتظام کر رکھا تھا۔

---

[1] مولانا سعید انصاری، سیر الصحابیات، معارف اعظم گڑھ، طبع چہارم ۱۹۵۲ء

[2] ایضاً صفحات ۲۸-۲۷

[3] محمد طفیل۔ نقوش، رسول نمبر جلد ۳، ادارہ فروغ اردو۔ لاہور ۱۹۸۴ء صفحہ ۴۰،

حضور صلی اللہ علیہ وسلم بذات خود خواتین کو تعلیم دیتے تھے بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تو ان کی سہولت کے لیے ہفتہ میں ایک دن مخصوص کر رکھا تھا اور اس دن صرف خواتین ہی حصول علم کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوا کرتی تھیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تقلید میں خود آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات ہی میں مختلف صحابیات نے بھی یہ مشن جاری رکھا اور حصول علم اور اشاعت علم کا دوہرا فریضہ ادا کرتی رہیں۔ بے شمار روایات اور حوالے اس حقیقت کی توثیق کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خواتین کو تعلیم حاصل کرنے سے منع نہیں فرمایا بلکہ انہیں حصول علم کے زیادہ سے زیادہ مواقع فراہم کیے گئے۔ خواتین کی تعلیم کے بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قول اور عمل کی یکسانیت اور تصدیق کے بعد اس موضوع پر مزید بحث کی گنجائش باقی نہیں رہتی کیونکہ اللہ تعالیٰ کا واضح ارشاد ہے کہ

وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا (الحشر پ - ۲۸) (۵۹-۷)

اور رسول کریم جو تمہیں عطا فرمادیں وہ لے لو اور جس سے تمہیں روکیں تو رک جاؤ۔

باب ١٠

تعلیم کا نظم و نسق

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں مملکت کے امور چلانے کے لیے باقاعدہ عمال کا تقرر ہوا کرتا تھا۔ پوری مملکت کو انتظامی سہولت کے اعتبار سے کئی صوبہ جات میں تقسیم کر دیا گیا تھا اور مدینہ کو اس مملکت کے صدر مقام کی حیثیت حاصل تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس مملکت کے منتظم اعلیٰ تھے اور مختلف صحابہ کرام کو صوبوں کا انتظام یا دیگر معاملات حوالے کیے گئے تھے۔ اسلامی دنیا کی اس پہلی مملکت کا قیام جسے چلانے کے لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بہت کم عرصہ ملا انتظامی اعتبار سے ایک متوازن بنیاد فراہم کرتا ہے جس میں انتظام و انصرام کے ذریعہ ریاست کے باشندوں کے مسائل اور ان کی ضروریات کی تکمیل کا ایک منفرد طریقہ کار سامنے آتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں انتظام مملکت کے لیے مختلف شعبوں اور محکموں کی اتنی واضح تقسیم نہیں ہوتی تھی جتنی آپ کے وصال کے بعد خصوصاً حضرت عمر فاروق رض کے عہد میں ہوئی۔ اس کا مطلب یہ نہیں لیا جا سکتا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھی منتظم اس نوعیت کی صلاحیت نہیں رکھتے تھے بلکہ اصل سبب یہ تھا کہ ابتداً اسلامی مملکت بہت محدود رقبے پر قائم تھی اور اس میں آبادی کا دباؤ اتنا زیادہ نہیں تھا کہ اسے کنٹرول کرنے یا مسائل کو حل کرنے کے لیے محکمہ جاتی تقسیم کی ضرورت محسوس ہوتی۔ ہر آدمی براہ راست آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے مل سکتا تھا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہمہ وقت لوگوں کی دیکھ بھال کی ذمہ داری بطریق احسن پوری کر رہے تھے۔ محکمہ جاتی تقسیم نہ ہونے کے باوجود آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں بد انتظامی یا بدعنوانی کا کوئی ایسا واقعہ رونما نہیں ہوا جس سے اس عہد کے انتظامی ڈھانچے میں کسی کمی یا خرابی کا احساس ہوتا۔ بعد میں جیسے جیسے مسلمانوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا اور مملکت کی سرحدیں پھیلتی گئیں نظم مملکت چلانے والوں کو دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا انہی مشکلات

کی وجہ سے مملکت میں کئی محکمے قائم کیے گئے اور امور مملکت کے انتظام کا ایک ایسا سسٹم وضع کر دیا گیا جس سے آج کے متمدن معاشرے بھی استفادہ کرتے ہیں۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں تعلیم کا الگ محکمہ قائم نہیں کیا گیا تھا بلکہ سربراہ مملکت یا مختلف صوبوں اور علاقوں کے عمال براہ راست تعلیم کے ذمہ دار قرار دیئے گئے تھے۔ اس طرح دیکھا جائے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں ہی تعلیمی نظم و نسق کا ایک انداز فروغ پانے لگا تھا۔ عمال حکومت کو براہ راست اشاعت علم اور فروغ علم کی ذمہ داریاں تفویض کر کے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تعلیم میں ایک غیر محوری (Decentralised) نظام کی بنیاد فراہم کر دی تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ دینی اور انتظامی ہر دو اعتبار سے مرکزی حیثیت رکھتے تھے اس لیے ابتداً ایسا ضرور ہوا کہ بہت سے معاملات براہ راست آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی تعلیمات اور ارشادات کے حوالے سے طے کیے گئے۔ تعلیم کے مقاصد اور نصاب کا تعین براہ راست آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی نے کیا اس طرح ابتدا میں مرکز نے صوبوں کے لیے تعلیمی نظم و نسق کی راہیں متعین کرنے میں اہم کردار ادا کیا یہ کیفیت صرف اس لیے موجود رہی کہ دنیا میں اسلام کا تصور آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے ذریعہ پھیلا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو انتظامی عہدے کے برعکس مذہبی اور روحانی اعتبار سے پیغمبر کا جو منصب عطا ہوا تھا اس کی وجہ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم دوسروں سے اعلیٰ اور افضل تھے۔ (آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد صحابہ کرام اور اس کے بعد کے ادوار میں تعلیمی نظم و نسق میں مرکز کی مداخلت قطعی نہیں رہی بلکہ خود آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی صرف ان کی رہنمائی کے لیے مختلف اقدامات تجویز کیے تھے) آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی رہنمائی کے باعث اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ ابتدائی دور میں تمام وضاحتوں اور تشریحات کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی سب سے بڑی اتھارٹی تھے تب بھی یہ کہا جا سکتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں تعلیمی انتظام و انصرام در اصل غیر محوری اور محوری دونوں طریقوں کا تھا۔ یہ دونوں طریقے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات تک جاری رہے اور اس کے بعد چونکہ مرکز میں اتھارٹی یا سند موجود نہیں رہی تھی صرف انتظامی سربراہ موجود رہتے تھے اس لیے وہ نظام غیر محوری ہو کر رہ گیا۔ تعلیم کے فروغ اور اشاعت کے ساتھ ساتھ وسائل اور دیگر تمام امور براہ راست مختلف عمال حکومت

(صوبوں یا علاقوں کے نگراں) کے حوالے کر دیئے گئے تھے یہ سب کچھ انہی کی صوابدید پہ منحصر تھا کہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بتائے ہوئے طریقوں پر ریاست کے شہریوں کی تعلیم کے لیے مختلف انتظامات اور سہولتیں فراہم کریں۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں تعلیم عام کرنے تعلیمی ادارے قائم کرتے اور انہیں چلانے کی ذمہ داریاں اور ان کے انتظامی اختیارات مختلف علاقوں اور ان کے منتظمین کے پاس تھے۔ البتہ بنیادی اصولوں اور معاملات کا تعین کرنے کے لیے وہ لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے رہنمائی حاصل کرتے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بذات خود تعلیمی اداروں کے قیام کے ساتھ ساتھ ان کی نگرانی اور معائنہ • Inspection and supervision کا طریقہ بھی رائج کیا اور ایک روایت کے مطابق آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے الگ سے ایک ناظر تعلیمات Inspector of Education کا تقرر فرمایا۔ مشہور مورخ طبری نے گیارہ ہجری کے واقعات بیان کرتے ہوئے یمن میں ناظر تعلیمات کے تقرر کی تصدیق کی ہے۔ خیال ہے کہ مملکت کے دوسرے علاقوں کے بارے میں بھی ایسے ہی انتظامی فیصلے کیے گئے ہوں گے[1]۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تعلیم حاصل کرنا سب کے لیے فرض قرار دیا تھا اور اس فرض کی ادائیگی کو یقینی بنانے کے لیے یہ ضروری تھا کہ لوگوں کے لیے درسگاہوں کے قیام اور ان میں درس و تدریس کے مواقع فراہم کیے جائیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مسئلے کو اسی طرح انسانی بنیادوں پر حل کیا اور انتظام مملکت میں اس امر کی گنجائش رکھی کہ لوگوں کو تعلیم دینے کے لیے انتظامیہ اپنے تمام فرائض بخوبی ادا کر سکے۔ ابتدا میں مساجد اور ان سے ملحق درسگاہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نگرانی ہی میں قائم ہوئیں اس طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تعلیم عام کرنے کے بنیادی اصول پر خود ہی عمل کرنا شروع کیا ان اداروں میں درس و تدریس اور دیگر مسائل کی دیکھ بھال کے لیے ناظر تعلیمات کے تقرر کے علاوہ یہ شہادت بھی ملتی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم بذات خود تعلیمی اداروں کا معائنہ فرماتے تھے (تعلیم کی اہمیت اور افادیت کا اندازہ اس ایک روایت ہی سے لگایا جا سکتا ہے جس کے مطابق مملکت کے سربراہ براہ راست تعلیم و تدریس کی نگرانی کے

---

[1] محمد حمید اللہ، عہد نبوی کا نظام حکمرانی (جلد اول)، مکتبہ ابراہیمیہ۔ حیدرآباد دکن بار دوم ۱۹۴۹ء، صفحہ ۲۲۶

لیے وقت نکالا کرتے تھے) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس ادارے کا ایک بار سے زائد معائنہ فرمایا وہ مسجد قبا سے وابستہ تھا جو مسجد نبوی سے تقریباً ڈھائی میل کے فاصلے پر قائم تھی۔ حوالے یہی ملتے ہیں کہ آپ اس ادارے کے معائنے کے لیے کئی دفعہ گئے (بحوالہ ابوداؤد۔ کتاب المرسل، عینی شرح بخاری ج۔۲۔ص ۴۶۸) مسجد قبا کے علاوہ مسجد نبوی کی مرکزی درسگاہ براہ راست آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نگرانی میں کام کرتی تھی اس لیے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تعلیم و تدریس کے انتظام پر ذاتی توجہ دی اور تعلیمی اداروں کے معاملات کا خود جائزہ لیا۔

درسگاہوں کے مالی امور

جس طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دور کے واقعات اور مختلف شہادتوں کے حوالے سے تعلیمی نظم و نسق کا کوئی الگ سے نظام نہ ہونے کے باوجود ایک مجموعی تاثر بالکل وضاحت سے سامنے آجاتا ہے ایسے ہی اس دور کی درسگاہوں (تعلیمی اداروں) کے مالی معاملات بھی عیاں ہوجاتے ہیں۔ بالکل ابتدائی دور میں تو مسلمان خود بھی مالی اعتبار سے بہت کمزور تھے انہوں نے مختلف نوعیت کے کام کیے جن میں گلہ بانی سے لے کر محنت مزدوری تک سب ہی شامل تھا انہوں نے اس طرح جو کچھ کمایا اور پس انداز کر سکے وہ اپنی اور دوسروں کی ضروریات کی تکمیل پر صرف کر دیا۔ مسلمانوں میں جو چند متمول افراد تھے انہوں نے بھی اپنی دولت کا بہترین مصرف یہی نکالا کہ اسے ضرورت مندوں کی حاجتیں پوری کرنے کے لیے صرف کر دیا۔ کچھ دنوں بعد جب مسلمان مستحکم ہونے لگے تو ان کی مالی حیثیت اور اثاثوں میں بھی اضافہ ہونے لگا بعد میں بیت المال Treasury قائم کر دیا گیا جہاں تمام رقومات اور اثاثے جمع کر دیئے جاتے تھے اس طرح مالی اعتبار سے ایک مستحکم نظام تشکیل پاتا گیا۔ جب مسلمانوں کی پہلی باقاعدہ درسگاہ (مسجد نبویؐ) قائم ہوئی اس وقت اس نوعیت کا کوئی ادارہ موجود نہیں تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اپنے اصحاب کی مدد سے اس عمارت کی تعمیر کی بعد میں جب

---

[۱] ایضاً صفحات ۲۱۰ - ۲۱۵

درسگاہوں کے قیام کا سلسلہ دراز ہوا تب بھی حصول علم اور عبادات کی اہمیت کے پیش نظر مختلف علاقوں کے رہنے والوں نے خود ہی یہ درسگاہیں قائم کرنا شروع کر دیں، اس ضمن میں ان کے سامنے سب سے نمایاں مثال آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تھی جنہوں نے درسگاہ کے قیام میں پہل کی اور اس طرح صاحب استطاعت لوگوں سے لے کر عام لوگوں تک سب ہی کو اس کام کی جانب مائل کیا۔ جو درسگاہیں قائم ہوتی گئیں ان کے مالی اخراجات (جو کچھ بھی تھے) وہ عام لوگوں کے ذمے نہیں تھے بلکہ وہ افراد جو مالی اعتبار سے مستحکم تھے اس سلسلے میں خود ہی پیش پیش رہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں یہ سارے اخراجات رضا کارانہ طور پر کیے گئے اور اس کا محرک دراصل حصول علم اور اشاعت علم کا وہ جذبہ تھا جس کے لیے لوگوں نے قربانیاں دیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں ٹیکسوں کا نظام بھی رائج نہیں تھا البتہ مختلف ذرائع (جزیہ اور تاوان) سے جو آمدنی ہوتی تھی اسے تحفظ اور فلاحی کاموں میں صرف کیا جاتا تھا اس امر کے شواہد نہیں ملتے کہ درسگاہیں قائم کرنے کے لیے الگ سے فنڈ مقرر کر دیئے گئے تھے یہ تمام انتظامات نہ ہونے کے باوجود ایک ایسا سسٹم وضع کر دیا گیا تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں کوئی ایک شہادت بھی ایسی نہیں ملتی جس سے یہ اندازہ ہو کہ مالی وسائل نہ ہونے کی وجہ سے کسی ادارے کو بند کرنا پڑا ہو۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد کی سب سے پہلی باقاعدہ درسگاہ مسجد نبوی کے قیام اور اس کی تعمیر کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کی تعمیر مسلمانوں نے اپنی مدد آپ کے تحت کی تھی اس کام میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ایک فرد کی حیثیت سے اپنے فرائض پورے کیے بلکہ باقی افراد کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ انداز بہت بڑا محرک بنا اور چونکہ وہ اسلام کی تعلیمات سے متاثر ہو کر آپ کی سرکردگی میں جمع ہوئے تھے اس لیے انہوں نے اپنے عمل اور قول سے آپ کا ساتھ دیا۔ اس طرح یہ کہا جا سکتا ہے کہ مسجد نبوی کا قیام براہ راست آپ ہی کا کام تھا یہاں درس و تدریس سے وابستہ افراد کی کفالت براہ راست آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذمے تھی۔ گو کئی صحابہ کرام اس سلسلے میں خود بھی پہل کرتے تھے۔ لیکن اس ادارے کے اساتذہ اور طلبہ کے اخراجات کی ذمہ داری آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی نے قبول کر رکھی تھی (مذہبی اور مملکتی اعتبار سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ سب سے

زیادہ اختیارات رکھتے تھے۔ اسی لیے سب سے زیادہ ذمہ داری آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے لیے قبول کی۔ اختیارات کے اعتبار سے معاشرہ کے جو افراد جس حیثیت کے حامل ہوں اسلام میں ان پر ذمہ داری بھی اسی قدر عائد ہوتی ہیں۔ یہی اسلام کا وہ نظام ہے جو اسے دوسرے مذاہب سے مختلف بناتا ہے اور اسی انداز پر اس میں تعلیم کی اشاعت اور انتظام کی ذمہ داری تقسیم ہوتی تھی)۔ مسجد نبوی میں کام کرنے والے بہت سے اساتذہ کوئی مالی مدد نہیں لیتے تھے بلکہ وہ خود محنت مزدوری کرکے دوسروں کی مدد بھی کیا کرتے تھے۔ دراصل اس دور میں تدریس نے کل وقتی پیشہ Full time job کی حیثیت اختیار نہیں کی تھی بلکہ اور کاموں کے ساتھ جز وقتی طور پر درس و تدریس کا کام بھی کیا جاتا تھا۔ اسی لیے بہت سے اساتذہ کو مالی امداد یا معاوضہ کی ضرورت نہیں پڑتی تھی (کل وقتی اور جز وقتی اصطلاحات سے یہ مطلب اخذ نہیں کیا جاسکتا کہ اسلام کے ابتدائی دور میں اساتذہ پر اخراجات نہیں ہوتے تھے یا وہ تعلیمی ادارے جو مسجد نبوی کے بعد قائم ہوئے بغیر کسی خرچ کے چلا کرتے تھے۔ بلکہ بعد میں قائم ہونے والے اداروں میں تو کئی معلمین ایسے بھی تھے جو ضعیفی یا اپنی بہت زیادہ مصروفیات کے سبب کوئی دوسرا کام نہیں کر پاتے تھے) بعد میں جب اداروں میں اضافہ ہونے لگا تو کئی افراد بحیثیت معلم ان اداروں سے مستقلاً وابستہ ہو گئے کئی معلمین ایسے بھی تھے جو حکومت کے مختلف عہدوں پر فائز تھے۔ انہیں چونکہ حکومت سے باقاعدہ مشاہرہ ملتا تھا اس لیے معلمی کے لیے الگ سے معاوضہ نہیں دیا جاتا تھا۔ اس نوعیت کی چند مثالوں کو دیکھا جائے تب بھی یہی تاثر لیا جاسکتا ہے کہ اساتذہ اور ان کے مشاہروں کی ادائیگی مملکت ہی کی ذمہ داری تھی اور وہ اپنے مختلف ذرائع آمدنی سے یہ ضروریات پوری کرتی تھی۔

معلمین اور متعلمین کی مالی ضروریات کی تکمیل کی تصدیق سن الوفود سے بھی ملتی ہے اس سال بہت سے افراد نے مختلف اوقات میں اسلام قبول کرنے کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے رابطہ قائم کیا تھا۔ وہ جب تک مدینے میں مقیم رہے ان کی رہائش اور کھانے کا انتظام آپ ہی کے ذمے تھا۔ واپس جاتے وقت ان وفود کو جو درحقیقت اسلام کی تعلیم حاصل کرنے آئے تھے معقول مالی امداد دی گئی تاکہ وہ واپسی میں کسی قسم کی مالی دشواری کا شکار نہ ہوں اور آرام سے اپنے گھروں تک پہنچ جائیں۔ اس حوالے سے تعلیم حاصل کرنے والوں کی کفالت اور ان کے ضروری اخراجات پورے کرنے میں مملکت اور انتظامی سربراہوں

کی ذمہ داریوں کا اندازہ ہوتا ہے ۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں متعلمین کو مالی امداد یا حقوق اور مراعات دینے کی شہادتیں بھی ملتی ہیں ۔ کئی وفود ایسے تھے جنہیں مراعات کی تحریری اسناد دی گئی تھیں[1] ایسے وفود کے ساتھ مزید سکھانے کے لیے معلمین کی ایک جماعت بھی روانہ کی جاتی تھی جس کے اخراجات کم از کم ان لوگوں کے ذمے نہیں لگائے جاتے تھے جو ان سے علم حاصل کرنا چاہتے تھے ۔ اس نوعیت کی تمام مالی اعانتوں اور تحریری مراعات اور فوائد کا اعلان اور ادائیگی کی ذمہ داری حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی پر ہوتی تھی عام لوگ (جو تعلیم حاصل کر رہے ہوں یا تعلیم دے رہے ہوں) ان پر کسی قسم کا مالی بوجھ نہیں ڈالا جاتا تھا ، درسگاہیں چلانے کے لیے نہ متعلمین سے فیس لی جاتی تھی اور نہ ہی ان کے والدین سے تعلیمی اخراجات کی مد میں کوئی ٹیکس وصول کیا جاتا تھا ، بلکہ یہ سو فیصدی امور مملکت چلانے والوں کی ذمہ داری تھی کہ تعلیمی ادارے قائم کریں ان کے اخراجات کے لیے مالی امداد فراہم کریں اور معلمین اور متعلمین کو یکسوئی سے اپنا کام کرنے کے لیے مناسب حالات اور ماحول فراہم کریں ۔

داخلوں کی عام اجازت

اسلامی تعلیمات کے عین مطابق حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی تعلیم سب کے لیے عام کی تھی اس معاملے میں کسی کے ساتھ کوئی امتیاز نہیں برتا گیا بلکہ وہ لوگ جو حصول علم کے لیے آگے بڑھے انہیں وسائل اور مواقع فراہم کیے گئے ۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تعلیم کے معاملے میں غریبوں اور امیروں سے برابر کا سلوک کرنے کی ہدایت[2] دے کر مسلمانوں میں تعلیم کے لیے سیاسی منصب اور معاشی اور معاشرتی حیثیت کے حوالے سے تفریق کو بالکل ختم کر دیا ۔ حصول علم کے معاملے میں غریب اور امیر تو درکنار غلام اور آزاد افراد میں بھی فرق نہیں رکھا گیا تھا ۔ منصب اور حیثیت کی تفریق اور امتیاز سے بالاتر ہو کر سب کو حصول علم کے مواقع فراہم کرنا مملکت کی ذمہ داری تھی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دور میں جس حد تک تعلیم کی اشاعت کی وہ سب اسی خصوصیت کے مطابق تھی ۔ تمام

---

[1] سید امیر علی : اسپرٹ آف اسلام ، مترجم محمد ہادی حسین ۔ ادارہ ثقافت اسلامیہ ۔ لاہور طبع سوم ۱۹۸۴ء ، صفحہ ۱۹۶

[2] ڈاکٹر احمد شلبی : تاریخ تعلیم و تربیت اسلامیہ ۔ مترجم محمد حسین خان زبیری ۔ ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور ۱۹۶۳ء ، صفحہ ۳۰۴

لوگوں کو تعلیم کے مواقع فراہم کرنے کی پالیسی سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس اصول کی نشاندہی بھی ہوتی ہے کہ منتظمین اور معلمین دونوں کا یہ فرض ہے کہ تعلیم کے معاملے میں سب سے یکساں سلوک کریں کسی پر تعلیم کے دروازے بند کرنا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کے قطعی برعکس ہے اور دراصل یہ عمل اس فرد کو اپنے بنیادی فرائض کی بجا آوری سے روکنے کے مترادف ہے۔

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں اس حقیقت کے باوجود کہ تعلیم عام کرنے کے لیے ہنگامی بنیادوں پر کام کیا جا رہا تھا کہیں بھی کوئی ایسا ثبوت نہیں ملتا کہ طلبا کا کوئی ریکارڈ مرتب کیا جاتا ہو یا کسی مقررہ وقت میں انہیں داخلے لینے کا پابند کیا گیا ہو۔ اس دور میں نہ تعلیمی اداروں میں تدریسی اوقات کا بہت واضح تعین تھا اور نہ ہی متعلمین کے لیے عمر کی کوئی حد مقرر کی گئی تھی۔ یہ تمام احتیاطی تدابیر اور منصوبہ بندی نہ ہونے کے باوجود تعلیمی سہولتیں اپنی جگہ پر موجود تھیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس طرح اسلام قبول کرنے کے معاملے میں کسی ذات قبیلے خاندان یا قوم کو دوسروں پر فوقیت نہیں دی تھی اسی طرح تعلیم کے معاملے میں بھی کسی کو کسی پر ترجیح نہیں دی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ انداز اللہ تعالیٰ کے ارشادات کے عین مطابق تھا۔ اللہ تعالیٰ نے جاننے والوں (متعلمین) کے حقوق کا تحفظ کرتے ہوئے ان سے امتیاز نہ برتنے اور ان سب پر خصوصی توجہ دینے کی ہدایت فرمائی۔ ایک بار حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عبداللہ ابن مکتومؓ نے کچھ معلوم کرنے کے لیے رجوع کیا۔ عین اسی وقت کسی قبیلے کے ایک سرکردہ آدمی نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے گفتگو شروع کر دی۔ موضوع کی نوعیت ایسی تھی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس آدمی سے گفتگو کرنے لگے اور اس نابینا صحابی (عبداللہ ابن مکتومؓ) پر خاطر خواہ توجہ نہ دی جسے اس صحابی نے محسوس کیا۔ اسی کے حوالے سے قرآنی آیت نازل ہوئی جس میں سب کے ساتھ مساوی سلوک کرنے کے اصول کا اعادہ کیا گیا۔ غرض آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں تعلیم حاصل کرنے کے لیے تمام لوگوں کو یکساں مواقع فراہم کیے گئے اور اس طرح مملکت کے سربراہ کی حیثیت سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تعلیم عام کرنے کی ذمہ داری بھی بحسن و خوبی سرانجام دی۔

اساتذہ کو آزادانہ تحقیق کی اجازت

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حصول علم اور اشاعت علم دونوں کو کچھ اس طرح مربوط کر دیا تھا کہ وہ لوگ جو علم حاصل کر لیتے ان پر خود بخود یہ فرض عائد ہو جاتا کہ وہ اسے دوسروں تک منتقل کریں۔ اور اس طرح تعلیم عام کر کے لوگوں کے لیے زیادہ سے زیادہ آسانیاں پیدا کریں۔

حصول علم کی منزل تک انسان مختلف مراحل میں پہنچتا ہے۔ کیونکہ کچھ جاننے کے بعد مزید جاننے کا اشتیاق بڑھتا ہے اور اس طرح حصول علم کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ علم اللہ کی نعمتوں میں سے وہ واحد نعمت ہے جس سے انسان کبھی سیر نہیں ہوتا۔ اگر کسی میں تھوڑا سا جاننے کے بعد مزید جاننے کی جستجو نہ ہو تو اس کا یہی مطلب لیا جا سکتا ہے کہ اس نے جو کچھ سیکھا ہے وہ اس قابل نہیں ہے کہ اس سے دوسروں کو فائدہ پہنچایا جا سکے اس کیفیت میں جاننے کا سلسلہ منقطع ہو جاتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کے مطابق علم حاصل کرنا اور اس میں اضافہ کرتے رہنا دراصل علم کو ایک مسلسل عمل Continuous process ظاہر کرتا ہے۔ یہ عمل اس وقت سے شروع ہوتا ہے جب انسان دنیا میں آتا ہے اور اس وقت تک جاری رہتا ہے جب تک انسان دنیا میں موجود ہے۔ علم کا یہ سلسلہ لامتناہی ہے اور اس میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ حضرت جابر رضؓ کی ایک روایت کے مطابق [1] آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ (حدیث)

تقوے کی ایک کان یہ بھی ہے کہ جو علم تمہارے پاس ہے اس کے ذریعے وہ علم حاصل کرو جو تمہارے پاس نہیں ہے یہ علم کا نقص ہے کہ اس میں اضافے کا خیال نہ ہو مزید علم کی خواہش نہ ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ آدمی اپنے علم سے فائدہ نہیں اٹھا رہا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے جو علم "انسان کے پاس ہے" اور جو علم "انسان کے پاس نہیں ہے" دو الگ الگ کیفیتوں کا اظہار ہوتا ہے ان دونوں کو کسی بھی زاویہ سے دیکھا جائے تو یہی بات واضح ہوتی ہے کہ حصول علم کی جستجو جاری رکھی جائے اور اپنی عقل کے ذریعے دنیا کے

---

[1] ابن عبدالبر اندلسی؛ جامع بیان العلم و فضلہ: مترجم عبدالرزاق ملیح آبادی۔ العلم و العلما۔ ادارہ اسلامیات لاہور، پہلی بار [illegible] صفحہ ۶۷

مزید علوم اور اسرار حاصل کیے جائیں۔ کیونکہ حصول علم کا سلسلہ کہیں ختم نہیں ہوتا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں اہل علم اسی اصول پر عمل کرتے رہے اس لیے کہ ان کے مزید جاننے اور تحقیق کرنے پر کوئی پابندی نہیں تھی۔

عہد نبوی ﷺ کے کئی معلمین کو باقاعدہ مملکت کی طرف سے درس و تدریس کے لیے مقرر کیے جانے کا تذکرہ پہلے ہی کیا جا چکا ہے اسی دور میں کئی معلمین ایسے بھی تھے جنھوں نے رضاکارانہ طور پر یہ کام شروع کیا تھا۔ ان سب لوگوں کے درمیان کسی قسم کی تفریق نہیں تھی سب اپنے اپنے شعبہ میں کام کرنے کے ساتھ ساتھ اپنی انفرادی حیثیت بھی رکھتے تھے انہیں ریاست کے منتظمین (ماسوائے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) کے ہدایت ناموں کے برعکس درس و تدریس اور اشاعت علم سے زیادہ دلچسپی تھی وہ جو کچھ پڑھاتے تھے پہلے اس کی تصدیق کر لیتے تھے اور جب کسی بات پر ان کا اپنا یقین مستحکم ہو جاتا تھا تب ہی وہ اسے دوسروں تک منتقل کرتے تھے اسی دور سے مسلمانوں میں خصوصاً درس و تدریس کے شعبے میں یہ اصول رائج ہوا کہ معلمین بغیر تحقیق و تصدیق کیے کسی بھی قسم کی معلومات متعلمین تک نہیں پہنچاتے تھے۔ یہ اصول مسلمانوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی سے سیکھا تھا۔ علم کے معاملے میں ان کی یہ خصوصیت اس وقت مزید نمایاں ہوئی جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد احادیث جمع کرنے کا سلسلہ شروع ہوا۔ ہر حدیث کے ایک ایک لفظ کے بارے میں اتنی تحقیق کی گئی اور ایسے ایسے طریقے اختیار کیے گئے کہ موجودہ عہد کے سائنسی انداز تحقیق کی بھی رہنمائی ہوتی ہے لوگوں نے مہینوں ایک حدیث کے راویوں کی تلاش کے لیے ہزاروں میل کی مسافتیں طے کیں ان افراد کے ثقہ اور معتبر ہونے کے لیے مختلف حوالے تلاش کیے اور پھر یہ جائزہ لیا کہ جو بات حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے منسوب کی جا رہی ہے وہ قرآنی تعلیمات اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ سے کس درجہ مماثلت رکھتی ہے بہت سے مواقع ایسے بھی آئے جب کئی باتوں کو تسلیم کرنے سے انکار کیا گیا۔ اس طویل تحقیقی سفر میں صحابہ کرام نے ریاست کی سرپرستی یا مالی معاونت پر انحصار نہیں کیا بلکہ بہت سے لوگوں نے اپنے وسائل سے یہ ساری کاوشیں پایہ تکمیل کو پہنچائیں۔ اس تحقیق میں شہادتوں اور حوالوں کے ساتھ ساتھ غور و فکر کو بھی اہم مقام حاصل رہا۔ تحقیق و تجزیہ کے اس مسلسل عمل کے پس پردہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد سب سے بڑا محرک تھا جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر سنی سنائی بات کو بغیر

تحقیق کیے آگے بیان کرنے والوں کو جھوٹا قرار دیا تھا۔ یہی انداز تحقیق تھا کہ بخاری نے ۸۷۰ء میں جب احادیث کی ترتیب مکمل کی تو کم و بیش چھ لاکھ احادیث میں سے بمشکل تمام سات ہزار تین سو اٹھانوے کا انتخاب کیا۔[1]

تحقیق اور پھر آزادانہ تحقیق مسلمانوں کا طرہ امتیاز رہی ہے انہوں نے ہر اس شے یا خیال کے بارے میں جو ان کی نظر یا ذہن کے سامنے آئے غور و فکر کر کے کسی نتیجے پر پہنچنا ضروری سمجھا۔ اللہ تعالیٰ نے بھی انسانوں کو اس امر کی اجازت دی ہے بلکہ اس اجازت کو علانیہ دعوت کہا جائے تو زیادہ مناسب ہوگا۔ انسانوں کے ذہنوں پر پابندی عائد کرنا نہ اللہ تعالیٰ کا منشا رہا ہے اور نہ ہی حضور اکرم نے اس قسم کی تعلیم دی تھی۔ مسلمانوں کو کائنات کی تمام اشیاء (نمایاں یا پوشیدہ) کے بارے میں جاننے کے لیے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ (القرآن)

اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ ۝ الَّذِیْنَ یَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِیٰمًا وَّ قُعُوْدًا وَّعَلٰی جُنُوْبِهِمْ وَیَتَفَكَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ

(آل عمران پ ۴ ر ۲۰: ۳۔ $\frac{190}{191}$)

بے شک آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے میں اور رات اور دن کے بدلتے رہنے میں (بڑی) نشانیاں ہیں اہل عقل کے لیے وہ عقل مند جو یاد کرتے ہیں اللہ تعالیٰ کو کھڑے ہوئے اور بیٹھے ہوئے اور پہلوؤں پر لیٹے ہوئے اور غور کرتے ہیں آسمانوں اور زمین کے پیدائش میں۔ (اور تسلیم کرتے ہیں)

غور و فکر کرنا اور ان تمام اشیاء کے بارے میں جاننا جو اللہ تعالےٰ نے تخلیق کی ہیں ایک مستحسن عمل ہے اور وہ لوگ جو اللہ تعالیٰ کی حاکمیت کو تسلیم کرتے ہیں انہیں بھی اس بات کی اجازت ہے کہ وہ کائنات کی تمام چیزوں اور باتوں کے بارے میں سوچیں (یقیناً وہ جتنا غور و فکر کریں گے حقائق کو اتنا ہی زیادہ جلد اور بہتر طور پر سمجھنے لگیں گے) انسانوں کو غور و فکر کی دعوت اللہ تعالیٰ نے خود دی ہے بلکہ جو کچھ زمینوں اور آسمانوں میں ہے اس کی تسخیر کی نوید بھی دی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے کہ (القرآن)

وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا مِّنْهُ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَفَكَّرُوْنَ ۝

(الجاثیہ۔ پ ۲۵) ر ۵: ۱۳)

---

[1] Robert Gullick : Mohammad the Educator : Islamic Culture Lahore - P.P - 10-11

اور اس نے مسخر کر دیا ہے تمہارے لیے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے سب کا سب اپنے حکم سے بے شک اس نظام میں نشانیاں ہے ان لوگوں کے لیے جو غور و فکر کرتے ہیں۔

غور و فکر اور تحقیق کا عمل بہرحال ایسا عمل ہے جس کے لیے مسلمانوں کو ترغیب دی گئی ہے۔ یہ عمل جب سرانجام دیا جاتا ہے اس کے نتائج مرتب کرنے کا اختیار کسی کو نہیں ہوتا یہ فعل سراسر انفرادی فعل ہوتا ہے جس میں پہلے انسان اپنی عقل اور اپنے شعور کے ذریعے حقائق کو تلاش کرتا ہے۔ اسلام انسان کی فطرت کو سمجھتے ہوئے اسے یہ موقع ہی فراہم نہیں کرتا۔ بلکہ ان لوگوں کو جو عقل و شعور سے کام نہ لیں گونگا بہرا اور اندھا قرار دیتا ہے (القرآن)

صُمٌّ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَعْقِلُونَ (۲-۱۷۰) (بقرہ، پ-۲)

گونگے بہرے اور اندھے ہیں کہ عقل سے کام نہیں لیتے۔ (ترجمہ)

گویا وہ لوگ جنہوں نے اللہ کی وحدانیت اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغام کو سمجھنے میں کوتاہی کی انہوں نے عقل سے کام نہ لیا اگر وہ ایسا کرتے (یعنی عقل سے کام لیتے) تو یقیناً گمراہ نہ ہوتے۔

قرآنی آیات اور احادیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی روشنی میں یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ اسلام تمام اہل علم کو آزادانہ تحقیق اور غور و فکر کی اجازت دیتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بذات خود اس عمل کی حوصلہ افزائی فرمائی تھی اسی لیے سیکھنے اور سمجھنے میں غیر مسلموں سے بھی استفادہ کیا گیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے غیروں کی زبانیں جاننے پر پابندی نہیں لگائی بلکہ ان کے مذاہب کے بارے میں جاننے سے بھی منع نہیں کیا تاکہ لوگ ان کا مطالعہ کریں اور پھر غور و فکر کے ذریعہ اسلام کو بہتر طور پر سمجھ سکیں۔ آزادانہ تحقیق کی اجازت مسلمانوں کے نظام تعلیم کی نمایاں خصوصیت رہی ہے۔ بعض محققین تو یہاں تک کہتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو تعلیمی نظام رائج فرمایا تھا اس میں ریاست اور انتظامیہ کی ذمہ داری ادارے قائم کرنے اور ان میں پڑھنے اور پڑھانے والوں کی ضروریات کو پورا کرنا تھی۔ اداروں کے نصاب اور دیگر علمی سرگرمیوں کے تعین کا اختیار ریاست کو حاصل نہیں تھا بلکہ یہ خالصتاً اہل علم (معلمین) کی صوابدید پر منحصر تھا۔ مسلمانوں کے نظام تعلیم کے بارے میں مندرجہ ذیل حوالے

سے بھی اس خصوصیت کی تائید ہوتی ہے [1]

In the Muslim Educational system is revealed a magnificant experiment of public enterprise, free public instructions, freedom of teaching and freedom of studies - an amazing anticipation of the most modern conception and experimentation of Education. Here the state had very little to do in the beginning and at later date it came forward only to supplement the public efforts by the diffusion and promotion of learning, and extended necessary financial support without imposing however any restriction and control in the matter of teaching.

مسلمانوں کے نظام تعلیم سے تعلیم میں نجی شعبہ کی شرکت، مفت تعلیم اور درس و تدریس میں آزادی کے بہت سے شواہد ملتے ہیں جن سے تعلیم کے انتہائی جدید تصورات اور تجربات کی تائید ہوتی ہے۔ ابتدائی دور میں اس سے ریاست کا بہت کم تعلق رہا لیکن بعد میں جب ریاست نے اس عمل میں شرکت کی تو وہ بھی صرف اس حد تک تھی کہ تعلیم و تدریس کے ضمن میں کی جانے والی عوامی کوششوں کو تقویت پہنچائی جائے اور تعلیمی اداروں کے تدریسی اور انتظامی امور میں مداخلت یا پابندی لگائے بغیر انہیں مالی امداد فراہم کی جائے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دراصل تعلیم کو لازمی قرار دے کر پوری ریاست اور عوام سب ہی کی ذمہ داری بنا دیا اس ایک اصول سے تعلیمی نظم و نسق کا تعین بھی ہو گیا اور بعد کے دنوں میں تو یہ خود بخود ایک ایسی شکل اختیار کر گیا جسے آج بھی مثالی نظام تعلیم کہا جاتا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو اصول متعین کئے ان سے مملکت میں رہنے والوں یا اس کا انتظام چلانے والوں میں سے کسی کے حقوق کی نفی نہیں ہوتی اور نہ ہی کسی پر غیر ضروری ذمہ داریاں ہی عائد ہوتی ہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکومت کے مختلف افراد کو تعلیم کی ذمہ داری بھی تفویض کی تھی لیکن انہیں علماء اور فضلاء پر برتری یا حاکمیت کا اختیار نہیں دیا تھا۔ اداروں کا قیام اور ان کے مالی معاملات جس طرح ریاست کی ذمہ داری تھے اسی طرح ریاست میں رہنے والے تمام افراد بھی ان کے ذمہ دار تھے۔

---

[1] S.N. ALATTAS : Aims and objectives of Islamic Education King Abdul Aziz University - JEDDAH - 1979 P-99

باب ۱۱

ریاست کی ذمہ داریاں

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینے میں جس اسلامی ریاست کی بنیاد رکھی تھی۔ بہت تھوڑے ہی عرصے میں اس میں اتنی وسعت پیدا ہوئی کہ اس کا رقبہ تقریباً دس لاکھ مربع میل کے علاقے تک پھیل گیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابتدا ہی سے ریاست کے انتظام کے لیے راہنما اصول اپنے عمل کے ذریعہ فراہم کر دیئے تھے۔ امور مملکت چلانے والوں کو امی لیے تعلیم کی ذمہ داریاں بھی اٹھانی پڑیں۔ اسلامی ریاست کے قیام اور اس کے طریقہ کار کے سیاسی اثرات اور اس کی بنیادوں میں تفصیل سے جائے بغیر صرف تعلیمی اور معاشرتی اعتبار سے لیا جائے تب بھی یہ بات سامنے آجاتی ہے کہ ریاست کے پروگراموں میں تعلیم و تبلیغ کو ترجیح دی گئی تھی۔ اسی ترجیح اور خصوصی توجہ کا نتیجہ تھا کہ چند ہی برسوں میں مسلمانوں کی تعداد ایک لاکھ سے زائد ہو گئی تھی جن میں تقریباً ڈیڑھ ہزار افراد تو علم اور مہارت کے اعلیٰ مقام تک پہنچ چکے تھے۔ انہیں اس دور کی اصطلاح کے مطابق علما (صاحب علم) کی حیثیت سے پہچانا جاتا تھا۔ عام پڑھے لکھے (خواندہ) افراد کی تعداد اس سے کہیں زیادہ تھی یہ اسلامی ریاست کے تعلیمی اقدامات کا نتیجہ تھا کہ ایک ایسے معاشرہ میں جہاں ظہور اسلام سے پہلے لکھنا پڑھنا جاننے والوں کی تعداد انگلیوں پر گنی جا سکتی تھی وہاں چند ہی برسوں میں ہزاروں خواندہ اور صاحب علم افراد موجود تھے۔ حصول علم اور اشاعت علم کا یہ سلسلہ اتنا دراز ہوا کہ دنیا میں آج تک کسی قوم یا قبیلہ کی تعلیمی ترقی میں اتنی تیز رفتاری کا ثبوت نہیں ملتا۔ ایک مسلمان عالم ابن حزم کے بقول (ج ۲۔ ص ۶۷) حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے صرف بارہ سال بعد (سن ۲۳ ہجری میں) جب حضرت عمرؓ کا انتقال ہوا تو مصر سے عراق۔ عراق سے شام اور شام سے یمن تک قرآن پاک کے جو نسخے تحریری

صورت میں موجود تھے ان کی تعداد ایک لاکھ سے زیادہ نہیں تھی تو ایک لاکھ سے کم بھی نہیں تھی[۱]
علم اور اشاعت علم میں اتنا بڑا انقلاب صرف تیئیس برسوں کے اندر رونما ہوا تھا جہاں قرآن
پاک کے نسخوں کی تعداد ایک لاکھ ہوگئی ہو وہاں انہیں پڑھنے والوں کی تعداد کتنی ہوگی اس کا
اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے واضح ہو کہ اس عہد میں چھاپے خانے موجود نہیں تھے اور نہ ہی
قرآن پاک مختلف دوکانوں یا اداروں میں فروخت کرنے کے لیے جمع کیے گئے تھے۔
اس دور میں تو انہیں ہاتھ سے لکھا جاتا تھا۔ اور لکھنے کا واضح مقصد انہیں پڑھنا اور ان سے
رہنمائی حاصل کرنا تھا۔

اسلام کے ابتدائی دور میں ریاست کی انتظامیہ اور عوام کے تعلقات میں جو بنیادی بات
تھی وہ عوام سے متعلق ریاست کی ذمہ داریاں تھیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نگرانی میں ایسا
نظام وضع کیا گیا تھا جس میں عام لوگوں کو امور مملکت سے الگ تھلگ ہونے یا نظر انداز
کیے جانے کا شبہ تک نہیں ہوتا۔ ریاست کی اولین ذمہ داری یہی تھی کہ لوگوں کے لیے زیادہ
سے زیادہ سہولتیں فراہم کی جائیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے عمل سے یہ ثابت کیا
کہ مملکت اور انتظامیہ لوگوں پر حکم چلانے کے لیے نہیں بلکہ ان کی خدمت کرنے کی تشکیل
دی جاتی ہے۔ یہی اصول بعد میں سید القوم خادمھم کی مقولے کی صورت میں صدیوں
تک رائج رہا۔ امور ریاست کی ذمہ داریوں میں لوگوں کو بنیادی ضروریات کی فراہمی ہی
بنیادی اہمیت رکھتی تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تقلید میں ان صحابہ کرام نے جنہیں
امور مملکت چلانے کا موقع ملا اس اصول کو اور زیادہ مستحکم کیا۔ حضرت عمرؓ نے تو
عام لوگوں کو حکمرانوں کا احتساب کرنے کا موقع فراہم کیا اور انسان تو درکنار جانوروں
کی بھوک اور پیاس جیسی ضروریات کی تکمیل کے لیے بھی خود کو ذمہ دار قرار دیا۔ یہ آپ
صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی تعلیمات کا نتیجہ تھا کہ انسانی ضروریات کو ترجیحی بنیادوں پر حل کرنے
کے لیے انتہائی خلوص اور دیانتداری سے کوششیں کی گئیں۔

اللہ تعالیٰ کے ارشادات اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم سے امور مملکت چلانے
والوں کے ذہنوں میں تعلیم کی اہمیت اور افادیت کا تصور بھی پختہ ہو چکا تھا بلکہ تعلیم کو

---

[۱] بینات۔ ۔۔۔ صفحہ ۔

انسان کی بنیادی ضروریات میں سے ایک ضرورت سمجھا گیا تھا۔ (حضرت امام احمد بن حنبل رح
حصول علم کی احتیاج کو نہ صرف انسانی احتیاجات میں شامل کرتے ہیں بلکہ سب سے زیادہ
اہمیت بھی دیتے ہیں۔ آپ کے خیال میں لوگوں کو کھانے پینے سے بڑھ کر علم کی ضرورت ہے
اس لیے کہ غذا اور پانی کی ضرورت دن میں دو تین بار پڑتی ہے جبکہ علم کی ضرورت ہر وقت
رہتی ہے) اسلامی ریاست میں تعلیم کی فراہمی کو ریاست ہی کی ذمہ داری تصور کیا گیا تھا۔
اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کی پہلی ریاست میں علم کی توسیع اور اشاعت کے لیے
جو اقدامات کیے تھے وہ اس ذمہ داری کی توثیق کے لیے کافی ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم
نے بنفس نفیس تعلیمی اداروں کی تعمیر میں حصہ لیا درسگاہوں کا معائنہ کیا اور تمام انتظامی
عہدیداروں کو یہ ہدایات جاری کیں کہ وہ اپنے ماتحت علاقے میں لوگوں کی تعلیم کا انتظام
کریں[1] (کتانی ۴۳/۱) آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی قائم کردہ پہلی اسلامی ریاست کا صدر
مقام مدینہ تھا اور یہ شہر انتظامیہ کے حوالے سے نہیں بلکہ تعلیمی اعتبار سے بھی ایک بہت بڑا
مرکز سمجھا جاتا تھا۔ تعلیم کی اشاعت اور فروغ کا یہ سلسلہ دور دراز علاقوں تک وسیع ہو گیا
بلکہ ابتدائی عہد میں ہی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے درسگاہوں میں اضافہ میں ذاتی دلچسپی لی یمن
میں جب حضرت عمرو بن حزم کو حاکم مقرر کیا گیا تو ان کے لیے ایک طویل تقرر نامہ '
Appointment letter جاری کیا گیا۔ اس تقرر نامے میں ان کے
لیے ہدایات موجود تھیں ان ہدایات میں یہ بات بھی شامل تھی کہ وہ قرآن، حدیث فقہ اور
علوم اسلامیہ کی تعلیم کا بندوبست کریں۔ مذہبی تعلیم سے متعلق یہ حکم دیا گیا تھا کہ لوگوں کو
ترغیب دلانے کے لیے ان سے نرمی برتی جائے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو دینی تعلیم رائج
کرنے کا حکم دیا تھا۔ اس میں وضو، جمعہ کا غسل، روزے اور حج کے احکامات شامل تھے[2]
حکام کی ذمہ داریوں میں تعلیم کی ذمہ داری شامل کرنے کی ایک مثال حضرت ابن مسعودؓ تھے
جن کا انتقال ۳۲ھ میں ہوا۔ آپ کوفے کے قاضی مقرر ہوئے اور آپ کے ذمے عہدہ قضا
کے علاوہ خزانے، وزارت اور مذہبی تعلیم کے فرائض بھی تھے ان تمام ذمہ داریوں

---

[1] محمد حمید اللہ، عہد نبوی کا نظام حکمرانی، مکتبہ ابراہیمیہ، حیدرآباد دکن بار دوم ۱۹۳۹ء صفحہ ۲۲۵

[2] ایضاً صفحہ ۵-۲

کی وضاحت آپ کے تقرر نامے میں موجود تھی [۱]

یہ دو حوالے اس امر کی نشاندہی بھی کرتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نصاب میں بھی ترجیحات مقرر فرمائیں تھیں اور ان باتوں کو جن کی زیادہ ضرورت پڑتی ہے زیادہ اہمیت دی گئی تھی۔ چونکہ اس عہد میں لوگوں کو پہلے اسلامی تعلیمات سے آگاہ کرنا ضروری تھا اسی لیے ان احکامات کی تعلیم کو اولیت دی گئی جن کی زندگی کے روزمرہ معاملات میں ضرورت پڑتی تھی۔ انتظامی نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سربراہ مملکت کی حیثیت سے جو اقدام کیے وہ تعلیم کے معاملے میں ریاست کے کردار اور اس کی ذمہ داریوں کا تعین کرتے ہیں ریاست نہ صرف تعلیمی اداروں کے قیام کی ذمہ دار قرار دی جاسکتی ہے بلکہ متعلمین کے لیے مفت تعلیم کی فراہمی بھی اس کے فرائض میں شامل ہے۔ ریاست اشاعت علم کے اقدامات کے باوجود حصول علم کے معاملات میں مداخلت بیجا کے لیے بااختیار نہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد درسگاہوں کے قیام میں اضافہ کا سلسلہ جاری رہا اور مسلمانوں نے دیگر علوم و فنون میں بھی عبور حاصل کرنا شروع کر دیا اختیارات کے معاملے میں ان اداروں پر ریاست کا انتظامی کنٹرول نہ ہونے کے برابر تھا البتہ اگر کہیں تعلیمی سہولتیں نہ ہوتیں تو ریاست ان کے لیے کوششیں کرتی تھی

بلا معاوضہ زمین نہ لینے کا حکم

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے درسگاہوں کے قیام اساتذہ کے تقرر اور طالب علموں کو مفت تعلیم فراہم کرنے کی مثالوں کے ساتھ ساتھ یہ مثال بھی قائم کی کہ ریاست یا کسی اور ادارے، تنظیم یا افراد کے گروہ کو اس بات کا اختیار حاصل نہیں ہے کہ وہ کسی اور کی ملکیت کو درس و تدریس کے مقاصد کے لیے بلا اجازت استعمال کر سکے۔ مسلمانوں کی سب سے پہلی درسگاہ کے قیام کے وقت جب زمین کے حصول کا معاملہ سامنے آیا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس زمین کے مالک کی تلاش کی۔ معلوم ہوا کہ یہ زمین دو بچوں سہل اور سہیل کی ملکیت ہے اور یہ دونوں بچے حضرت اسعد بن زرارہؓ کی زیر کفالت

---

[۱] شاہ معین الدین ندوی: مہاجرینؓ (حصہ اول) دارالمصنفین اعظم گڑھ طبع ثانی سنہ ۱۹۵۱ء صفحہ ۲۵۷

ہیں ۔ مسجد کی تعمیر کے لیے منتخب مقام پر تمام مسلمان متفق تھے یہاں تک کہ ان بچوں کے کفیل بھی تیار تھے لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مالکان کو معاوضہ دیئے بغیر وہاں مسجد تعمیر کرنے سے انکار فرمایا ۔ ان یتیم بچوں اور ان کے کفیل کے اصرار کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ زمین لی اور انہیں معاوضہ ادا کر دیا ۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت پر حضرت ابوبکر صدیق نے اس زمین کی قیمت دس دینار ادا کی اس زمین کا طول موجودہ سو گز کے برابر تھا ۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی قائم کردہ اس مثال پر صحابہ کرام نے بھی عمل کیا ۔ بعد میں جب حضرت عمر رضؓ کے دور میں مسجد نبوی کی توسیع کا مسئلہ سامنے آیا تو مسجد نبوی سے ملحق زمین کی ضرورت محسوس ہوئی ، یہ زمین حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت عباس رضؓ کی ملکیت تھی ۔ اس سلسلے میں جب حضرت عباس رضؓ سے رجوع کیا گیا تو انہوں نے زمین دینے سے انکار کر دیا ۔ اس مرحلے پر حضرت عمر رضؓ نے ان کے سامنے مندرجہ ذیل تین باتیں رکھیں تاکہ معاملہ طے کیا جا سکے

۱. زمین کا معاوضہ وصول کر لیں ۔

۲ ۔ زمین مسجد نبویؐ کے نام ہبہ کر دیں ۔

۳ ۔ مسجد اور اپنے گھر کو ملا لیں ۔

حضرت عباس رضؓ نے ان تینوں باتوں میں سے بھی کوئی بات نہیں مانی بات بڑھنے لگی تھی کہ اس کا علم مسجد نبویؐ کے ابتدائی معلمین میں سے ایک معلم حضرت ابی بن کعب رضؓ کو ہوا انہوں نے فوراً حضرت عمر رضؓ سے رابطہ قائم کیا اور انہیں اس معاملے میں سختی کرنے سے منع کیا ۔ حضرت عمر رضؓ کو انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ مثال یاد دلائی ، جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بلا معاوضہ زمین نہ لینے کا فیصلہ کیا تھا ۔ حضرت عمر رضؓ نے اس مثال کے بعد معاملے پر خاموشی اختیار کر لی ۔ کچھ دنوں بعد حضرت عباس رضؓ نے خود بھی مسجد نبویؐ کی توسیع کی ضرورت محسوس کی اور اپنی زمین دے دی ۔[۱۵]

اس حقیقت کے باوجود کہ مساجد اور درسگاہوں کو مذہبی اور قومی حیثیت حاصل ہے اور ان کا قیام معاشرے کے تمام افراد کے لیے فائدہ مند ثابت ہوتا ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جبر سے کام نہیں لیا بلکہ ان زمینوں کے جائز مالکان کو معاوضہ ادا کیا ۔ آپ

---

۱۵ ابن جریر طبری: تاریخ طبری (حصہ اول سیرۃ النبیؐ) مترجم سید محمد ابراہیم نفیس اکیڈمی ۱۹۶۷ء

صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ عمل تعلیمی اداروں کی تعمیر میں ریاست کی ذمہ داریوں اور اس کے اختیارات کا تعین بھی کرتا ہے۔

تعلیم اور روزگار کی فراہمی

اسلام نہ تو حصول علم برائے علم کا قائل ہے اور نہ ہی اس حد تک مادہ پرست ہے کہ Bread and butter aim کو تعلیم کے مقاصد میں سب سے زیادہ فوقیت دیتا ہو۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں سے ہٹ کر اعتدال اور توازن کا راستہ اختیار کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ عمل دراصل انسان کے فطری اور روحانی تقاضوں کے عین مطابق تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں سرکاری یا نیم سرکاری ادارے اور ان میں کام کرنے کے لیے ہزاروں آسامیاں موجود نہیں تھیں جن پر تعلیم حاصل کرنے والوں کو متعین کر دیا جاتا پھر بھی جتنی جگہیں امور مملکت کے حوالے سے سامنے آئیں ان پر اہل علم ہی کو تعینات کیا گیا۔ اس دور میں موجودہ دور کی طرح صنعتی شعبہ بھی موجود نہیں تھا کہ لوگوں کو فنی اور پیشہ ورانہ تربیت دے کر مختلف صنعتی اداروں میں ملازمتیں فراہم کر دی جائیں۔ اس دور میں پڑھے لکھے افراد کے مقابلے میں روزگار فراہم کرنے کے مواقع کم تھے پھر بھی کوئی ایسا واقعہ رونما نہیں ہوا کہ کسی کو روزگار کی تلاش میں ناکامی ہوئی ہو۔ اس کا ایک سبب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا قائم کردہ معاشرتی و معاشی نظام بھی تھا جو تعلیمی نظام کی طرح سب کو یکساں وسائل اور مواقع فراہم کرنے کے اصول کے مطابق رائج کیا گیا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تعلیم و تبلیغ کا جو عمل شروع کیا تھا اولاً اس کی بنیاد اسلامی تعلیمات کو عام کرنا تھا تاکہ لوگ اللہ کے دین کی طرف آئیں یہ خالصتاً مذہبی معاملہ تھا لیکن پھر بھی لوگوں کے بشری تقاضوں کو نظرانداز نہیں کیا گیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو لوگوں کی ضروریات کا احساس تھا اور ان کے معاشی مسئلے کو بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پس پشت نہیں رکھا۔ بلکہ اس دور کے عرب معاشرے اور اس میں رائج مختلف پیشوں کی مناسبت سے لوگوں کو جائز ذرائع سے روزی حاصل کرنے کے مواقع فراہم کیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تعلیم عام کر کے ریگزار عرب میں رہنے والے غیر متمدن اور مفلوک الحال لوگوں کے لیے روزگار کا ایک ذریعہ تو تعلیم ہی کے حوالے سے فراہم کر دیا تھا۔ کیونکہ وہ لوگ جو تعلیم حاصل کر لیتے تھے دوسروں کو تعلیم دینے پر مامور کر دیئے جاتے تھے۔ ان میں سے بہت

سے افراد کی ضروریات زندگی کی تکمیل حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور دیگر صحابہ کرام نے اپنے ذمہ لے رکھی تھی اس طرح وہ لوگ فکر معاش سے آزاد ہو جاتے تھے معلمی کے اس پیشے میں آنے والے سب سے پہلے افراد تو وہی لوگ تھے جنہوں نے سب سے پہلی تعلیم گاہ (دارارقم رض) میں تعلیم حاصل کی[1] اس کے بعد بھی اس شعبے میں لوگ آتے رہے۔

اسلام جب عرب کے طول و عرض میں پھیلنے لگا اور باقاعدہ اسلامی ریاست قائم کر لی گئی تو اس کے ماتحت مختلف صوبہ جات بھی قائم ہوئے ان صوبہ جات میں امور مملکت چلانے کے لیے انتظامیہ کی ضرورت محسوس ہوئی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح پڑھے لکھے لوگوں کے لیے روزگار کا ایک اور موقع فراہم کیا۔ مختلف صوبوں کے حکام کو باقاعدہ مشاہرہ دیا جاتا تھا۔ اس طرح انہیں پر تعیش زندگی گزارنے کے وسائل تو نہیں البتہ شریفانہ زندگی بسر کرنے جتنے وسائل ضرور مہیا کر دیئے گئے تھے۔ ان عمال حکومت میں، حضرت معاذ بن جبل رض، حضرت عتاب بن رض اسید، حضرت عمرو بن رض حزم اور حضرت عثمان بن ابی رض العاص کے اسمائے گرامی سب سے نمایاں ہیں۔ جیسے جیسے اسلامی ریاست میں وسعت اور استحکام پیدا ہوتا گیا معاشی شعبے پر بھی توجہ بڑھتی گئی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں ہی اس شعبے میں اتنا بڑا انقلاب آ چکا تھا کہ پوری تاریخ اس دور میں ایک بھی بے روزگار پیش کرنے سے قاصر ہے۔ حالانکہ اس دور میں ریاستوں کے وسائل بہت محدود تھے۔

نادار طلبہ کے معاملات

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو تعلیمی نظام تشکیل دیا اس کی تین نمایاں خصوصیات لازمی مفت اور عام Compulsory free and Universal ہونا تھیں۔ اللہ تعالیٰ کے احکامات کے مطابق آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تعلیم پر تمام لوگوں لوگوں کا مساوی حق تسلیم کرنے کا اصول بھی رائج کیا۔ اس اصول کے ذریعے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے زندگی کے مختلف شعبوں کی طرح تعلیم میں بھی امیر اور غریب کے فرق کو مٹا دیا۔ اس دور میں بہت سے متعلمین ایسے تھے جو نادار تھے لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تعلیم مفت کر کے ان کی

---

[1] حبیب الرحمن شروانی، علمائے سلف و نابینا علماء، تعلیقات و حواشی مفتی انتظام اللہ شہابی۔ اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ

نا داری اور غربت کو حصول علم میں رکاوٹ نہیں بننے دیا۔ حکومت کسی طالب علم سے کوئی فیس نہیں لیتی تھی اور نہ ہی اساتذہ کو اس بات کی اجازت تھی کہ وہ تحائف کے نام پر طلبا سے چیزیں یا رقومات وصول کریں۔ ان فیصلوں نے تعلیم کے معاملے میں برابری کے اصول کو عملی شکل دے دی تھی اور تمام طالب علم ایک ہی صف میں موجود تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں قائم ہونے والی باقاعدہ درسگاہ میں پڑھنے والوں کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان میں بیشتر لوگ دور دراز کے مقامات سے حصول علم کے لیے آیا کرتے تھے ایسے لوگوں کی رہائش اور خوراک کا انتظام آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ ؐ کے صحابہ کرام کیا کرتے تھے۔ خوراک اور رہائشی سہولتوں کی فراہمی اس طریقے پر نہیں ہوتی تھی کہ متعلمین کی عزت نفس مجروح ہو بلکہ ان کے ساتھ مہمانوں جیسا سلوک کیا جاتا تھا وہ جب تک وہاں علم حاصل کرنے کے لیے مقیم رہتے انہیں مہمان تصور کیا جاتا تھا۔ ایک خوشحال صحابی حضرت سعد بن عبادہؓ اکثر اصحاب صفہ کے لیے رات کے کھانے کا انتظام اپنے پاس سے کرتے تھے۔[1] اکثر حضرت ابوبکر صدیقؓ بھی اصحاب صفہ کو کھانے پر مدعو کرتے ان سب کا انداز بالکل میزبانوں کی طرح ہوتا اور وہ مہمانوں کی خاطر مدارات میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھتے۔ حضرت ابوبکرؓ کے ہمراہ ایک بار تین ایسے ہی اصحاب ان کے گھر گئے۔ اتفاقاً آپ کو فوراً ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یاد فرمایا اور آپ کو جانا پڑا۔ آپ کو واپسی میں دیر ہوگئی۔ آپ کی زوجہ حضرت ام رومان (والدہ حضرت عائشہ) نے مہمانوں کو کھانا بھیجا لیکن انہوں نے منع کر دیا اور چلے گئے۔ جب حضرت ابوبکرؓ واپس آئے تو انہوں نے مہمانوں کو کھانا نہ کھلانے کا برا مانا۔ آپ کی زوجہ نے آپ کو اصل صورت حال سے آگاہ کیا حضرت ابوبکرؓ نے میزبان کی غیر حاضری کو مہمانوں کے لیے معیوب سمجھا اور فوراً ان اصحاب صفہ کے پاس گئے۔ انہیں حقیقت حال سے آگاہ کیا اور اپنے ساتھ واپس لاکر انہیں کھانا کھلایا[2] نادار طلبہ کی کفالت اور ان کی عزت نفس کے احترام

---

[1] حبیب الرحمن شیروانی۔ علمائے سلف و نابینا علما: تعلیقات و حواشی مفتی انتظام اللہ شہابی اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ طبع اول کراچی سنہ ۱۹۶۱ء صفحہ ۲۱

[2] مولانا سعید انصاری: سیر الصحابیات: معارف اعظم گڑھ طبع چہارم سنہ ۱۹۵۳ء صفحہ ۱۱۵

کی یہ بہت ہی نمایاں مثال تھی جو اس دور میں ملتی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں کئی صحابہ کرام ایسے تھے جو اسی انداز پر طلبہ کی خبر گیری رکھتے تھے اور انہیں کسی بھی مرحلے پر اپنی تنگدستی کا احساس نہ ہونے دیتے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا نظام رائج کیا کہ نادار طلبہ کی کفالت کا مسئلہ خود بخود حل ہو گیا۔ کسی بھی مرحلے پر اور پوری اسلامی مملکت میں کہیں بھی کوئی ایسا ثبوت نہیں ملتا کہ کوئی شخص غربت اور ناداری کی وجہ سے تعلیم حاصل کرنے سے محروم رہ گیا ہو۔

٭

باب ۱۲

طلبا کے آداب

افضل العبادۃ طلب العلم ۔ (طلب علم بہترین عبادت ہے)

علم کے حوالے سے اسلام میں طالب علم کا مرتبہ بھی بہت بلند ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے جس طرح عالم کو عابد پر فضیلت بخشی گئی ہے اسی طرح علم حاصل کرنے والوں (متعلمین) کو بھی نجات کی نوید دی گئی ہے ۔ حصول علم کو عبادت کا درجہ ہی نہیں دیا گیا بلکہ عبادتوں میں سے بھی افضل اور بہترین عبادت قرار دیا گیا ہے ۔ متعلم اگر حصول علم کے لیے گھر سے نکلے تو اس کا ہر قدم بظاہر تلاش علم کی منزلوں میں آگے بڑھتا ہے لیکن در حقیقت وہ جنت کی جانب اتنی ہی پیش قدمی کر چکا ہوتا ہے اس کام میں وہ جتنا آگے بڑھتا ہے اسے اللہ تعالیٰ کی اتنی ہی خوشنودی حاصل ہوتی ہے ۔ اگر طلب علم کے دوران وہ انتقال کر جائے تو اسے شہید کا مرتبہ ملتا ہے ۔ اس طرح طلب علم کے لیے نکلنے والا ہمیشہ زندہ رہنے والے افراد کی صف میں شامل ہو جاتا ہے ۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حصول علم اور اشاعت علم کے فرائض کی ادائیگی میں متعلمین اور معلمین سب ہی کو ایسی جماعت کے افراد قرار دیا ہے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو عبادت گزاروں سے زیادہ پسند تھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس پسندیدہ گروہ میں متعلمین (طالب علم) بھی شامل ہیں جنہیں اس مرتبے کے حوالے سے کچھ ذمہ داریوں کا پابند بھی کیا گیا ہے ۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات سے اساتذہ کی طرح طلبہ کے لیے بھی ایک ضابطہ ترتیب دیا جا سکتا ہے ۔ یہ ضابطہ جسے طلبہ کے لیے آداب یا ہدایت نامہ کہا جا سکتا ہے ۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد کے دیگر معلمین اور متعلمین کے معمولات سے ترتیب دیا جائے تو آج بھی رہنمائی کے لیے سب سے اہم کردار ادا کر سکتا ہے ۔

اساتذہ سے برتاؤ

متعلمین کے لیے سب سے پہلی بات معلمین سے ان کا برتاؤ ہے ۔علم حاصل کرنے کے لیے (جو انتہائی فضیلت کا باعث ہے) لازمی ہے کہ علم دینے والوں سے اچھا برتاؤ کیا جائے۔ترمذی میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک روایت ہے جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے واضح طور پر یہ فرمایا کہ جس سے علم سیکھو اس کی عزت کرو ۔عزت و احترام کی اعلیٰ مثال ان لوگوں نے بھی پیش کی جنہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے علم حاصل کیا ۔لاتعداد روایتوں اور حوالوں سے اس احترام کا اندازہ کیا جاسکتا ہے جو متعلمین (صحابہ کرام) کے دلوں میں اپنے معلم (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) کے لیے موجود تھا۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم سب سے بڑے معلم ہونے کے باوجود علما کا احترام کرتے تھے ۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے علما کو انبیاء کرام کا وارث قرار دینا ان کے احترام اور مرتبے کی واضح دلیل ہے ۔باقاعدہ معلمین کی تو بات ہی کچھ اور تھی ان لوگوں کا بھی احترام کیا جاتا تھا جنہوں نے کبھی کسی ایک مسئلے سے متعلق معلومات فراہم کی ہوں ۔عہد نبویؐ کے ایک معلم حضرت معاذ بن جبلؓ کا انتقال ۱۸ھ میں ہوا۔آپ سے لوگوں کی عقیدت کا یہ عالم تھا کہ معلمین اور متعلمین سمیت سینکڑوں افراد جمع ہو گئے اور زاروقطار رونے لگے کہ آج علم اٹھ رہا ہے ۔حضرت معاذؓ نے بستر مرگ پر بھی لوگوں سے فرمایا کہ علم اور ایمان دو چیزیں ایسی ہیں جو دنیا سے نہیں اٹھ سکتیں جو جستجو کرے گا وہ انہیں حاصل کر لے گا۔اس کے بعد آپ نے چار معلمین کے نام بتائے اور فرمایا کہ علم حاصل کرنا ہو تو ان سے رجوع کرو یہ چار معلم حضرت ابوالدرداؓ، حضرت سلمان فارسیؓ، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور عبداللہ بن سلامؓ تھے[1] حضرت معاذؓ کا یہ عمل دوسرے معلمین کے احترام کی علامت تھا جبکہ آپ سے عقیدت و احترام کے جذبات رکھنے والے سینکڑوں افراد آخری وقت بھی آپ کے گرد جمع تھے ۔یہ اس دور کے متعلمین کی اپنے اساتذہ کے احترام کی ایک مثال ہے اس نوعیت کے کئی واقعات موجود ہیں ۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے متعلمین کو یہ ہدایت بھی فرمائی کہ وہ اساتذہ سے خاکساری سے پیش آئیں اور ان کے سامنے تکبر اور نخوت کا اظہار نہ کریں ۔ظاہر ہوا کہ اساتذہ سے علم حاصل

---

[1] مولانا سعید انصاری: سیر انصار (حصہ دوم) دارالمصنفین اعظم گڑھ طبع دوم ۱۹۴۸ء صفحہ ۱۸۸

کرنے کے لیے سنجیدگی وقار اور متانت بھی ضروری ہے۔ یہ تمام اوصاف مل کر ایک ایسا خاکہ ترتیب دیتے ہیں جس سے متعلم کی شخصیت کا تعین بھی ہو جاتا ہے۔ حضرت ابوسعید خدریؓ نے اس سلسلے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "علم حاصل کرو اور علم کے لیے متانت اور وقار پیدا کرو جس سے تعلیم پاتے ہو اور جس سے تعلیم لیتے ہو دونوں سے خاکساری برتو۔ جبار عالم نہ بنو۔"[1] آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کے مطابق خاکساری اور احترام کا برتاؤ صرف اساتذہ کے لیے ہی نہیں بلکہ ان علوم اور کتب کیلئے بھی احسان مندی کے جذبات لازمی ہیں جن سے استفادہ کیا جاتا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ان تعلیمات کے ذریعے متعلمین کے لیے اپنے اساتذہ اور کتب دونوں کے احترام کی روایت قائم ہوئی جس کی ایک روشن مثال آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے تجویز کردہ نصاب کی لازمی کتاب "قرآن" ہے۔ اس عہد میں بھی قرآن کا بہت احترام کیا جاتا تھا۔ خوشنویسی کی تعلیم دیتے وقت بچوں کو لکھنے کے لیے قرآن کریم کی آیات کی مشق نہیں کرائی جاتی تھی تاکہ ان آیات اور حروف کی بے قدری نہ ہو اس کے برعکس عربی زبان کی دوسری عبارتوں سے مشق کرائی جاتی تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کے حوالے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ متعلمین کے لیے اساتذہ کا احترام فرض ہے اور اگر وہ اس کے برعکس عمل کریں گے تو ان کا یہ عمل خدا اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک ناپسندیدہ ہوگا۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تعلیم کو ایک بہت بڑی نعمت قرار دیا تھا اسی کی اشاعت اور فروغ کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے دنیا میں بھیجا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے آنے والے انبیاء کرام کا مقصد بھی یہی تھا۔ ان سب انبیاء کو اللہ تعالیٰ نے علم عطا فرمایا تھا اور انہیں عام لوگوں تک علم پہنچانے کا فریضہ سونپا گیا تھا یہ حوالے علم کی قدر و منزلت کی خود ہی وضاحت کرتے ہیں اس قدر و منزلت کو دیکھا جائے تو تعلیم دینے والے کے بلند مرتبہ کا احساس اور بھی نمایاں ہو جاتا ہے۔ واضح الفاظ میں کہا گیا ہے کہ

---

[1] ابن عبد البر اندلسی، جامع بیان العلم و فضلہ۔ مترجم عبدالرزاق ملیح آبادی۔ العلم و العلماء۔ ادارہ اسلامیات لاہور۔ پہلی بار ۱۹۷۶ء صفحہ ۹۰

جو شخص کسی کو تعلیم دے وہ اس کے حق میں برکت ہے۔ یقیناً جس سے برکت ملتی ہے اس کی تعظیم کی جانی چاہیے۔ اس بات سے اختلاف کی قطعی گنجائش بھی نہیں ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اس ہدایت کے مطابق معلمین بھی اسی زمرے میں آتے ہیں جو دوسروں کو برکت پہنچاتے ہیں اس لیے ان کی تعظیم بھی اسی انداز سے ہونی چاہیے یہ اصول طے ہو جانے کے بعد متعلمین خود اس کے مطابق اپنے معلمین کے احترام اور تعظیم کے طریقوں اور ضابطوں کا تعین کر سکتے ہیں انہیں شائستگی اور اخلاق کا مظاہرہ کرنا چاہیے۔ اساتذہ کے سامنے انکساری اور متانت سے پیش آنا چاہیے۔ تاکہ ان کی اپنی قدر و منزلت میں اضافہ ہو اور اس طرح علم (برکت) میں بھی اضافہ ہو۔ طالب علم انہی اصولوں کو اپنا شعار بنالیں تو دنیاوی اعتبار سے انہیں مزید علوم و فنون کی دولت عطا ہوگی اور اللہ تعالیٰ کے پاس بھی ان کے درجات میں اضافہ ہوگا۔ ایسے متعلمین کے لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک ارشاد مبارک حضرت ابو امامہ سے بھی روایت ہے اس کے مطابق آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو لڑکا طلب علم اور عبادت میں نشو ونما پاتا ہے یہاں تک کہ بڑا ہو جاتا ہے اور اپنی اسی حالت پر استوار رہتا ہے اسے ستر صدیقوں کا ثواب ملتا ہے۔

دوران تدریس طلبہ کی ذمہ داریاں

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے طلبا کو اہم معاشرتی مقام عطا فرمایا اور انہیں دنیا اور آخرت دونوں میں کامیابی اور کامرانی کی نوید دی۔ اس کے عوض طلبا کے لیے اساتذہ کا احترام کرنا لازمی قرار دیا گیا۔ اس احترام کا تقاضہ ہے کہ طلبا دوران تدریس اساتذہ کے لیے مشکلات پیدا نہ کریں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بھی بحیثیت معلم کئی لیکچر دیئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیکچر سننے والوں نے دوران تدریس جس رویہ اور نظم و ضبط کا مظاہرہ کیا وہ آج بھی ایک مثال کی حیثیت رکھتا ہے۔ آپ کے آخری لیکچر (خطبہ حجۃ الوداع جو عام خطبوں کے برعکس کچھ طویل تھا) کے موقع پر سامعین کی تعداد بہت زیادہ تھی آواز سب تک نہیں پہنچ پا رہی تھی اس لیے کچھ لوگ آپس میں باتیں کرنے لگے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس عمل کو ناپسند فرمایا اور حضرت جریرؓ کو ہدایت کی کہ وہ لوگوں کو خاموش کرائیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس عمل سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ لیکچر یا کسی انداز کی تدریس کے دوران طلباء کا آپس میں

باتیں کرنا یا درس کی جانب سنجیدگی سے متوجہ نہ ہونا بداخلاقی ہے اسی لیے دوران تدریس طلبا کو خاموشی اختیار کرنی چاہیے تاکہ معلم اطمینان اور سکون سے انہیں معلومات بہم پہنچا سکے

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے خطبات کا اس سے پہلے بھی ذکر کیا جا چکا ہے ان خطبات کی ایک نمایاں خصوصیت یہ بھی تھی کہ مجمع میں شامل افراد میں سے کوئی ایک صاحب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے کہے ہوئے الفاظ دہراتے جاتے تھے تاکہ جو لوگ پہلی بار نہ سن سکے ہوں وہ سن لیں اس طریقے پر اس وقت خاص طور سے عمل کیا جاتا تھا جب سامعین کی تعداد زیادہ ہوتی اور یہ احتمال ہوتا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز آسانی سے سب تک نہیں پہنچ رہی ہوگی۔ دہرانے والے (مؤید) کا انتخاب انہی سامعین سے ہوتا تھا جن کے لیے درس یا خطبہ دیا جا رہا ہو۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقہ تدریس کی اس خوبی سے مسلمانوں نے بعد میں بھی استفادہ کیا اور مؤید کا باقاعدہ تقرر ہونے لگا ہر کلاس کے طالب علموں میں سے ایک کو مؤید بنا دیا جاتا تھا آہستہ آہستہ یہی سلسلہ نائب یا مانیٹر کی صورت اختیار کر گیا۔ اس طریقے سے طالب علموں کو بھی فائدہ حاصل ہوا بلکہ اصل میں یہ فیصلہ طلبا ہی کے مفاد میں کیا گیا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اساتذہ کے احترام اور دوران تدریس نظم و ضبط کے قیام کے ساتھ ساتھ طلبا کے لیے تدریسی سہولتوں کی فراہمی پر بھی توجہ دی۔ نظم و ضبط قطعی طور پر یک طرفہ نہیں تھا کہ طالب علموں پر ساری ذمہ داریاں عائد کر دی جائیں۔ ان کے لیے ذمہ داریوں کے ساتھ ساتھ تدریس میں آسانیاں بھی فراہم کی گئی تھیں۔

سوال پوچھنے کی اجازت

تدریس میں طلبا کو فراہم کی جانے والی سہولتوں میں ایک اہم مسئلہ سوالات کا ہے۔ حقیقتاً دوران تدریس اکثر ایسے مواقع آتے ہیں جب طلبہ مسئلہ کو واضح طور پر نہیں سمجھ پاتے۔ اور کئی طلبا کے ذہن میں سبق یا موضوع سے متعلق کئی سوالات پیدا ہوتے ہیں وہ چاہتے ہیں کہ ان کے بارے میں معلمین سے مزید استفسار کریں۔ بعض طلبا میں یہ خواہش مزید جاننے کی جستجو کے باعث بھی پیدا ہوتی ہے دونوں صورتوں میں معلم سے سوال پوچھنا لازمی ہو جاتا ہے دوران تدریس متعلم سے سوال پوچھنا یا وضاحت کے لیے معلم کی توجہ کسی خاص

نکتے کی جانب مبذول کرانا درس و تدریس میں رخنہ اندازی نہیں ہے اور نہ ہی طلبا کے اس عمل کو عدم ضبط کے مساوی قرار دیا جا سکتا ہے بعض ماہرین کے خیال میں ایسا نہیں ہے بلکہ سوال کرنا معیوب تصور کیا جاتا ہے۔ اس کے بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ اور ابتدائی عہد کے معلمین کی تدریس سے کئی مثالیں ملتی ہیں جن کی روشنی میں کسی ایک نتیجے پر پہنچا جا سکتا ہے۔

مسجد نبوی کے ایک معلم حضرت ابی بن کعب باقاعدہ درس دیا کرتے تھے متعلمین آپ کا اس درجہ احترام کرتے تھے کہ سوال پوچھنے کی جسارت نہ کر پاتے تھے۔ آپ بھی جب تک کوئی مسئلہ سامنے نہ لایا جائے اس کا جواب دینا مناسب نہیں سمجھتے تھے[۱] حضرت ابی بن کعبؓ کی روایت کے برعکس بعض اساتذہ کرام سوالات پوچھنے اور استفسار کرنے کے عمل کو پسند فرماتے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عم زاد حضرت عبداللہ بن عباسؓ جو کئی مضامین کا درس دیتے تھے اس بات کے حق میں تھے۔ انہوں نے مختلف مضامین کی تدریس کے لیے مختلف دن مقرر کر رکھے تھے۔ ایک بار ان سے پوچھا گیا کہ انہوں نے اتنا علم کیسے حاصل کیا تو انہوں نے جواب دیا کہ پوچھنے والی زبان اور سمجھنے والے دل سے[۲] گویا علم حاصل کرنے میں جتنا دخل سمجھنے کا ہے اتنا ہی معلوم کرنے کا ہے۔

آپ کے اس ارشاد سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ علم کے معاملے میں حجاب نہیں کرنا چاہیے بلکہ جہاں کہیں مشکل درپیش ہو معلم سے سوال کیا جائے تاکہ وہ اس کی وضاحت کر دے اور بات آسانی سے سمجھ میں آ جائے۔ غرض سوال کرنے سے نہ تو اساتذہ کی توہین ہوتی ہے اور نہ ہی متعلم کی سبکی ہوتی ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس نے سوال کے سلسلے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی روایت بھی نقل کی تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا کہ عہد رسالت میں ایک شخص کو جو زخمی تھا غسل کی حاجت ہوئی۔ لوگوں نے اس کی حاجت کا اندازہ کرتے ہوئے اسے غسل دے دیا جس کے نتیجے میں اسے ٹھنڈک لگ گئی اور وہ ٹھٹھر کر مر گیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو جب اس واقعہ کی خبر ہوئی تو آپؐ نے ناراضگی

---

[۱] مولانا سعید انصاری: سیر انصارؓ۔ دار المصنفین اعظم گڑھ۔ طبع دوم ۱۹۴۸ء، صفحہ ۱۶۴

[۲] سید امیر علی: اسپرٹ آف اسلام مترجم محمد ہادی حسین۔ ادارہ ثقافت اسلامیہ۔ لاہور۔ طبع سوم ۱۹۸۴ء، صفحات ۴۶۵، ۴۶۴

کا اظہار فرمایا اور کہا کہ کیا جہل کا علاج سوال نہ تھا۔[1] اس واقعہ کے حوالے سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کی روشنی میں یہی نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ سوال نہ پوچھا جائے تو غلطی اور گمراہی کا امکان رہتا ہے۔ اس لیے سوال پوچھنا ہی بہتر ہے تاکہ اپنی اصلاح کی جاسکے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اسی قول کی روشنی میں کہ "جہل کا علاج سوال ہے" عہد نبوی کے ایک اور معلم حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے درس و تدریس میں سوال کی اہمیت کو اجاگر کیا ان کا یہ قول بہت مشہور ہوا کہ "علم تلاش سے بڑھتا ہے اور سوال سے حاصل ہوتا ہے"[2] گویا سوال کرنا دراصل معلومات میں اضافے کا سبب ہے اور اس ذریعے سے علم حاصل کیا جاتا ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور دو مقتدر معلمین کے حوالوں سے دوران تدریس طلبا کے سوال پوچھنے کی تائید ہوئی۔ اس عمل کو بد اخلاقی یا گستاخی نہیں سمجھا جاتا بلکہ سوال کی ضرورت ہو اور سوال نہ کیا جائے تو اسے جہل کے مترادف قرار دیا جاتا ہے۔ یہ سلسلے حوالے اس بات کی تصدیق کرتے ہیں کہ حضرت ابی بن کعبؓ سے سوال نہ پوچھنا خالصتاً ان کے متعلمین کا معاملہ ہے بہت ممکن ہے وہ ان کے درس میں مداخلت کے خیال سے سوال نہ کرتے ہوں اور حضرت ابی بن کعبؓ نے اس سلسلے میں خود کوئی پابندی نہ لگائی ہو۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بھی سوال کرنے والوں کا برا نہیں مانا بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں صحابہ اکثر آپؐ ہی سے معلوم کرتے تھے اور جب تک بات پوری طرح سمجھ میں نہ آجاتی اس وقت تک استفسار کرتے رہتے تھے۔

بد اخلاقی اور شرارت کی ممانعت

متعلمین کو دوران تدریس اساتذہ سے سوال کرنے کی اجازت تو ہے لیکن انہیں معلمین کو تنگ کرنے کے لیے سوالات کرنے سے گریز کرنا چاہیے۔ غیر ضروری سوالات اور استفسارات جاننے اور سمجھنے کے احاطے میں نہیں آتے بلکہ وہ معلمین اور دیگر

---

[1] ابن عبدالبر اندلسی: جامع بیان العلم و فضلہ۔ مترجم عبدالرزاق ملیح آبادی العلم والعلما ادارہ اسلامیات لاہور پہلی بار ۱۹۷۶ء

[2] ایضاً صفحہ ۷۰

متعلمین کی دل آزاری کا سبب بنتے ہیں متعلمین پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ کلاس میں سنجیدگی اور متانت کا ماحول برقرار رکھیں ایسی باتیں جو وہ خود نہیں جانتے ان پر اصرار نہ کریں اور نہ ہی ایسے بے سروپا سوالات کے ذریعہ معلمین کو پریشان کریں یہ عمل اساتذہ کی تعظیم کے حکم کی خلاف ورزی سمجھا جاتا ہے اور پوری کلاس کے کام میں بھی غیر ضروری تاخیر اور رخنہ اندازی ہوتی ہے۔

کلاس میں موجود طالب علموں کا یہ فرض بھی ہے کہ وہ اساتذہ کے سامنے ساتھی طالب علموں کی غلطیوں کی نشاندہی کریں اور ان پر پردہ نہ ڈالیں بلکہ انہیں ایسا کرنے سے روکیں۔ جن سے غلطی سرزد ہو ان کا یہ فرض ہے کہ اپنی غلطی کا اعتراف کریں اور اساتذہ سے عفو درگزر کی درخواست کریں۔ غلطی کی نشاندہی اور اس کے اعتراف کی ایک مثال حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس سے بھی ملتی ہے۔ حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ ایک دن حضرت عمرؓ تورات کا نسخہ لے کر آئے اور اسے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں ہی پڑھنے لگے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جب دیکھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ متغیر ہوا۔ حضرت صدیق اکبرؓ بھی وہاں موجود تھے انہوں نے معلم اعظم کے چہرے کے تاثرات دیکھے تو حضرت عمرؓ کی توجہ اس جانب مبذول کرائی۔ حضرت عمرؓ نے فوراً اپنی غلطی کو محسوس کیا اور کہا کہ میں اللہ کے رسول اور اس کے غصے سے پناہ مانگتا ہوں۔ اس روایت سے اساتذہ کے حق میں یہ شہادت ملتی ہے کہ وہ متعلمین کو غلطی کرنے پر تنبیہ کر سکتے ہیں جب کہ تمام متعلمین کا یہ فرض ہے کہ غلطی کرنے والے اپنے ساتھی طالب علم کی نشاندہی کریں اور اسے اس کا احساس دلائیں۔ متعلقہ طالب علم کا یہ فرض بنتا ہے کہ وہ اپنی غلطی کا اعتراف کرے اور ندامت کا اظہار کرے۔ متعلم دوران تدریس یا اس کے بعد بھی اساتذہ سے غیر ضروری بحث میں نہ الجھیں کیونکہ اسے سخت ناپسند کیا جاتا ہے۔ یہ طریقہ کار ان لوگوں کا سا ہے جنہوں نے اسلامی تعلیمات قبول کرنے کے برعکس ان کے بارے میں الٹے سیدھے سوالات اور نت نئی اختراعات کے ذریعے بات کو الجھانے کی کوششیں کی تھیں۔ (القرآن) فَلِمَ تُحَاجُّونَ فِيمَا لَيْسَ لَكُمْ بِهِ عِلْمٌ (آل عمران پ ۳) (۳-۶۶)

پس (اب) کیوں جھگڑنے لگے ہو ان باتوں میں نہیں ہے تمہیں جن کا کچھ علم

متعلمین کا یہ انداز کہ وہ دوسرے ساتھیوں یا اساتذہ کو مرعوب کرنے یا اپنی قابلیت ظاہر کرنے کے لیے سوالات کریں تو انہیں بھی مناسب نہیں سمجھا جاتا بلکہ نخوت و تکبر تصور کیا جاتا ہے۔ متعلمین کو اساتذہ سے اونچی آواز میں (چیخ کر) مخاطب نہیں ہونا چاہیے اس ضمن میں حضرت علیؓ نے جنہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا قرب میسر ہوا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے انداز کے مطابق معلمین کے لیے ضابطے کا تعین کیا آپ کا قول تھا کہ[1]
جب تم کسی عالم کے پاس پہنچو تو پہلے خاص طور پر عالم کو پھر دوسروں کو سلام کرو عالم کے روبرو مؤدب ہو کر بیٹھو۔ ہاتھوں سے اشارے نہ کرو۔ آنکھیں نہ مٹکاؤ۔ یہ نہ کہو کہ فلاں بات اس طرح نہیں۔ اس طرح سے فلاں شخص نے بیان کی ہے۔ عالم سے تکرار نہ کرو"۔ حضرت علیؓ کے اس قول میں حضور صلی اللہ کی تعلیمات کی جھلک موجود ہے۔ اور یقیناً آپ نے متعلمین کے لیے جو کچھ فرمایا وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی سے اخذ کیا گیا تھا۔

متعلمین کے لیے ضابطہ اخلاق مرتب کرنے کے لیے رہنمائی کا دوسرا ذریعہ صحابہ کرام کا وہ برتاؤ تھا جس کا اظہار انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا۔ وہ لوگ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے کس طرح ملتے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں آتے تو کس طرح بیٹھتے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم جب کلام فرماتے تو صحابہ کرام کس توجہ سے سنتے تھے اور جب کوئی بات سمجھ میں نہ آتی تو کتنے مہذب انداز سے استفسار کرتے تھے ان سب طور طریقوں سے متعلمین کے لیے ہدایات کا خاکہ ترتیب دیا جا سکتا ہے ان پر عمل کرنا طلبہ کی انفرادیت کی نفی یا ان کی شخصیت کو مجروح کرنا نہیں بلکہ اس طرح انہیں اپنے معلمین اور دوسرے متعلم ساتھیوں سے اچھے تعلقات رکھنے کی ترغیب دینا ہے ان کے بغیر تعلیمی عمل میں سنجیدگی نہیں آتی اور تعلیم جیسی مقدس اور بابرکت سرگرمی کی کامیابی اور اس کی تکمیل میں رخنہ اندازی ہوتی ہے۔ ان تمام آداب پر عمل کیا جائے تو تعلیمی اداروں میں نظم و ضبط کے مسائل بھی کم ہو جاتے ہیں۔

---

[1] ایضاً صفحات ۱۱۴ - ۱۱۳

لباس میں سادگی کا اصول

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں متعلمین کے لیے کسی ایک لباس کے مقرر کیے جانے کی کوئی روایت نہیں ملتی اس لیے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس دور میں طالب علموں کی شناخت اور انہیں یکساں ظاہر کرنے کے لیے کوئی لباس (یونیفارم) رائج کیے گئے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں دراصل حصول علم کے لیے آنے والوں کا تعلق کسی خاص عمر کے گروہ سے نہیں ہوتا تھا بلکہ ان میں وہ لوگ بھی شامل تھے جو اچھے خاصے Age Group عمر رسیدہ تھے اور اپنے کاموں سے واپس آنے کے بعد تعلیم حاصل کرنے کے لیے چلے آتے تھے متعلمین میں سے بیشتر لوگ محنت مزدوری کرنے والے تھے اور انتہائی غربت میں زندگی گذار رہے تھے۔ اس دور کے متعلمین کی عام زندگی کا اندازہ اس ایک واقعہ سے بھی لگایا جا سکتا ہے جس کا تذکرہ حضرت ابو سعید خدری نے کیا ہے۔ ان کا انتقال ۷۴ھ میں ہوا تھا اور انہیں عہد نبوی میں متعلم ہونے کا اعزاز حاصل تھا۔ ابتدائی عہد کے اداروں میں تعلیم حاصل کرنے والے طلبا کے لباس کے بارے میں انہوں نے اسی عہد کے لوگوں کے حوالے سے بتایا کہ پڑھنے والے اتنے غریب تھے کہ ان کے تن پر پورے کپڑے بھی نہیں ہوتے تھے اور وہ لوگ ایک دوسرے کی آڑ میں چھپ کر بیٹھتے تھے[1] یہ حوالہ اس دور کے عام متعلمین کی حالت کے بارے میں بتاتا ہے لیکن سب سے زیادہ غور طلب بات یہ ہے کہ انتہائی غربت کے باوجود وہ لوگ حصول علم کے لیے آتے رہے اور دوران تدریس انتہائی انہماک اور سنجیدگی سے کام کرتے رہے۔

عہد نبوی میں لباس مقرر کرنے کی واضح مثال نہیں ملتی لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قول اور عمل سے جس طرح زندگی کے بہت سے شعبوں میں اکتساب کیا جا سکتا ہے بالکل اسی طرح لباس کے معاملے میں بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی سے رہنمائی حاصل کی جا سکتی ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی رہنمائی سے اخذ کرنے کے بعد یقیناً مزید حوالوں اور شواہد کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ دراصل متعلمین اور معلمین دونوں ہی کے لیے سب سے بہترین نمونہ وہی

---

[1] محمد بن ہشام: سیرۃ ابن ہشام، مترجم شیخ محمد اسماعیل، مقبول اکیڈمی لاہور ۱۹۶۱ء صفحہ ۱۱

لباس ہے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم زیب تن فرماتے تھے۔ درس و تدریس سے وابستہ لوگوں کے لباس میں وہی خصوصیات ہونی چاہئیں جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لباس میں تھیں مثلاً آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا لباس انتہائی سادہ اور صاف ہوتا تھا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم ریشم اور زرق برق لباس کو ناپسند فرماتے تھے۔ لباس کی سادگی اور صفائی ہی دراصل وہ اہم اصول ہے جس سے دنیا کے مختلف طبعی اور جغرافیائی ماحول میں رہنے والے افراد اپنے لباس کا تعین کر سکتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بھی تمام مسلمانوں کو اسی طرح رہنے کی تاکید فرمائی تھی۔ ترمذی کی ایک روایت کے مطابق حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا تھا کہ (حدیث)

ان اللہ طیب یحب الطیب ونظیف یحب النظافۃ فتنظفوا ولا تشبھوا الیھود

خداوند تعالیٰ پاکیزہ ہے اور پاکیزگی کو پسند کرتا ہے اور پاک صاف ہے اور پاکی کو پسند کرتا ہے تو تم پاک صاف رہا کرو، یہودیوں کی طرح گندے نہ بنو۔

(ترجمہ)

لباس کے معاملے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد بہت ہی واضح ہے۔ اس کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے اس میں اس دور کے مسلمانوں کو یہودیوں کی طرح رہنے سے منع فرمایا ہے اور مسلمانوں کو پاک اور صاف لباس پہننے کی تلقین کی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ ہدایت اس دور کے معلمین اور متعلمین دونوں کے لباس کا تعین تو کرتی ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ اسے غیر مسلموں سے مختلف وضع کا بنانے کی تاکید بھی ہوتی ہے بہت سے محققین کے خیال میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے واضح طور پر لباس کا تعین نہ کرکے دراصل مختلف علاقوں کے رہنے والے مسلمانوں اور ان کے مخصوص ماحول کا لحاظ رکھا ہے لباس کے برعکس صرف خصوصیات مقرر کی گئی ہیں، جن پر ہر علاقے میں عمل کیا جاسکتا ہے

محنت اور توجہ سے علم حاصل کرنا

متعلمین کے لیے یہ لازم ہے کہ وہ حصول علم کے لیے انتہائی محنت اور توجہ سے کام کریں۔ علم حاصل کرنے کے لیے خود کو محنت کا عادی بنانا اور مصائب و مشکلات برداشت

کرنا ضروری ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان کہ (حدیث)

اطلبوا العلم ولو کان بالسین

علم حاصل کرو خواہ اس کے لیے چین ہی کیوں نہ جانا پڑے

دراصل حصول علم کے لیے مشکلات اور مصائب برداشت کرنے کی ترغیب دیتا ہے۔ وگرنہ اس عہد میں چین نہ تو علم و دانش کا مرکز تھا اور نہ ہی وہاں کے لوگ علوم و فنون اور مہارتوں میں کوئی مقام رکھتے تھے یہ علاقہ عربوں سے بہت دور اور انتہائی غیر معروف علاقہ تھا جہاں پہنچنے کے لیے دشوار گزر گاہوں اور طویل مسافت کا سامنا کرنا ضروری تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث میں درحقیقت انہی دشوار گزار مراحل کو عبور کرنے کی نشاندہی کی گئی ہے۔ اس طرح حصول علم میں تکالیف برداشت کرنے سے انسان کو علم کی قدر و قیمت کا اندازہ بھی ہوتا ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کے مطابق مسلمان صحابہ کرام نے بھی انتہائی تکالیف اور مشکلات برداشت کیں تدوین احادیث کے سلسلے میں مسلمانوں نے جس انداز سے تحقیق کی اور باتوں کی تہہ تک پہنچے وہ بہت ہی صبر آزما اور محنت طلب مراحل تھے۔ انہوں نے کسی بھی مرحلے پر اکتاہٹ کا اظہار نہیں کیا بلکہ حصول علم کے فریضے کی ادائیگی کے لیے تمام مصائب برداشت کیے۔ محنت اور توجہ کا یہ اصول طالب علموں کو متحرک اور فعال رکھنے میں بھی اہم کردار ادا کرتا ہے اس طرح تدریس یک طرفہ نہیں رہتی بلکہ طالب علم بھی اپنے طور پر جستجو کرتے ہیں اور ان کے لیے حصول علم کا کام آسان تر ہو جاتا ہے۔

☆☆☆

خلاصہ کلام

دین اسلام ایک ایسا معاشرتی نظام پیش کرتا ہے جو انسانوں کی تمام بنیادی ضروریات کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ اس نے تعلیم کو بھی انسان کی بنیادی ضرورت تصور کیا اور اسی مناسبت سے تعلیم کے حصول اور اس کی اشاعت پر خصوصی توجہ دی۔ اسلام میں تعلیم کا تصور عام مذاہب اور روایت پرستی سے قطعی مختلف ہے اور اس میں عقل اور حواس کو قرار واقعی اہمیت دی گئی ہے۔ اسلام کی دینی تعلیمات کا آغاز بھی اسی نہج پر کیا گیا تھا اور کسی کے لیے سوچے سمجھے بغیر انہیں قبول کرنے اور ان پر عمل کرنے کے لیے جبر سے کام نہیں لیا گیا تھا۔ جاننے اور باخبر ہونے کے اس عمل کے لیے انسان کے بنیادی اعضا اور حواس کے ساتھ ساتھ غور وفکر اور تدبر جیسی صلاحیتوں پر زور دیا گیا اور مشاہدات و تجربات کے لیے زمینوں اور آسمانوں جیسے وسیع مواقع فراہم کیے گئے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے واضح ارشادات کے ذریعے عام لوگوں کو باصرار اپنی تمام صلاحیتوں سے کام لینے اور اپنے گردوپیش سے واقف ہونے کی ہدایت کی کیونکہ ان کے بغیر انسانی ذہن اور قلب کسی نئی چیز کو قبول نہیں کرسکتے۔ تحقیق اور مشاہدے کے اس آزادانہ عمل ہی کو اسلام نے علم کا درجہ دیا ہے۔

علم کی اہمیت اور افادیت کا اندازہ اس امر سے لگایا جاسکتا ہے کہ دنیا کے سب سے پہلے انسان (حضرت آدمؑ) کو باقی مخلوق (جن و ملائک) سے اسی وجہ سے افضل قرار دیا گیا کہ وہ ان سب کے برعکس "جانتے" تھے۔ آدمؑ سے لے کر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک دنیا میں آنے والے تمام ہی انبیاء کرام کو علم عطا کیا گیا تھا اور انہوں نے اسی کے ذریعے لوگوں کو فلاح و بہبود کا راستہ بتایا۔ علم کی خصوصیات میں یہ خصوصیت سب سے نمایاں ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا وصف ہے اور اس کے کئی اسماء الحسنہ سے یہ خوبی عیاں ہوتی ہے۔ علم حاصل کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ نے اس درجہ معتبر قرار دیا ہے کہ خود اللہ کے وجود اور روز محشر کی تصدیق کے لیے انہیں بطور گواہ رکھا گیا ہے۔ علم کو نور اور ہدایت سے تعبیر کیا گیا اور ان لوگوں کے لیے نیکی اور بھلائی کی خوشخبری کے ساتھ ساتھ اعلیٰ درجات کا اعلان بھی کیا گیا جو علم حاصل کرتے ہیں۔ اسلام میں علم کی اہمیت

کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ حصولِ علم کو جہاد کا درجہ دیا گیا ہے اور عالموں کو
عابدوں پر فضیلت عطا کی گئی ہے۔ عام لوگوں کو یہ ہدایت کی گئی ہے کہ وہ عالموں کی پیروی کریں
اس لیے کہ عالم درحقیقت انبیا کے وارث ہوتے ہیں اور انبیا کا سب سے بڑا اثاثہ علم ہی ہوتا ہے
جو لوگ علم حاصل کر لیتے ہیں وہی خدا کو پہچان سکتے ہیں گویا علم اور ایمان دونوں میں باہمی تعلق اسلام
کے تصورِ علم کی ایک اور خصوصیت ہے۔ اسلام حصولِ علم کو ماضی کے گناہوں کا کفارہ اور اشاعت
علم کو صدقہ جاریہ قرار دیتا ہے۔ اسلام میں علم کی فضیلت کے ساتھ ساتھ جہل سے شدید نفرت
کا واضح ثبوت بھی ملتا ہے۔ ابوجہل کا نام اور اہلِ یہود کا ملعون اور رد ہونا جہل ہی کی
علامتیں ہیں۔ مختلف آیاتِ ربانی اور احادیث سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ حصولِ علم
عبادت سے بھی افضل عمل ہے جو اللہ تعالیٰ کو پسند ہے اور اس کے برعکس جہالت ظلمت اور
تاریکی کی طرح ہے جسے اللہ تعالیٰ سخت ناپسند کرتا ہے۔

اسلام نے جس علم کی تائید اور حمایت کی ہے وہ تین اعمال سے وابستہ ہے۔ پہلا عمل حصول
علم ہے دوسرا اس کے مطابق عمل کرنا اور تیسرا اس کی اشاعت اور تبلیغ ہے۔ اس طرح علم کے تین
مختلف مراحل سامنے آتے ہیں جو ایک دوسرے سے اس درجہ مربوط ہیں کہ کسی ایک مرحلے کی عدم
تکمیل پورے عمل کو ناقص بنا دیتی ہے۔ علم جیسی مقدس سرگرمی کے لیے اسلام کا یہ تصور دراصل اس
کے معاشرتی نظام کی ہمہ گیریت کا ایک ثبوت ہے۔ یہ اصول کہ "جو جان لیں وہ دوسروں کو سمجھانا
شروع کر دیں" دراصل عوام الناس کو جہالت اور تاریکی سے نکالنے کے عظیم منصوبے (ماسٹر پلان)
کی نشاندہی کرتا ہے۔ حصولِ علم کے پہلے مرحلے کو دیکھنے سننے اور سمجھنے کے بعد اپنے ذہن اور
قلب کے ذریعے تسلیم کرنے جیسی فطری اور آزادانہ سرگرمیوں سے مربوط کیا گیا ہے ان تمام سرگرمیوں
میں اسلام نے کہیں بھی عقل اور مشاہدے پر کوئی پابندی نہیں لگائی اور نہ ہی انسان کی سماعت
اور بصارت کو محدود کیا ہے بلکہ بارہا مختلف مظاہرِ قدرت کا حوالہ دے کر اسے ایسا کرنے کی
ترغیب دی ہے۔ تسلیم کرنے کے بعد اسی کے مطابق عمل کرنا لازمی ہو جاتا ہے اور سارے
اعمال میں اسی علم کے اثرات کے تحت تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں۔ حق و صداقت کو تسلیم کرنے
اور اپنی زندگیوں کو اسی کے مطابق تبدیل کرنے کے بعد اشاعتِ علم کا فریضہ خود بخود عائد ہو
جاتا ہے۔ اسلام میں اشاعتِ علم کے حوالے سے ذمہ داریوں میں کوئی تفریق نہیں رکھی گئی
بلکہ انفرادی اور اجتماعی اعتبار سے اسے "سب کا حق اور سب کا فرض" قرار دیا گیا ہے۔

علم کے ان مختلف مراحل اور سرگرمیوں کو اسلامی تعلیمی نظام کے راہنما اصولوں میں شامل کیا جاتا ہے۔ علم جیسی سرگرمی سے اسلام نے جو مقاصد وابستہ کیے ہیں ان میں تمام دینی اور دنیاوی امور کا احاطہ کیا گیا ہے اسلام کا تصور علم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ عالم ہے وہی ہر علم کا منبع و ماخذ ہے اور اسی نے ساری دنیا کو تخلیق کیا ہے۔ اس حوالے سے اولین مقصد تو یہ بنتا ہے کہ انسان علم کے ذریعے اللہ کی رضا اور خوشنودی حاصل کرے۔ اس ضمن میں مختلف عبادات اور عقائد کے ساتھ ساتھ روزمرہ زندگی کے اعمال بھی شامل ہیں جنہیں اللہ تعالےٰ کے بتائے ہوئے اصولوں کے مطابق ہونا چاہیے ان اعمال اور سرگرمیوں میں دنیاوی معاملات کو بھی اہمیت حاصل ہے بلکہ عام اسلامی تعلیمات کی طرح دین اور دنیا کے توازن کو برقرار رکھا گیا ہے اللہ تعالیٰ نے انسانوں پر جو فرائض عائد کیے ہیں بالواسطہ طور پر ان سب کی تکمیل اور ادائیگی بھی اسلام کے تعلیمی مقاصد میں شامل ہے۔ اس سلسلے میں سب سے نمایاں فریضہ عام لوگوں سے بھلائی کرنا ہے۔ اسی حوالے سے تعلیم کا دوسرا بنیادی مقصد مخلوق کی خدمت قرار دیا جاتا ہے۔ حضرت محمدؐ اور ان سے پہلے مبعوث کیے گئے انبیائے کرام نے انہی دو اہم مقاصد کے لیے زندگی بھر جدوجہد کی تھی۔ اللہ کی رضا اور مخلوق کی خدمت سے تعلیم کے مقاصد کا پورا لائحہ عمل سامنے آجاتا ہے۔ ایمان اور عقائد میں استحکام سے لے کر سائنسی اور فنی ایجادات تک سب ہی تعلیم کے ان دو مقاصد میں شامل ہیں۔

اسلام کی تشریح اور تعبیر کا عمل ہماری دنیا میں آنحضورؐ سے شروع ہوا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عرب کے جس ماحول میں آنکھ کھولی وہ اصنام پرستی اور اخلاقی زوال کا دور تھا۔ گویا مذہبی اور معاشرتی ہر اعتبار سے انحطاط کا عمل جاری تھا۔ جہاں تک تعلیم و تربیت کا تعلق ہے اس دور میں چند مذہبی اور معاشرتی پیشواؤں کی ذاتی سرگرمیوں کے علاوہ کوئی اور چیز نمایاں نظر نہیں آتی۔ عربوں کے معاشرتی نظام سے ان کی قبائلی خصوصیات اور فصاحت و بلاغت کے چند حوالے اور بعض باشعور افراد کا پتہ ضرور ملتا ہے۔ لیکن اس دور میں مجموعی طور پر تعلیم و تربیت کے لیے کوئی ایسا طریقہ کار متعین نہیں کیا گیا تھا جس سے آئندہ نسلوں کی تربیت کا عمل شروع ہوتا پڑھے لکھے لوگ عنقا تھے گنتی کے ان سترہ افراد سے اب بھی ساری دنیا واقف ہے جو یہ صلاحیت رکھتے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اعلان نبوت کے بعد سے سرزمین عرب پر ایک ایسے نظام کی بنیاد رکھی گئی جس میں دیگر اخلاقی۔ مذہبی اور معاشرتی تقاضوں کے ساتھ ساتھ تعلیم جیسی ذہنی سرگرمی کو بھی اہمیت دی گئی۔ رفتہ رفتہ یہ پورا نظام ایک خاص شکل و صورت

اختیار کرتا گیا جس نظام کی بنیاد اللہ تعالیٰ کی کتاب و حکمت پہ رکھی گئی تھی اور جس کی وضاحت اور تشریح آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کے ذریعے دنیا پہ آشکار ہوئی اس سے ایسے گراں قدر اصول متعین ہوئے کہ جدید سائنسی اور فنی دور میں بھی ان سے استفادہ کیا جا سکتا ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دار ارقم میں جس تعلیم کا آغاز کیا تھا اسے مسجد نبوی کے قیام سے علانیہ فروغ حاصل ہونا شروع ہوا۔ مسجد نبوی اور اصحاب صفہ اور آپ کے تجویز کردہ تعلیمی اور تربیتی نظام سے اساتذہ، طلبہ، نصاب اور دیگر رسمی تعلیم کے عوامل کا پتہ چلتا ہے تعلیم کو ترجیح دینے کے پروگرام کے باعث بہت جلد ایسے بیسیوں ادارے قائم ہو گئے جہاں لوگ تعلیم حاصل کرنے کے لیے رجوع کرتے تھے تعلیم کو عبادت سے وابستہ کر دیا گیا اور ہر مسجد نے تعلیمی ادارے کی حیثیت حاصل کر لی۔ کئی صحابہ کرام ان اداروں سے مستقلاً وابستہ تھے اور وہیں ان کا سلسلہ درس و تدریس جاری رہتا۔ ان سب نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سربراہی میں "تعلیم عام کرنے" کے مشن کو آگے بڑھانے میں اہم کردار ادا کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے قول اور عمل سے غیر تعلیم یافتہ عربوں کو نہ صرف تعلیم جیسی نعمت سے روشناس کرایا بلکہ ان میں ایسی تحریک پیدا کی کہ انہوں نے قریہ قریہ علم کی روشنی پھیلانی شروع کر دی۔ ابتدا میں تعلیم عام کرنے کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے مخالفین سے بھی کام لیا اور اس طرح یہ بات باور کرا دی کہ حصول علم بہت ہی مقدم ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے خطبات تبلیغ کے مختلف طریقے اور مثالیں، عام لوگوں سے برتاؤ، خواتین اور بچوں سے شفقت اور سب سے بڑھ کر اپنے تبلیغی مشن کے لیے دیانتداری اور حسن سلوک سب سے آپ کے تعلیمی پروگرام کے بے شمار اصول اور طریقے دنیا پہ واضح ہوتے ہیں تعلیم کے سلسلے میں تمام باتیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال ہی سے اخذ نہیں کی جاتیں بلکہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عملی طور پر بھی تعلیم کے لیے کام کیے تھے۔ یہ درست ہے کہ اس دور میں مملکت اسلامیہ اور اس میں محکمہ تعلیم کا اس انداز سے وجود نہیں تھا کہ اعداد و شمار اور دستاویزات کی نقول کو سامنے رکھ کر اس کے محاسن اور عیوب کا جائزہ لیا جا سکے لیکن لاتعداد شواہد ملتے ہیں جن سے یہ تصدیق ہوتی ہے کہ اس دور میں ایک انتہائی جامع اور ہمہ گیر بنیاد رکھی گئی تھی جس نے آگے چل کر ایک باقاعدہ نظام کی صورت اختیار کر لی

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے "علم سیکھو اور سکھاؤ" کے اصول کو رائج کیا اور اس اصول کو اس حد تک فروغ دیا کہ تھوڑے ہی عرصے میں ہزاروں افراد نوشت و خواند سے لے کر اعلیٰ علمی سطح تک نمایاں مقام حاصل کر گئے اس سلسلے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بنفس نفیس کئی بنیادی اقدامات کیے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسرے اساتذہ کرام کو ان کے فرائض سے آگاہ کیا ان کی ذمہ داریوں کا تعین کیا بلکہ کئی بار انہیں تدریسی طریقوں اور نصاب کے بارے میں معلومات فراہم کیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف علاقوں میں خود اساتذہ کو مامور کیا اور ان کا تقرر کرنے سے پہلے ان کی علمی قابلیت اور صلاحیتوں کے بارے میں استفسارات کیے۔ اساتذہ کے انتخاب میں مضمون کی مہارت کو اہمیت دی گئی اور ساتھ ہی ساتھ ان کے ذاتی اوصاف مثلاً اخلاق، سادگی اور قناعت کو ضروری سمجھا گیا۔ اساتذہ کو امرا اور صاحبان اقتدار سے دور رہنے کی ہدایات دے کر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عالموں کو اس بات کی تلقین کہ علم دنیاوی جاہ و حشم سے بدرجہا بہتر ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوہ حسنہ اور مختلف صحابہ کرام کو دی جانے والی نصیحتوں سے اساتذہ کے لیے ہدایت نامہ تشکیل دیا جا سکتا ہے جسے موجودہ عہد میں بھی اساتذہ کے لیے پیشہ ورانہ ضابطے کی حیثیت حاصل ہے اس ضابطہ میں علمی اخلاقی اور پیشہ ورانہ امور کے اہم نکات شامل ہیں جن سے رسمی تعلیم کے عمل پر آپ کی کمال مہارت کا ثبوت ملتا ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں لکھنے پڑھنے کی تعلیم کے ساتھ ساتھ حساب (گنتی) کی تعلیم کے شواہد بھی ملتے ہیں گویا تینوں بنیادی مہارتوں Reading writing Arithmetic پر توجہ دی گئی تھی۔ انہی مہارتوں سے نصاب کا آغاز کیا گیا تھا۔ نصاب میں قرآن کی تعلیم کو سب سے زیادہ اہمیت دی گئی اور زندگی کے دوسرے امور میں مہارت حاصل کرنے کی حوصلہ افزائی بھی کی گئی۔ نصاب میں دنیاوی معاملات کو نظر انداز نہیں کیا گیا تھا بلکہ آغاز ہی سے قرآن کی ابتدائی تعلیم میں بھی انہی آیات اور سورتوں پر زیادہ زور دیا جاتا تھا جن میں روزمرہ زندگی کے معاملات کے بارے میں رہنمائی کی گئی ہے ریاضی، طب، ادب، علم بیطار، تاریخ اور علم الانساب کے ساتھ معاون نصابی مشاغل CO-curricular activities کی حیثیت میں نشانہ بازی اور پیراکی جیسے کھیل بھی شامل کیے گئے تھے۔ نصاب کی تیاری میں قومی اور مذہبی تقاضوں کے ساتھ ساتھ

انفرادی ضروریات کا لحاظ بھی رکھا گیا تھا۔ یہاں تک کہ اس عہد کی معاشرتی اور سیاسی ضروریات کے پیش نظر مختلف زبانوں کی تعلیم کی حوصلہ افزائی کی گئی تھی۔ غرض نصاب میں عملی سرگرمیوں کو شامل کر کے ایک جامع اور متوازن نصاب کے لیے بنیاد فراہم کر دی گئی تھی۔

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ اور اشاعت اسلام کے مختلف اقدامات سے کئی ایسے اصول سامنے آتے ہیں جنہیں تدریسی طریقوں کی حیثیت حاصل ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے آسان سے مشکل اور معلوم سے نامعلوم کے تدریسی اصول کو رائج کیا۔ انفرادی تدریس کے ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مرافقہ (کلاس کی صورت میں گروہی تدریس) کے تصور کو بھی مستحکم کیا۔ اپنے مختصر اور دلچسپ خطبات کے ذریعے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تدریسی طریقہ کے سلسلے میں اساتذہ کی براہ راست رہنمائی کی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مثالوں اور عملی مظاہرے کو تدریس کے مؤثر بنانے کے لیے استعمال کیا۔ مباحثے اور مذاکرے کو درس و تدریس میں سب سے زیادہ اہمیت دے کر سبق میں طالب علموں کی فعال شرکت کو یقینی بنایا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیشہ لوگوں سے ان کی نفسیات کے مطابق گفتگو کی۔ آپؐ کا یہ انداز کلام بھی اساتذہ کے لیے رہنمائے تدریس کہا جا سکتا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں سے انہی کی زبان میں گفتگو کرنے کا طریقہ اختیار کیا جس نے تعلیم میں مادری زبان کو بحیثیت ذریعہ تعلیم اختیار کرنے کی سند عطا کر دی مختلف ارشادات اور مصروفیات کا جائزہ لیا جائے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے انتہائی ذہین ماہر تعلیم ہونے کی تصدیق کرنی پڑتی ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خواتین پر مشتمل مجموعی آبادی کے نصف حصے کو اس معاشرتی اور تعلیمی انقلاب سے الگ نہیں رکھا بلکہ ان کے لیے بھی حصول علم کو لازمی قرار دیا۔ خواتین کے لیے تعلیمی سہولتیں بھی فراہم کی گئیں گو وہ طویل دور جاہلیت کی منفی روایات کے اثرات کے باعث فوری طور پر علم کے شعبے میں مہارت حاصل نہ کر سکیں البتہ رفتہ رفتہ وہ زندگی کے اور شعبوں کی طرح تعلیم میں بھی مردوں کے برابر آتی گئیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں خواتین نے لکھنا پڑھنا بھی سیکھا اور ان کے تعلیمی نصاب میں امور خانہ داری اور طب (نرسنگ) کے مضامین کے ساتھ ساتھ ایسے مضامین اور سرگرمیاں بھی شامل کی گئیں جن سے ان کی معاشی حیثیت بہتر ہو سکے۔ ان سرگرمیوں کے انتخاب میں یہ بات

پیش نظر رکھی گئی کہ خواتین زیادہ تر کام اپنے گھر پر بیٹھ کر کر سکیں اور انہیں غیر ضروری طور پر گھر سے باہر نکلنے پر مجبور نہ ہونا پڑے۔ اسی نظام کا کمال تھا کہ کئی مسلمان صحابیات نے علمی اعتبار سے بڑی شہرت حاصل کی۔ اس شعبہ میں امہات المومنین بھی بہت نمایاں رہیں قرآن۔ حدیث اور فقہ سے لے کر طب ادب اور شاعری جیسے شعبوں میں خواتین نے اس درجہ نمایاں حیثیت حاصل کر لی تھی کہ مسلمان مرد بھی حصول علم کے لیے ان سے رجوع کرتے تھے۔ عہد رسالت ہی میں خواتین کی تعلیم کے لیے خصوصی انتظامات کے شواہد ملتے ہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دینی تعلیم سے خواتین کے شغف اور ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے ان کی تعلیم کے لیے ہفتہ میں ایک دن مقرر کر دیا تھا تاکہ وہ آزادانہ طور پر روزمرہ مسائل کے سلسلے میں اسلام کے بنیادی اصولوں کو اچھی طرح سمجھ سکیں۔

عہد نبوی کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس دور میں تعلیم ایک معاشرتی ذمہ داری تھی۔ مختلف واقعات اور حوالوں سے اس دور میں تعلیم کے غیر مرکزی نظم ونسق کی تائید ہوتی ہے ریاست کو تعلیمی معاملات میں تمام اختیارات حاصل نہیں تھے۔ بلکہ تعلیم میں شریک دوسرے عوامل بھی اختیارات میں برابر کے شریک تھے گو اس دور میں الگ سے محکمہ تعلیم موجود نہیں تھا لیکن پھر بھی تعلیمی اداروں کے قیام اور ان میں مفت تعلیم کی فراہمی کے شواہد ملتے ہیں جن سے ایسے محکمے کے لیے بنیاد فراہم ہوتی ہے اسی بنیاد کے مطابق چند برسوں بعد تعلیمی شعبے نے الگ کام کرنا شروع کر دیا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مذہبی حیثیت کی وجہ سے رہنمائی اور سرپرستی کے لیے سب ہی آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے رجوع کرتے تھے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مملکت کے سربراہ کی حیثیت سے تعلیمی اداروں کے معائنے کا سلسلہ شروع کیا اور تمام عمال حکومت کو اس امر کی واضح ہدایات دیں کہ وہ لوگوں کو تعلیم کے مواقع فراہم کرنے کے انتظامات کریں۔ حصول علم کے لیے سب کو یکساں سہولتیں فراہم کی گئی تھیں اور کسی کو مالی حیثیت یا معاشرتی منصب کی وجہ سے دوسروں پر فوقیت نہیں دی گئی تھی۔ تعلیم کی مکمل طور پر ایک آزادانہ فضا میں پرورش کی گئی اور سب کو بلا معاوضہ اس سے استفادہ کے مواقع دیئے گئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دور سے اس بات کی تصدیق بھی ہوتی ہے کہ نادار طلبہ کو تعلیمی سہولتوں کے ساتھ ساتھ مالی امداد بھی فراہم کی جاتی تھی۔

طالب علموں کے لیے حصول علم کو انتہائی مقدس اور بابرکت سرگرمی کا اعزاز دے کر ان

کی حوصلہ افزائی کی گئی تھی لیکن ساتھ ہی ساتھ انہیں نظم وضبط کی تلقین بھی کی گئی تھی۔ آپ کے ارشادات کی روشنی میں طلبہ کے لیے دوران تدریس ایک ضابطہ تشکیل دیا جاسکتا ہے جس میں ان کے اپنے اساتذہ سے برتاؤ اور اپنے رفقا (ہم جماعت ساتھیوں) سے تعلقات کا تعین کیا جاسکتا ہے اس ضابطے میں نشست وبرخاست سے لے کر لباس اور بول چال جیسے تمام امور کے بارے میں ہدایات ملتی ہیں طالب علموں کو سوال پوچھنے اور استفسارات کرنے کی اجازت تھی لیکن گستاخی اور بد اخلاقی کی ممانعت بھی کردی گئی تھی۔ مجموعی طور پر طلبہ کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کی روشنی میں آداب کے ایسے اصول سامنے آتے ہیں جن سے تعلیمی عمل کو زیادہ خوشگوار اور دلچسپ بنایا جاسکتا ہے۔ عہد نبویؐ کی تاریخ اور آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال اور اسوۂ حسنہ سے یقیناً ایک مثالی نظام تعلیم کا ایسا خاکہ سامنے آتا ہے جس کی نظیر اس سے پہلے کے معاشروں میں نہیں ملتی ہے۔



اشاریہ (شخصیات)

کتابیات

۱۔ ندوی۔ سید سلیمان: سیرۃ النبیؐ۔ جلد چہارم۔ قرآن لمیٹڈ۔ لاہور ۱۳۹۵ھ

۲۔ مشکوٰۃ شریف۔

۳۔ حافظ ابن القیم: فضائل علم و علماء۔ مترجم عبد الحلیم۔ المکتبۃ السلفیہ۔ لاہور ۱۹۶۲ء

۴۔ محمد طفیل: نقوش "رسولؐ نمبر" جلد چہارم۔ ادارہ فروغ اردو لاہور ۱۹۸۳ء

۵۔ شیروانی۔ حبیب الرحمٰن: علمائے سلف و نابینا علماء۔ تعلیقات و حواشی مفتی انتظام اللہ شہابی اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ۔ طبع اول۔ کراچی ۱۹۶۱ء

۶۔ محمد بن ہشام۔ سیرۃ (ابن ہشام)۔ مترجم۔ شیخ محمد اسماعیل۔ مقبول اکیڈمی لاہور ۱۹۶۱ء

۷۔ حمید اللہ۔ محمد: عہد نبوی کا نظام حکمرانی (جلد اول) مکتبہ ابراہیمیہ حیدر آباد دکن بار دوم ۱۹۴۹ء

۸۔ شلبی۔ ڈاکٹر احمد جب اللہ: تاریخ تعلیم و تربیت اسلامیہ۔ مترجم محمد حسین خاں زبیری ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور ۱۹۶۳ء

۹۔ بریلوی۔ علامہ شمس: سرور کونین کی فصاحت۔ مدینہ پبلشنگ کمپنی۔ کراچی ۱۹۸۵ء

۱۰۔ ندوی شاہ معین الدین احمد: تاریخ اسلام۔ غضنفر اکیڈمی۔ کراچی ۱۹۷۵ء

۱۱۔ نعمانی۔ سید شبلی: الفاروق

۱۲۔ حسن۔ ڈاکٹر ابراہیم حسن: کتاب اعلام الاسلام۔ مترجم سید معین الحق "مشاہیر اسلام"، پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی۔ کراچی۔ ۱۹۵۵ء

۱۳۔ سید امیر علی: اسپرٹ آف اسلام۔ مترجم محمد ہادی حسین۔ ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور، طبع سوم۔ ۱۹۸۴ء

۱۴۔ نعمانی سید شبلی: سیرۃ النبیؐ۔ جلد اول۔ قرآن لمیٹڈ لاہور پہلا ایڈیشن

۱۵۔ کانپوری۔ مولانا عبد الرزاق: علم الکتابت یا ابجد کی تاریخ۔ مطبوعہ ماہنامہ زمانہ سلور جوبلی نمبر۔ کانپور۔ بھارت

۱۶۔ ہیکل۔ ڈاکٹر محمد حسین: سیرۃ الرسولؐ (حیات محمدؐ)۔ مترجم مولانا محمد وارث کامل مرحوم۔ مکتبہ کارواں لاہور۔ ۱۹۶۴ء۔

۱۷۔ گستاؤلی بان۔ ڈاکٹر: تمدن عرب۔ مترجم سید علی بلگرامی۔ مقبول اکیڈمی۔ لاہور

۱۸۔ جرجی زیدان: تاریخ تمدن اسلامی۔ مترجم محمد حلیم انصاری۔ شیخ شوکت اینڈ سنز۔ طبع اول (جلد اول اور دوم) ۱۹۶۴ء

۱۹۔ ندوی۔ حاجی معین الدین: مہاجرینؓ (حصہ اول) دار المصنفین اعظم گڑھ۔ طبع ثانی ۱۹۵۱ء۔

۲۰۔ انصاری۔ مولانا سعید: سیر الصحابیاتؓ۔ معارف اعظم گڑھ۔ طبع چہارم ۱۹۵۳ء

۲۱۔ انصاری۔ مولانا سعید: سیر انصارؓ (حصہ اول اور دوم) دار المصنفین اعظم گڑھ طبع دوم۔ ۱۹۴۸ء۔

۲۲۔ امیر الهدیٰ: مسلمانوں کے علمی و ثقافتی کارنامے۔ قمر کتاب گھر۔ کراچی۔

۲۳۔ زبیری محمد حسین خان: مشاہیر کے تعلیمی نظریئے۔ طبع ثانی۔ آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کراچی۔

۲۴۔ ندوی شاہ معین الدین احمد: مہاجرینؓ (حصہ دوم)۔ دار المصنفین اعظم گڑھ۔ طبع دوم۔ ۱۹۵۲ء۔

۲۵۔ ابوزہرہ۔ محمد: آثار امام شافعی۔ مترجم رئیس احمد جعفری۔ شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور ۱۹۶۱ء۔

۲۶۔ نعمانی۔ سید شبلی: مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم۔ قومی پریس لکھنؤ۔ انڈیا ۱۸۸۷ء

۲۷۔ منصور پوری سلمان: رحمت اللعالمین (جلد اول۔ دوم اور سوم)

۲۸۔ طبری۔ ابن جریر: تاریخ طبری (حصہ اول۔ سیرۃ النبیؐ) مترجم سید محمد ابراہیم۔ نفیس اکیڈمی۔ ۱۹۶۷ء

۲۹۔ حسن ڈاکٹر ابراہیم حسن:۔ النظم الاسلامیہ۔ مترجم مولوی علیم اللہ "مسلمانوں کا نظم مملکت"۔ ندوۃ المصنفین۔ دہلی۔ طبع دوم ۱۹۵۹ء

۳۰۔ سید امیر علی: ہسٹری آف سارسینز (تاریخ اسلام) مترجم باری علیگ۔ اردو اکیڈمی لاہور

۳۱۔ ارشد۔ مولانا رشید احمد۔ اسلام کا تعلیمی نظام۔ مطبوعہ۔ البلاغ۔ مئی ۱۹۵۹ء

۳۲۔ اندلسی۔ ابن عبدالبر: جامع بیان العلم و فضلہ۔ مترجم عبدالرزاق ملیح آبادی۔ "العلم والعلما" ادارہ اسلامیات لاہور۔ پہلی بار ۱۹۷۷ء

۳۳۔ زرنوجی۔ برہان الدین: الرفیق الفہیم بطریق التعلیم۔ ترجمہ محمد معین الدین "تعلیم المتعلم فی طریق التعلیم" (آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کراچی میں قلمی نسخہ موجود ہے)

۳۴۔ ابوداؤد۔ کتاب المرسل۔ عینی شرح بخاری جلد دوم

۳۵۔ السیوطی۔ جلال الدین: تاریخ الخلفاء۔ مترجم اقبال الدین احمد۔ نفیس اکیڈمی کراچی۔

۳۶۔ سعید احمد مولانا: مسلمانوں کا عروج و زوال۔ ندوۃ المصنفین دہلی۔ طبع سوم ۱۹۶۳ء

۳۷۔ ھتی۔ فلپ: تاریخ ملت عرب۔ مترجم سید ہاشمی فرید آبادی۔ انجمن ترقی اردو کراچی ۱۹۵۴ء

۳۸۔ خان حبیب الرحمٰن: علمائے سلف۔ علی گڑھ۔ بار پنجم ۱۹۳۷ء

۳۹۔ ابوزہرہ۔ محمد: حیات امام ابوحنیفہ مترجم غلام احمد حریری۔ مکتبہ سلفیہ لاہور ۱۹۶۲ء

۴۰۔ ابوزہرہ۔ محمد: حیات امام احمد حنبل۔ مترجم رئیس احمد جعفری۔ مکتبہ سلفیہ۔ لاہور طبع دوم ۱۹۵۷ء

۴۱۔ دانش گاہ پنجاب: اردو انسائیکلوپیڈیا آف اسلام۔ جلد ۱۴/۱ لاہور طبع اول ۱۹۸۰ء

۴۲۔ گب۔ ایچ اے آر: مقدمہ تاریخ ادبیات عرب مترجم سید اولاد علی۔ مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۵۹ء

۴۳۔ بلاذری۔ فتوح البلدان (جزو اول) مترجم ابوالخیر مودودی۔ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن ۱۹۳۲ء

۴۴۔ ابن خلدون: مقدمہ۔ مترجم سعد حسن خان یوسفی۔ نور محمد کارخانہ تجارت کتب کراچی۔

۴۵۔ الابراشی۔ محمد عطیہ: روح التربیۃ والتعلیم۔ مترجم رئیس احمد جعفری "فلسفہ تعلیم و تربیت"۔

۴۶۔ مفتی محمد شفیع: اسلام کا قرن اول میں تعلیم کا نصاب اور نظام۔ مطبوعہ البلاغ جون ۱۹۶۹ء

۴۷۔ محمد بن سعد۔ طبقات ابن سعد۔ مترجم عبداللہ العمادی۔ نفیس اکیڈمی۔ کراچی۔

۴۸۔ ابوزہرہ۔ محمد۔ امام مالک۔ مترجم عبیداللہ قدسی۔ شیخ غلام علی اینڈ سنز۔ اول ۱۹۶۰ء

اردو ادب پر معیاری کتب

لکھنؤ کا دبستان شاعری	ڈاکٹر ابواللیث صدیقی
زبان و ادب	حبیب اللہ خان غضنفر
ہندی ادب	حبیب اللہ خان غضنفر
اردو کا عروض	حبیب اللہ خان غضنفر
تنقید و تجزیہ	ڈاکٹر نعیم نقوی
تنقید و تناظر	ڈاکٹر نعیم نقوی
تنقید و تعبیر	ڈاکٹر نعیم نقوی
اردو شاعری پر ایک نظر	جمیل احمد
غالب اور عصر غالب	ڈاکٹر ایوب قادری
تاریخ ادب اردو	رام بابو سکسینہ
جدید اردو ادب	ڈاکٹر محمد حسن
معاصر ادب کے پیش رو	ڈاکٹر محمد حسن
شناسا چہرے	ڈاکٹر محمد حسن
نکات سخن	حسرت موہانی
تذکرہ و تبصرہ	سراج الاسلام
دانائے راز	ضیاء الدین
مشرقی تمدن کا آخری نمونہ	عبدالحلیم شرر



دیگر کتب

کتاب	مصنف
معاشیات اسلام	مظفر حسین ملاٹھوی
زکوٰۃ اور عشر کا اقتصادی نظام	مظفر حسین ملاٹھوی
شرکت و مضاربت کے شرعی اصول	مظفر حسین ملاٹھوی
بلا سود بنکاری	مظفر حسین ملاٹھوی
اسلام کا معاشی نظام	خورشید صدیقی
اسلامی معلومات	راشد عمران
حضرت ابوبکر صدیقؓ	ڈاکٹر ایوب قادری
حضرت عمر فاروقؓ	ڈاکٹر ایوب قادری
حضرت عثمان غنیؓ	ڈاکٹر ایوب قادری
حضرت علیؓ	ڈاکٹر ایوب قادری